یعنی

اجودھیا و فیض آباد کے بزرگانِ دین، مشائخ
علماء و شہداء کے حالات اور اِس توأم شہر
کے
نشیب و فراز کی عبرت آموز تاریخ

مرتبہ

(ڈاکٹر) دبیر احمد

ناشر: دانش بکڈپو چوک ٹانڈہ (فیض آباد)

نام مصنف ـــــــــ ڈاکٹر دبیر احمد

نام کتاب ـــــــــ شہر اولیاء

مطبع ـــــــــ نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ ضلع فیض آباد

ناشر ـــــــــ دانش بکڈپو ٹانڈہ فیض آباد

تعداد اشاعت ـــــــــ ایک ہزار

قیمت ـــــــــ بیس روپے

سنہ اشاعت ـــــــــ سنہ ۱۹۸۸ء

ایڈیشن ـــــــــ بار سوم

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قدر دانوں نے اس کتاب (شہر اولیاء)
کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اور ایک قلیل ترین مدت میں اس کا پہلا
ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس حوصلہ افزائی اور قدر دانی کیلئے ہم اپنے تمام معزز
قدر دانوں کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

کتاب کی زبردست مانگ کے پیشِ نظر اِس کا دوسرا ایڈیشن مفید اضافوں
اور تصحیح کے بعد پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ یہ اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن
پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور معلوماتی ثابت ہوگا۔ اور قدر دانوں میں
شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔

ناشر

۳۰ اپریل ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ کہ ذاتِ بے ہمتا کی عنایتِ بے پایاں نے میرے جذبۂ بادیہ پیما
کی اس حاصلِ آبلہ پائی و شہر اولیاء کو کسی کے نام معنون کرنے کی توفیق نہ دے کر غیرت
خودداری کے وقار کی آبرو رکھ لیا اور اَلحَمدُ لِلّٰہ کی حقیقت و عظمت کو سمجھنے کی عظیم
سعادت سے نوازا۔

اَلحَمدُ لِلّٰہ ـــــــــ

"تعریف اللہ ہی کیلئے ہے"، یہ ایک حقیقت ہے جس سے
مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز جس شکل میں بھی
کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال رکھتی ہے، اس کا سرچشمہ
اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک ہے۔ کسی مخلوق کا کمالِ ذاتی نہیں۔
ہم اُسی کے احسان مند اور شکر گذار ہیں۔ وہی "خالقِ کمال" ہے۔

ایک بات

"ـ ان کو یاد رکھئے جنھوں نے اپنا آج ، ہمارے کل کے لئے وقف کر دیا
جنھوں نے اپنی راتیں اس لیئے جاگتے گذاریں کہ ہمارے دنوں کا کالک
دور ہو جائے۔ جنھوں نے اپنا آرام اس لئے تج دیا کہ ہماری بے آرامیاں
ہمیں تھکا نہ دیں۔ جنھوں نے اپنے افکار سے ، اپنے کردار سے ، چراغ
روشن کیئے کہ ہماری دنیا اندھی اور اندھیری نہ رہے ۔"

علم تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ قوموں کی تاریخ میں اخلاقی اور دینی و روحانی حیثیت سے مد و جزر آتے رہتے ہیں۔ کوئی دور اخلاقی اور دینی و روحانی ترقی و عروج کا ہوتا ہے ۔ کوئی زمانہ اخلاقی اور دینی و روحانی تنزل و انحطاط کا ہوتا ہے ، لیکن تاریخ کا طالب علم ان تغیرات و انقلابات کا خوگر ہوتا ہے ۔ اس کی نگاہ میں ان نشیب و فراز کی کوئی خاص اہمیت اور وقعت نہیں ہوتی جس کی بناپر وہ کسی قوم کے اخلاقی اور دینی و روحانی انحطاط و تنزل سے خوف زدہ ہو۔

کسی قوم میں انقلابات و تغیرات اور انحطاط و تنزل کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ اس بات کی اہمیت ہوتی ہے کہ اس قوم کے ضمیر میں زندگی کے کتنے آثار باقی ہیں ؟ اُسے اپنے صالح اسلاف کے اعمال و افعال اور کردار و تعلیمات سے ابھی کتنا قرب و تعلق باقی رہ گیا ہے ؟ کسی قوم کی اصل قوتِ حیات ، اُس کے صالح بزرگوں اور

اسلاف کے اعمال و افعال اور کردار و تعلیمات ہی اصل "سرمایہ" ہیں۔ اگر اسلاف
کا یہ "سرمایہ" کسی قوم میں محفوظ ہے تو اُس قوم کی خودکشی یا موت کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا
لیکن اقوام عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی تاریخ، بدقسمتی سے کبھی وہ دور بھی آجا
ہے، جب کسی قوم کے پاس سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن ان کے صالح بزرگوں اور
اسلاف کا "سرمایہ" نہیں ہوتا۔

جو قوم اپنے محسنوں کا اعتراف نہیں کرتی، اپنے لئے جینے والوں کو یاد نہیں رکھتی
وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہونے والوں کی افزائش کرتی ہے۔ افراد اپنے اپنے مفاد
کے بندے بن جائیں تو قوم کا مفاد پائندہ نہیں رہتا۔ اور افراد کی زندگی قعر مذلت کی گہرائیوں
میں بھٹکنے لگتی ہے۔

بدقسمتی سے، آج ایسی ہی کچھ صورتحال مسلمانوں پر بھی مسلط ہوتی جارہی ہے
وہ اپنے صالح اسلاف کے کارناموں، صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین
بزرگانِ دین، اور اولیاء اللہ کی تعلیمات و افعال، وسیع المشربی، اخوت و محبت
اور ایثار و قربانی کے زریں کارناموں سے دن بدن بے خبر ہوتے جارہے ہیں اور اُن سے
محبت و عقیدت روز بروز کم سے کمتر ہوتی جارہی ہے۔

اسلام کی اشاعت کے لئے سرکار دو عالم جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و
سلم)، اور اصحاب رسول اللہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور اُن کے بعد بزرگان دین
اولیاء اللہ، صوفیائے کرام اور اکثر مسلمان حکمرانوں نے جس قدر جاں فشانیاں کی ہیں
اور مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ اسلام کی تاریخ کا ایک تحیر افزا روشن باب ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان جس قدر اپنے صالح بزرگوں سے اُنس

یدا کرتا ہے، اتنا ہی اُس میں ان کے اوصافِ حمیدہ کی تقلید اور تعلیمات پر عمل کرنے کا
دہ بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ بزرگوں کے آثار و مزارات کی زیارت سے قلب کی صفائی
وتی ہے۔ روح بالیدگی حاصل کرتی ہے اور اُسے وہ کیف و سرور حاصل ہوتا ہے جس
سے جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی توفیق عطا ہوتی ہے

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جس قدر بزرگانِ دین، اولیاء اللہ اور علماء و فضلاء
ر صوفیا و فقراء ہندوستان میں گذرے ہیں اتنے سرزمین عرب کو چھوڑ کر دنیا کے کسی
سلامی ملک میں نہیں گذرے۔ خصوصاً شہر اودھ (اجودھیا) میں تو اس قدر اولیاء اللہ
زرگانِ دین، علماء و فضلاء اور صوفیاء و فقرا پیوند زمین ہیں کہ اکثر قدیم کتابوں میں اس
ہر (اجودھیا) کو "مدینۃ الاولیاء" اور "خورد مکہ" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس
رزمین میں کیسے کیسے صاحبِ جلال و جمال اولیاء اللہ، علماء و فضلاء اور بزرگانِ دین
فون ہیں اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو بہتر ہے۔

سرزمین شہر اودھ (اجودھیا) اور اس کے قرب و نواح میں جن بزرگانِ دین
لیاء اللہ اور علماء و فضلا اور صوفیا و فقرا کے مقابر، مزارات اور خانقاہوں نیز مسلمان
رانوں کے تعمیر کئے ہوئے مقابر، مزارات اور خانقاہوں وغیرہ کی تعمیرات، جن کے
ر و دیوار کے آثار و باقیات میں عہد رفتہ کی لاتعداد تلخ و شیریں داستانیں جذب
یں اور جن کا ذکر مختلف قدیم کتابوں میں مرقوم ہے یا جو سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات
ے معلوم ہوا، اُنکے آثار و باقیات کو تلاش و تحقیق کے بعد، انکے صحیح محل وقوع، اب کس
لت میں ہیں؟ پہلے کس حالت میں تھے؟ موجودہ پوزیشن کیا ہے؟ — مختصر حالات
ثرات مع حواشی ذمہ دارانہ احتیاط اور ممکنہ تحقیق و سند کے بعد۔ تحریر کرنے کی کوشش کیا ہے

امید ہے کہ زیر نظر کتاب "شہر اولیاء" جو موصوف کے شوقِ بادیہ پیمائی کی حاصل آبلہ پائی
علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور اولیاء اللہ و بزرگانِ دین سے عقیدت
رکھنے والے اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس حقیر کاوش میں جہاں ایک طرف مولوی فضل الرحمن، طارق منظور، زبیر احمد
(نشاط پریس ٹانڈہ) بی این بیگم، فریدہ بوٹی، زبیر احمد (مسلم نسواں اسکول) وغیرہ کی حوصلہ افزائیاں
شامل ہیں وہیں دوسری جانب کچھ "اپنوں" کے جذبہ حسد کا بھی اچھا خاصا دخل ہے جن کی حوصلہ شکن
کوشش نے میرے عزم و ارادہ کو آہنی مزاج عطا فرمایا۔

بات ادھوری رہ جائے گی اگر ماسٹر عبدالجبار صاحب انچارج مسلم یتیم خ
بڑی بوا صاحبہ، ڈاکٹر سرور، احمد خاں ایڈوکیٹ (فیض آباد) اور محمد ہاشم انص
محمد شفیق، نثار احمد (فیض آباد)، حشمت اللہ انصاری صاحبان (اجودھیا) کا ذکر نہ کروں جنکی رہنمائی میں مجھے تمام
مزارات، مساجد اور تباہ و برباد مدارس و خانقاہوں کے آثار و باقیات دیکھنے کی
سعادت نصیب ہوئی ـــــــ اور قمر الدین و تنویر احمد صاحبان کا ذکر
بھی ضروری ہے کہ انھوں نے تصحیح و پروف ریڈنگ کے صبر آزما مراحل کو بڑے
عزم، حوصلہ اور صبر و استقلال سے انجام دیا۔

۲۷ر اپریل ۱۹۸۴ء جمعہ

سکٹھاں
ٹانڈہ ۲۲۴۱۹۰
فیض آباد (یو۔پی)

جس عظمتِ رفتہ کا نشاں آئے تھے کل دیکھ
چلتے ہیں لئے پھر تجھے اے دل، وہیں چل دیکھ

اتر پردیش کے قابل دید اور عبرت آموز تاریخی و مذہبی تقدس کے حامل مقامات
میں شہر اودھ (اجودھیا) اور فیض آباد کو ایک مخصوص اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔

شہر اودھ اور آریا قوم

اجودھیا (شہر اودھ) کی اہمیت اور تقدس اہلِ ہنود کے لئے اس بنا پر ہے
کہ اس سرزمین پر شری رام چندر جی آریائی نسل کے سورج بنسی خاندان کے ایک
راجہ، راجہ دسرتھ جی کے گھر میں تریتا جگ[1] کے آخری زمانہ میں اوتار کے روپ میں

۱۔ بشسٹ منی کے قول کے بموجب رام چندر جی کی پیدائش تریتا جگ (त्रेता युग)
کے آخری زمانہ میں ہوئی تھی۔ تریتا جگ کی مدت بارہ لاکھ چھیانوے ہزار سال تھی۔ کلجگ
(कलयुग) کا زمانہ جو اس وقت چل رہا ہے، اس کی مدت چار لاکھ بتیس ہزار برس
مانی گئی ہے۔ سن ہجری کے حساب سے ۱۴۰۰ھ ہجری تک زمانہ کلجگ کا چھ ہزار ایک سو چھتیس
سال اور سن عیسوی کے مطابق ۱۹۷۹ء میں تقریباً پانچ ہزار پانچ سو چودہ سال گذر چکے
۲۔ اس سلسلہ میں ایک طویل مضمون الفرقان لکھنؤ کے اپریل ۱۹۷۹ء کے شمارہ
صفحہ ۳۲ تا ۳۹ پر بھی شائع ہوچکا ہے۔ ــــ مؤلف۔

جنم لیا تھا۔ آریا منگول نسل سے تھے جو شمال مغرب بعید کے علاقوں سے "علاقائی تقاضوں" کے دباؤ سے تنگ ہو کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے اور درۂ خیبر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف شکل و صورت، رنگ وروپ اور ڈیل ڈول میں قدیم ہندوستانی باشندوں سے بہتر تھے بلکہ اپنی جرأت و شجاعت، عزم و حوصلہ اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی انھیں یہاں کے قدیم باشندوں پر برتری و فوقیت حاصل تھی۔

ہندوستان کے قدیم باشندوں کی واہمہ پرست ذہنیت و مزاج اس حقیقت اور صداقت کو قبول کرنے کا متحمل نہ ہو سکا کہ آریوں کی فتح و نصرت کا یہ سیلاب ان کے عزم و حوصلہ کی پختگی اور جرأت و شجاعت کا رہون منت ہے۔

عزم و حوصلہ کا صلہ

یہ آریوں کی فہم و فراست اور تجربات و دانائی کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے اپنے بلند و بالا قد، انتہائی صاف و سرخ رنگ وروپ اور موروثی شجاعت و مردانگی نیز جفاکشی و بربادی کی اعلیٰ انسانی صفات کو یہاں کے قدیم ہندوستانی باشندوں کے سامنے ان کی واہمہ پرست فطرت و مزاج کو مغلوب اور متاثر کر کے، اپنے آپ کو کچھ اس انداز اور حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ان کو ایک مافوق الفطرت ہستی سمجھ بیٹھے اور بجائے اس کے کہ اپنی شکست و ہزیمت کے اسباب و علل کا جائزہ لے کر مستقبل میں دفاعی اقدامات کے وقت ان تجربات سے رہنمائی حاصل کرتے، انھوں نے ایک شکست خوردہ اور مغلوب قوم کی غلامانہ ذہنیت کے انداز فکر سے اپنی شکست و ہزیمت کے گہرے

ؤں کو، بجائے مندمل کرنے کی سعی کے صرف زخموں کے درد و ٹیس کے افاقہ کے لئے
ں "مسکن" مرہم کو تلاش کیا وہ اجتماعی قومی مفاد کے لئے، ممکن ہے کہ اُس وقت
رضی طور پر، کچھ وقفہ کے لئے "مسکن" ثابت ہوا ہو، لیکن اس کے اثرات مابعد
عی قومی مفاد کے لئے خاصیتاً زہر قاتل تھے۔

یہ بھارت کے قدیم باشندوں کی شکست خوردگی اور غلامانہ ذہنیت کا عطیہ تھا
ان کی موروثی واہمہ پرست فطرت نے خوف و ہراس کے شدید جذبات کے دباؤ
ے مغلوب ہوکر، آریوں کے عادات وخصائل اور ان کے عزم و حوصلہ کی پختگی کو
" غیر انسانی" ہستی کا کارنامہ سمجھ کر اس طرح اجتماعی قومی احساس شکست و ہزیمت
سکین و دلجوئی کا مداوا کیا کہ فاتحین (آریوں) کو کسی آسمانی مخلوق کی اولاد سمجھ لیا۔
ان کے فاتح قائدین اور سورماؤں کو اوتار اور دیوتا تسلیم کر کے، اپنے آبائی
تاؤں اور اوتاروں کی طویل صف میں شامل کر لیا۔ اور بے چوں وچرا اطاعت
ہ نبرداری کی لعنت کا بھاری بھرکم طوق، انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی گردنوں
ڈال کر، ہمیشہ کے لئے سر نیاز خم کر لیا۔

م چندر جی کا مثالی کردار

اس سرزمین شہر اودھ (اجودھیا) میں شری رام چندر جی نے والدین کی اطاعت
و فرمانبرداری کی جو عملی اور قابلِ تقلید مثال قدیم ہندوستانی معاشرہ میں پیش کیا وہ
یہاں کی آبادی کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اور شاید اس حقیقت کا اظہار بھی بے محل
نہ ہوگا کہ آریوں کی آمد سے قبل کے ہندوستان کی قدیم تاریخ یا روایات میں ایسی

کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں کسی بیٹے نے اپنے باپ کے انتہائی نامعقول اور غیر منصفانہ حکم کی بجا آوری کے لئے اس قدر خندہ پیشانی اور سعادتمندی کے ساتھ سر تسلیم خم کیا ہو۔

رام چندر جی اطاعت شعاری و فرمانبرداری اور منشائے مشیت پر راضی برضا رہنا نیز ان کے ایثار و قربانی کے بے مثال کارنامے نہ صرف اس دور ہی میں لائق ستائش تھی بلکہ آج کی مضطرب انسانیت کے درد و کرب کا علاج بھی اسی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

کلجگ کی دین

آتے ہوئے کلجگ اور جاتے ہوئے تریتا جگ کے طوفان خیز حالات کے تیز و تند دھاروں کے درمیان، سیتا جی کے ایثار و قربانی کے وہ پر خلوص والہانہ جذ... جس نے رام چندر جی کی زندگی کی پر پیچ شاہراہ کے ہر اندھیرے اجالے موڑ پر، روشنی وسایہ بن کر رفاقت کا قابلِ تقلید حق ادا کیا ہے۔ سیتا جی نے "راج محل" کے عیش و آرام کو اپنے رفیق حیات کے قدموں میں ڈال کر ثابت کر دیا کہ ایک مشرقی ہندوستانی عورت، خواہ وہ 'دھوبی رانی' ہو یا 'راج ماتا'، کا مقامِ معراج کیا ہے؟ یہ ایک عملی درس تھا جسے ایک مشرقی عورت نے "دیوی" کے عظیم مرتبہ سے بلند تر ہو کر دیا تھا — اور شاید اس وقت معاشرہ کی اصلاح کے لئے ایسے ہی عملی درس کی ضرورت رہی ہو۔

شہر اودھ (اجودھیا)، کی سرزمین پر بھرت اور لچھمن کی شخصیتیں بھی اب

اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے، ہمیشہ اُس تابندہ ستارہ کی طرح آسمان انسانیت کی بلندیوں پر چمکتی رہیں گی جو بھولے بھٹکے انسان کو اس کی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ بھرت اور لچھمن نے برادرانہ شفقت اور شرم وحیا کے مشرقی روایات کے آداب ولحاظ کے وہ مثالی کردار پیش کئے ہیں جن کی عظمت وافادیت کی سدا ہر عہد کے انسان کی معاشرتی زندگی کی مشاطگی کرتی رہے گی۔

کلجگ کے ہزارہا سال کے طویل ترین زمانہ کے اثرات نے رآم و سیتا کے پیار و محبت، ایثار و قربانی اطاعت شعاری و فرمانبرداری۔ شرم وحیا اور شفقت و رفاقت کے زریں کارناموں کو، بے حس مورتیوں بھرے مندروں کے اس شہر نے، اپنے سنگی بتوں کی طرح، ان عظیم شخصیتوں کے کارناموں کو بھی بے جان بنا ڈالا۔ آج رآم اور سیتا کے وطن میں ان کی عملی تعلیمات کا کوئی شناسا نہیں۔ ان عظیم اور مثالی شخصیتوں کا ترتیب دیا ہوا ماحول آج اس سرزمین پر عنقا ہے۔ رآم کا اجودھیا تو آج بھی وہی ہے، لیکن نہ کہیں رآم کی اطاعت شعاری و فرمانبرداری کا یہاں کوئی ادنیٰ سا پرتو ملتا ہے اور نہ سیتا کی عفت و عصمت اور خود بزرگی و عجز و انکساری کا کہیں نام ونشان۔ نہ بھرت کی شفقت و مروت کی کہیں جھلک ملتی ہے، نہ لچھمن کے لحاظ و پاسِ ادب اور غیرت و شرافت کا شائبہ۔ آج کوشلیا کے ضبط و تحمل اور صبر و استقلال کی آبرو کو، اسی نگر کے باسی، سربازار نیلام کرتے ہیں۔ کوشلیا کے حفظ و ناموس کا تحفظ کرنے والا کوئی ایک فرد بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ

ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

اجودھیا سے مسلمانوں کا تعلق

رام ولچھمن کے اخلاف کے اس شہر سے مسلمانوں کا کس قدر گہرا تعلق
رہا ہے؟ اس کا اندازہ اس ناقابلِ تردید حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس قدر
اولیاء اللہ، بزرگانِ دین، علماو فضلا اور صوفیا و فقراء اس سرزمین کے باسیوں کو کفر
و شرک اور جہل و ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکالنے اور فسق و فجو
کے دلدل میں ڈوب مرنے سے بچانے کے لئے اندرون و بیرونِ ملک سے یہاں
تشریف لائے، اتنے ہندوستان کے کسی خطۂ ارض پر نہیں آئے۔ اللہ کے
برگزیدہ بندوں کو اس سرزمین کی تقدس و عظمت اور رام و لچھمن کے وط
کے باسیوں کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے بچانے اور پاک رکھنے او
ہزاروں مجبور محض خداؤں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے صرف ایک
خدائے وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں سجدہ ریز کرانے کی کتنی تڑپ تھ
ان کے دلوں کو شمع وحدانیت سے منور کرنے کی کتنی تمنا تھی؟ اس
صحیح اندازہ کرنا قطعی محال ہے۔ انکی اصلاح اور تزکیہ نفس کی کتنی فکر دامن گ
تھی؟ ان سب کی گواہ وہ دو گز زمین ہے جس کے نیچے وہ آرام فرما ہیں اور ج
کے اوپر ان کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے رشد و ہدایت کے مرکز۔ انکی خانقاہ
ان کی تعمیر کی ہوئی پرشکوہ مساجد اور رغزاخانوں کے آثار و باقیات، آج بھی
زبان بے زبانی سے اپنے پرخلوص عزائم اور جدوجہد کی داستان س
رہے ہیں۔ زمانہ کے بیدرد ہاتھوں تباہ کی ہوئی کی ہوئی خانقاہیں، و

مدارس و مساجد کے کھنڈرات ۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے قبرستانوں اور گورِ غریباں میں آرام فرما اللہ کے برگزیدہ اصحاب کی قبروں پر نورِ الٰہی کے نزول کا منظر، وسیع و عریض قبرستانوں میں جہاں حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی رقت انگیز خاموشی کی حکمرانی ہونی چاہیئے تھی، وہاں ہمہ وقت ایک عجیب پُر وقار اور ناقابل بیان، رونق افروز فضا طاری رہتی ہے ۔ ان وسیع و عریض قبرستانوں میں وہ جلیل القدر ہستیاں پیوند زمین ہیں جن کے جلال سے آج بھی وقت کے چنگیز و ہلاکو کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے ۔ یہاں گردنیں رعب و جلال سے سرنگوں رہتی ہیں۔

بظاہر ایک ویرانہ ہے لیکن جو بھی آتا ہے
قدم لرزیدہ لرزیدہ ، نگہ دزدیدہ دزدیدہ

۔۔۔ جائے عبرت ہے

یہ شہر راجودھیا، جو قابل تعظیم بھی ہے اور جائے عبرت بھی۔ یہاں وہ لوگ بھی دفن ہیں جو اپنے زمانہ حیات میں زمانہ کا رخ موڑ دیا کرتے تھے۔ جنکی ... و شگفتگی سے زندگی و موت کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور وہ لوگ بھی پیوند زمین ہیں جنھوں محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے گمراہ لوگوں کو، اپنی آخری سانسوں تک پیغامِ حق پہنچاتے رہے، اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ کس قدر عبرتناک منظر ہے یہاں کا؟ دلسری، آم کٹہل ، املی جامن وغیرہ کے دیو ہیکل درختوں کے یہ پُر وقار جنگل اور ان کی آغوش میں پھولوں کی عطر بیز کیاریوں کے بجائے ، خودرو خاردار پودوں کی گنجان

جھاڑیاں جو ہر اتفاقاً گذرنے والے کے قدم قدم پر سدِ راہ ہوتی ہیں اور اس
کے دامن کو پکڑ کر کہنا چاہتی ہیں :-

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یہ فخر، ہندوستان میں صرف سرزمین اودھ اجودھیا کو حاصل ہے ک
اس کی آغوش میں نہ صرف دو جلیل القدر انبیاء (علیہم السلام) محو خواب ہیں[۱]
جن کے فیوض و برکات کا لازوال چشمہ آج بھی اپنے تمام جاہ و جلال کے سات
رواں دواں ہے ؛ بلکہ بیشمار اولیاء اللہ، بزرگان دین، صوفیا و صلحا اور فقر
و شہدا ابھی یہاں زیر زمین آرام فرما ہیں جن کے تصرفات اور عنایات و توج
سے بیشمار مخلوق خدا بلالحاظ کافر و مشرک، ملحد و موحد، حسبِ استطاعت و
بقدرِ ظرف، گلِ مراد سے اپنے دامن آرزو کو بھر رہی ہے اور اپنی تنگ دامانی
پر شرمسار بھی ہے کہ :-

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

سلطنت اودھ کا قیام

اجودھیا شہر سے چار میل یا تقریباً چھ کلومیٹر مغرب، دریائے گھاگھرا
سرجو ندی کے داھنے کنارے پر اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیو
کے درمیان جو سرزمین شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کی نشاد

---

[۱] حضرت شیث و حضرت یعقوب علیہم السلام

جو شمالی ہندوستان کے افق اقبال پر جلوہ فگن ہوئی، وہ "بنگلہ" کی بستی تھی۔
جسے میر محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں، برہان الملک)، جو نہایت ہوشیار
بیدار مغز، جری و تیغ زن تھے اور دنیا میں بخت رسا اور طالع سکندری لیکر
آئے تھے، ۱۱۲۰ ہجری مطابق ۱۷۰۸ء میں تن بہ تقدیر گھر سے نکلے کر
بخت آزمائی کے لئے ہندوستان آئے اور بعد کو سلطنت نوابین اودھ کے
بانی مبانی ہوئے۔

برہان الملک شخصیت و کردار

سعادت خاں برہان الملک طبعاً مذہبی آدمی تھے اور اپنے آبائی عقیدہ (امامیہ

فیض آباد کا اولیں نام "بنگلہ بستی" یا "بنگلہ" تھا (لکھنؤ کا دبستان شاعری و تاریخ
اودھیا مصنفہ منشی لچھمی نارائن۔ مطبوعہ لچھمی پریس گونڈہ۔ سن طباعت ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء
صفحات ۴ و ۵۔

۔ میر محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں برہان الملک) میر محمد نصیر ایرانی کے
بیٹے تھے اور امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ مولف تاریخ اودھ نے چوبیس واسطو
جناب امام موسیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے فرزند جناب زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے
ہے جو قطعی غلط اور وصفی ہے۔ (دیکھئے مقدمہ بادشاہ بیگم)
کہتے ہیں کہ ایک دن اپنی بیوی (جو ان کے چچا میر محمد یوسف جاگیر دار ایران کی
بیٹی اور میر محمد امین نیشاپوری انہیں کے دولتکدہ پر بحیثیت خانہ داماد رہتے تھے
۔ مولف) کی زبان سے انتہائی تضحیک آمیز کلمات سن کر تلملا اٹھے۔ صبر و ضبط

مذہب) میں پختہ تھے۔ ان میں سنجیدگی ومتانت بدرجۂ کمال تھی بقولِ مقدمۂ

کا یارا نہ رہا۔ بخت آزمائی کے لئے آوارہ وطنی پر کمر باندھا۔ بہادر شاہ کے ز
یعنی ۱۷۰۸ء مطابق ۱۱۲۰ ہجری میں تن بہ تقدیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے ا
ہندوستان آئے۔

شیخ تصدق حسین نے لکھا ہے کہ بعض مورخین کے نزدیک میر محمد ا
نیشاپوری کے ہندوستان آنے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے نیشاپور میں ک
ٹھیکہ لیا تھا۔ جس میں بہت زیادہ خسارہ ہوا تھا۔ چنانچہ مرزا محمد یوسف ج
(یعنی اپنے خسر) کی ماں کے زیورات فروخت کر کے زر نقصان ادا کیا، اور ر
کی وجہ سے ہندوستان چلے آئے (صفحہ ۱۴) لیکن مورخین کے اس بیا
تسلیم کرنے میں مولف کتاب ہذا کو تامل ہے کیونکہ ہندوستان آنے کے بع
محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں برہان الملک) نے کبھی ایران کا رخ کیا
اگر بات صرف زیورات کے فروخت کر ڈالنے کے جرم تک ہی محدود ہوتی تو
ہونے کے زمانہ میں زیورات کے "قرض" کو بآسانی ادا کر کے سرخ روئی حاصل کر
میر محمد امین نیشاپوری نے ہندوستان آنے کے بعد، پہلے نواب سربلند خا
خواجہ بہاؤالدین نقشبندی کی اولاد سے تھے۔ ان کی شادی معزالدین جہاندار
بادشاہ دہلی کی دختر جہاں آرا بیگم سے ہوئی تھی ـــ قیصر التواریخ و تاریخ بیگما
دربیان افضل بیگم) صوبہ دار گجرات کے یہاں سترہ روپیہ سکہ رائج الوقت
پر "میر منزل" (یعنی شاہی خیمہ نصب کرنے والے عملہ کا افسر) کی خدمت پر
(تاریخ ضیغمی میں لکھا ہے کہ سترہ روپیہ ماہوار پر فراشوں میں ملازمت کی

"وقائع دلپذیر" — "یہ ذہین و طباع اور اولوالعزم و عالی حوصلہ، ہوشیار

مولف)، ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں دہلی آئے اور فرخ سیر کے زمانہ میں ایک ذی
منصب حاصل کیا۔ مابعد محمد شاہ (جنکو اکثر مورخین نے محمد شاہ رنگیلا لکھا ہے،
شہنشاہ دہلی کو قطب الملک، امیر الامراء حسن علی خاں و حسین علی خاں، سادات
بارہہ جنھوں نے دربار دہلی میں اپنا اس قدر اثر جما رکھا تھا اکثر کتب تواریخ میں انہیں
بادشاہ ساز یا کنگ میکرس (King Makers) بھی لکھا گیا ہے مولف) کے آہنی پنجوں سے
چھڑانے والوں (خاں دوراں، خواجہ عاصم میر جملہ کاشغری وغیرہ کے ساتھیوں میں) ایک شخص
بھی تھے۔ چنانچہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں میر محمد امین نیشاپوری کو سعادت خاں
کے خطاب سے سرفراز فرما کر آگرہ کا گورنر اور مہتمم خاصان شاہی مقرر کیا (تاریخ بیگمات
اودھ صفحہ ۳۰)

جس وقت صوبہ اودھ سے رعایا کی سرکشی اور منتظمین کی بد انتظامی کی خبریں
میں شہنشاہ دہلی حضرت محمد شاہ کے کانوں تک پہنچیں تو سعادت خاں کو برہان الملک کا
خطاب دیکر (محمد شاہ بادشاہ نے ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء مطابق ۹ ذی الحجہ ۱۱۳۴ھ بروز اتوار میر محمد امین
نیشاپوری کو برہان الملک کا خطاب عطا فرمایا تھا ——— اردو شاعری کا پس منظر
صفحہ ۲۵۵ از سید اعجاز حسین مصنفہ خود) اور اواخر ۱۱۳۴ھ ہجری نظم و نسق کو قائم کرنے کے لئے
اودھ روانہ کیا (مولف بیگمات اودھ نے اودھ میں آنے کا سن ۱۱۳۱ھ لکھا
ہے جو شاید کتابت کی غلطی ہے۔ مولف)۔ برہان الملک نے لکھنؤ میں
"شیخ زادوں" کو زیر کر کے پنج محل اور مبارک محل نامی مشہور عمارتیں بزور قوت حاصل
کیں اور صوبہ میں امن و امان بحال کر کے رعایا میں جان و مال اور عزت و آبرو
کے تحفظ کا اعتماد بحال کیا۔

بیدار مغز، منتظم، جری اور تیغ زن ہونے کے ساتھ فطرتاً سادگی پسند او

میر محمد امین نیشا پوری، سعادت خاں برہان الملک نے اپنی نوابی کے سات
سال کے زمانہ کا زیادہ حصہ اجودھیا میں گزارا۔ اجودھیا شہر سے تقریباً چھ کیلومیٹر
پچھم، دریائے گھاگھرا کے کنارے پر اپنا مسکن بنوایا تھا۔ یہ مسکن کوئی آراستہ
و پیراستہ کوٹھی یا سجی سجائی حویلی نہ تھا۔ بلکہ پھوس کا بنا ہوا ایک صاف ستھرا
جھونپڑا تھا جو ایک مسطح اور بلند مقام پر بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف مٹی کی طویل و
عریض دیوار کھینچ کر، چاروں گوشوں پر چار برج بنا دئے گئے تھے۔ اس چہار دیواری
کے وسط میں، اتر جانب ایک خس پوش چھپر کا بنگلہ تھا جو میر محمد امین نیشا پوری، سعادت
خاں برہان الملک کا محل تھا۔ اس چہار دیواری کے اندر اتنی وسعت تھی کہ سوار، پیدل، اصطبل
پیدل اور توپ خانوں وغیرہ کی گنجائش تھی۔ بیگمات کے لئے بھی اسی طرح کے خس
پوش بنگلے بنے ہوئے تھے۔ سعادت خاں برہان الملک تو اپنا زیادہ وقت صوبہ (اودھ)
کے مختلف علاقوں کے دورے میں گزارتے تھے لیکن جب صوبہ کے نظم ونسق اور
امور سلطنت سے فرصت پاتے تو اسی خس پوش 'محل' میں آکر قیام کرتے تھے۔ ان
خس پوش جھونپڑوں کی مناسبت سے اس نئی بستی کا نام "بنگلہ بستی" یا "بنگلہ کی بستی"
پڑ گیا تھا۔ (ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی)۔ جو نواب ابو المنصور صفدر جنگ کے ابتدائی عہد
تک "بنگلہ" ہی کے نام سے مشہور تھا۔ یہی "بنگلہ کی بستی" اودھ کا اولین دار الخلافہ تھی
آہستہ آہستہ "بنگلہ کی بستی" کے چاروں طرف امراء، روساء، معززین اور کاروباری
لوگوں نے مکانات اور بازار بنا لئے۔ اس طرح "بنگلہ کی بستی" میں آبادی و رونق
کا روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

منافکش تھے۔ ۵ انسائکلوپیڈیا آف اسلام کے مقدمہ نگار نے برہان الملک کے متعلق لکھا ہے کہ:

"۔۔۔ برہان الملک یوں تو بھلے آدمی تھے مگر حب جاہ اور

"بنگلہ کی بستی" کے گرد جو مٹی کی کچی دیوار کا حصار بنا ہوا تھا وہ تقریباً چھ میل مربع کے رقبہ کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اس حصار کے باقیات آج بھی طویل اور بلند ٹیلوں کے سلسلہ کی شکل میں موجود ہیں (صاحبِ احوال وواقعات، نے دیوار کی اوپر کی چوڑائی بیس ہاتھ اور اونچائی کا اوسط پینتالیس ہاتھ بتلایا ہے ۔۔۔ مولف) مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ ۔۔۔ "فصیل شہر کا آثار زمین کے پاس چاہے جتنا ہو۔ درمیان میں دس گز سے کم نہ تھا۔ جو اوپر پہنچ کر پانچ گز رہ گیا تھا۔ اس فصیل پر باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روندتے پھرا کرتے اور جابجا پہرہ دیتے۔ 'باقاعدہ' سپاہیوں کی وردی لال تھی اور 'بے قاعدہ' سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ انھیں سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں جابجا چھپر ڈال دیئے جاتے تھے۔ مگر برسات ختم ہوتے ہی آگ لگنے کے اندیشے سے وہ لازمی طور پر اتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لئے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر ڈالے جاتے اور چار مہینے بعد نوچ کر پھینک دیئے جاتے (گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۲)۔

اس حصار کے باقیات لائن والے بابا کے مزار سے پورب، جالبیا نالہ سے بالکل متصل پچھم جانب میلوں لمبے ٹیلوں کے سلسلہ میں آج بھی موجود ہیں ۔۔۔ مولف)

۵۔ وقائع دلپذیر صفحہ ۱۵۔

خود مطلبی ان میں بے پناہ تھی۔ حسین علی خاں جیسے شخص کو
جنکے حاشیہ نشین اور موردِ عنایت رہے تھے، نہ بخشا۔
باوجود اُنکے شیعہ اور سید ہونے کے بھی، اُنکی جان لئے
بغیر نہ چھوڑا۔"

انسا کلوپیڈیا آف اسلام جلد ۱ صفحہ ۱۳۳۰

وقائع دلپذیر کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ برہان الملک کو جب
سلطنت کے کاموں سے فرصت ملتی تو مذہب تشیع کی تبلیغ اور اشاعت
کی کوشش کرتے۔ خواجہ موسیٰ خان جو نقشبندی مشائخ کے خاندان سے تھے
کٹر سنی تھے، انھیں کی صحبت میں شیعہ ہو گئے تھے[6] لیکن بقولِ سید
غلام حسین طباطبائی "بکمال اخفا۔" ان کی اولادیں جو کھلی شیعہ تھیں، انہیں لکھنؤ
میں جاگیر ملی تھی۔

برہان الملک پر الزام

برہان الملک پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی عملداری
کے سنی علماء اور ان کے مدارس کی جاگیریں وظائف اور معافیاں یکلخت ضبط کرنے تھے۔ یہ تمام
سنی علماء جو شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ جب جاگیریں ضبط ہو گئیں اور
وظائف بند ہو گئے اور معافیاں چھین لی گئیں تو علماء کا وہ طبقہ یا گروہ جو جاگیروں کی
آمدنی اور وظائف کے سہارے فکر معاش سے آزاد زندگی بسر کرتا چلا آرہا تھا

۶۔ مقدمہ وقائع دلپذیر صفحہ ۱۸

پریشان حال ہوگیا۔ ان کے مدارس جن میں ہزاروں طالب علم، علم دین حاصل کرتے تھے، جن کے خورد و نوش اور پوشش و رہائش نیز دیگر لازمی ضروریات کی کفالت یہ مدارس ہی کرتے تھے چند ہی دنوں میں ویران و برباد ہو گئے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "سبحۃ المرجان" میں رقمطراز ہیں :-

"۔۔۔ وظائف قدیم و جدید بیک قلم ضبط شدہ۔ مردمان آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل برآں درجہ نہ ماندہ مدرسئے از عہد قدیم درآں علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد۔"

برہان الملک کو ہم فرشتہ صفت انسان نہیں سمجھتے اور نا ہی ہم انہیں انسانی کمزوریوں سے مبرا کوئی شخصیت سمجھتے ہیں۔ انکی شخصیت کا ہر تاریک و روشن پہلو نمایاں ہے۔ مصلحتِ وقت کے لابدی تقاضوں کا مداوا اور استوار مستقبل کے لئے نا عاقبت اندیش طریق کار اور جذباتی کوتاہ بینی کے مضرات کے تباہ کن نتائج اور اثرات سے ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے اور نہ ہم وکیل صفائی کی حیثیت سے کوئی تاویل پیش کر کے کسی کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

ا۔ تاریخ اودھ مولفہ مولوی الحکیم نجم الغنی خاں رامپوری، کے بموجب برہان الملک کے اس حکم سے جس طرح سنی عقیدہ مسلمانوں کے مشائخ، علماء و فضلا اور امراء وغیرہ متاثر ہوئے اسی طرح ہندوؤں میں اکثر برہمن پنڈت اور رندروں کے مہنت وغیرہ بھی متاثر ہوئے (تاریخ اودھ) ملخص صفحات (۳۴۳ تا ۳۵۱)

برہان الملک کے کردار کی پستیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے عظیم ا
میں کچھ مٹی اہورے متعلق ادصاف حمیدہ کے روشن ستارے بھی ہیں۔ انہیں کسی خار
جذبات کے تحت دانستہ طور پر کسی خاص مصلحت، کی بنا پر نظر انداز کر
برہان الملک پر ظلم نہ سہی لیکن انصاف کا گلا گھونٹنے کے مترادف ت
ضرور ہے

ہم برہان الملک کے غیر دانشمندانہ طرز عمل اور عوامی جذبات
مفاد کے خلاف پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتے اور نہ انہیں حق بجانب سمجھ
ہیں لیکن ہم انھیں کسی خارجی جذبات سے مغلوب ہو کر خواہ مخواہ مطعون کر
دیانت داری کے خلاف اور قلم کے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم خواجہ موسیٰ خاں کے شیعہ ہونے اور سنی علماء کے مدارس
کی جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی اور قدیم وظائف کے بند کرنے کی وجوہات کا
سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں ہم یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ :-

"—— جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت
اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ
سلطنت اودھ نے مذہب کے مقابلہ میں کبھی جبر و تعدی سے
کام لیا بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو، جو اعتقاد
کے کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہی ہر جگہ ہوا ہے"

(مقدمہ ماثر الکرام از ڈاکٹر مولوی عبدالحق شیخ)

اسی جاہ طلبی کی مکروہ خواہش کی تکمیل کے لئے خواجہ موسیٰ خاں اور

ن کے جیسے نہ جانے کتنے مفاد پرست سنیوں نے دنیوی شان و شوکت اور
بجبر آفریں رعب و جلال کے حصول کے لئے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر
اکم وقت کا مذہب اختیار کر لیا تھا اور جلد تر تکمیل مفاد کے لئے جس قسم کے
ذل جذبات و افعال کا مظاہرہ، حاکم وقت کی خوشنودی کے لئے کیا ہے، اکی
فصیل سے تاریخ کی کتابوں کے اوراق سیاہ ہیں. خواجہ موسیٰ اور انکے جیسے دوسرے
ا ابن الوقت لوگوں کی تبدیلئ مذہب نہ برہان الملک کی صحبت کے اثر سے
ی تھی اور نہ کسی جبر و تعدی کے خوف و ہراس سے بلکہ اس تبدیلی مذہب کے
مل محرکات، ان کے نجی مفادات کا جلد تر منوفع حصول رہا۔ اسلئے برہان الملک کی
صیت کو اس سلسلہ میں خواہ مخواہ مورد الزام ٹھہرانا ان پر سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔

رس کی معافیاں اور جاگیریں کیوں ضبط کی گئیں

اب رہی سنی علما کے وظائف بند کرنے اور انکے مدارس کی معافیاں اور جاگیریں
ضبط کرنے کی بات، اس کے لئے ہمیں اس وقت کے درپیش ملکی، سیاسی اور
معاشرتی حالات اور ایک نوزائیدہ سلطنت کے استحکام کی لازمی بنیادی ضرورتوں
کے اہم ترین مسائل پر بھی غائر نظر رکھنا چاہئے۔

تاریخ اودھ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جس وقت برہان الملک
نے "بنگلہ" کو اپنا مستقر بنایا تھا، اسوقت یہ تمام علاقہ غیر آباد جنگل تھا۔ "بنگلہ" کی

۸- بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق مرحوم نے مآثر الکرام کی ترتیب دیگر شائع کیا ہے
اور اس کا مقدمہ بھی آپ ہی نے تحریر فرمایا ہے۔ - مولف

بستی شیعوں کی بستی نہ تھی چند افراد جو میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک کے فوجی تھی اور کچھ معتبر امراء جو ایرانی تھے وہی شیعہ (مذہب امامیہ) کے پیروکار تھے۔ البتہ لکھنؤ میں مغلیہ زمانہ سے کچھ شیعہ خاندان آباد تھے، جنکی علیحدہ ایک فرقہ کی حیثیت سے کوئی سماجی اور سیاسی پوزیشن نہیں تھی۔ ان دونوں مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ اس عہد میں بھی ان علاقوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود صاحب اقتدار تھے چونکہ خاص آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں کی تھی اسلئے انہیں کے علماء اور پنڈت، یا مندروں کے مہنت حکومت کے وظیفہ خوار تھے انہیں علماء اور پنڈتوں کے مدارس و پاٹھ شالاؤں کو انکی ضروریات کی کفالت کے لیے جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ برہان الملک کے ابتدائی دور حکومت میں، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ فیض آباد میں نہ شیعوں کی کوئی خاص آبادی تھی اور نہ ان کی نمایاں اہمیت تھی۔ نہ علحدگی پسندی کا وہ جذبہ تھا جو آج ان میں پایا جاتا ہے اور نہ انکے علحدہ مدارس تھے۔ شیعہ بھی سنیوں ہی کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے 'فرنگی محل' کا دروازہ ان کے لئے بھی کھلا رہتا تھا۔[۹]

اور جب شام ہو گئی

جب جاگیریں اور معافیاں ضبط ہوئیں اور وظائف بند کئے گئے تو انکی ضرب براہ راست مدارس اور خانقاہوں پر پڑی پنڈتوں کے پاٹھ شالاؤں اور مندروں کے مہنتوں پر بھی اس حکم کا زبردست اثر پڑا تھا۔ انکی تفصیل

۹۔ تاریخ اودھ

…تر تاریخی کتابوں میں موجود ہیں اور اس جگہ انکا بیان ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہیں۔
— مؤلف) سیکڑوں سالوں سے سایہ میں پرورش پانے والی طبیعتوں کو آفتاب
… تمازت کا علم ہوا۔ تن آسانیوں کے سارے مزے جاتے رہے۔ چہرے کا "نور"
… صنت و مجاہدہ کی خشک جھریوں میں تبدیل ہونے لگا۔

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے جاوداں پیدا (اقبال)

…دور اندیشی تھی

صوبہ اودھ میں پھیلے ہوئے مدارس، پاٹھ شالاؤں کی فیکٹریوں سے عالم و فاضل …ت و شاستری بنکر نکلنے والے طلباء کی تعداد یقیناً برہان الملک جیسے بیدار مغز اور …اندیش شخص کی تشویش کا باعث ہوئی ہوگی اور انہیں اس مسئلہ پر سنجیدگی …اتھ غور کرنے پر مجبور کیا ہوگا کہ اگر علماء و فضلاء پنڈتوں اور شاستریوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی …اوار کی یہی رفتار رہی تو ساری سلطنت میں حشرات الارض کیطرح …ی بہتات ہو جائیگی۔ ہر فارغ عالم و فاضل اور پنڈت و شاستری کیلئے درس و تدریس …آسامی مدارس و پاٹھ شالاؤں میں کہاں سے پیدا کی جائے گی؟[۱] اور نئے نئے مدارس …ھ شالائیں کھول کر حکومت اپنے خزانہ پر کتنا بوجھ ڈالتی رہے گی؟[۲]

۱۔ آج ہندوستان کی قومی حکومت بھی ملک میں تعلیم یافتہ بیروزگار لوگوں کی بیکاری سے پریشان …ور انھیں بارروزگار بنانے کیلئے ملک میں مختلف منصوبے بھی چلائے جارہے ہیں لیکن "پیداوار" …نسبت "بحالی" کی رفتار کافی سست ہے اور اس زمانہ میں تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ گمبھیر رہا ہوگا۔ مؤلف

۲۔ اب مدارس کی کفالت کا سارا بوجھ مسلمان قوم نے اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ مؤلف

اس زمانہ کے مدارس کے اساتذہ کرام اور طلبار، مہمانانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم، کے نام پر حکومت کی عطا کردہ جاگیروں، معافیوں اور وظائف سے جیسی پر تکلف اور بیفکری کی زندگی بسر کرتے تھے، وہ حکمراں طبقہ کو بھی میسر نہ تھی۔ کروڑوں روپے کے وظائف اور جاگیروں و معافیوں کی آمدنی ان مدارس کے اساتذہ خصوصاً اور طلبار عموماً تین تین گھنٹے "قیلولہ" کرکے زبردستی ہضم کرتے تھے۔

معاشرہ میں علمار و فضلا کی پر وقار سماجی حیثیت سے لوگ اس قدر متاثر تھے کہ متوسط اور خواص طبقہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے لائق بچوں کو عالم و فاضل بنانے کیلئے کوشاں تھی (نااہل بچے عموماً خانقاہوں میں کچھ دن ٹریننگ کیلئے بھیج دیے جاتے تھے پھر ذاتی اثر و رسوخ اور وابستہ خانقاہ کی نسبت سے جلد ہی "مرشد" بن جاتے تھے ــــ مولف) مسلمانوں میں یہ عام جذبہ پیدا ہوگیا تھا کہ عالم و فاضل بنکر کسی مدرسہ سے وابستہ ہوکر یا نئے مدارس قائم کرکے حکومتِ وقت سے وظائف و جاگیریں لیکر، ساری زندگی عیش و آرام کی بیفکر زندگی بسر کرنے کیلئے اس سے بہتر اس وقت کوئی دوسرا موزوں ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور حقیقتاً تھا بھی ایسا ہی۔

نظم و ضبط کیلئے فوج کی ضرورت تھی

برہان الملک کے پاس صرف چند ہزار فوجی تھے جن میں زیادہ تر پچھمی علاقے کے پٹھان و افغان، کچھ مغل اور تھوڑے سے علاقائی لوگ اور وہ بھی ادنیٰ ذاتوں کے جو قابل اعتماد نہ تھے ــــ "مولف" فوجی تھے جو صوبہ اودھ جیسے وسیع علاقے کی انتظامی ضرورت اور گرد و نواح کے سرکش زمینداروں کی سرکوبی کے لئے قطعی ناکافی تھے۔ یہاں

اندر اس اندر پانچ سالاؤں کے پھیلے ہوئے جال سے اعلیٰ ذاتوں اور طبقات سے معتبر فوجی ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور تھا۔ ایسی صورتِ حال میں ایک دور اندیش حکمراں کو ملکی مفاد اور نظم و ضبط کے استحکام کے لئے جو قدم اٹھانا چاہیئے تھا، وہ برہان الملک نے اٹھایا اور جس علاقے سے کبھی چند سو سپاہیوں کا ملنا دشوار تر تھا، پچیس تیس سال کے اندر ہی، اُسی علاقہ کے رہنے والے ستر ہزار صرف پیادہ سپاہیوں کی زبردست فوج فیض آباد میں ہی رہنے لگی تھی![۱۲]

۱۱۔ نواب شجاع الدولہ کے قبضہ میں جو فوج صرف فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی اس کی مجموعی تعداد یہ تھی:۔ سرخ وردی والے تیس ہزار، باقاعدہ اور سیاہ وردی والے چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے تھے، جنکے سپہ سالار سید احمد بانسی والا تھے (گذشتہ لکھنؤ صفحات ۱۴، ۱۵)

۱۔ نادر شاہ والئی ایران کی آمد سے قبل ۱۷۳۷ء میں جب دلی کی سلطنت صرف نام کی باقی رہ گئی تھی اس وقت برہان الملک اودھ کے صوبہ دار کے بجائے نیم خود مختار صوبہ دار بن چکے تھے۔ ۱۷۳۷ء میں پایہ تخت دہلی میں بسلسلہ حملہ نادر شاہ دہلی میں مقیم تھے مقدمہ نگار وقائع دلپذیر نے لکھا ہے کہ برہان الملک بار بار تقاضہ کرنے کے بعد سب سے آخر میں دہلی میں اپنی فوج لے کر آئے تھے صفحہ ۱۶) انہوں نے اپنے کردار کی کمزوریوں اور اخلاقی پستی کا اتنا گھناؤنا مظاہرہ کیا کہ دہلی کی بیگناہ رعایا پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ اگر اسے پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ مل جائے تو وہ کرنال سے ہی واپس چلا جائے گا۔ (بادشاہ بیگم اودھ میں تحریر ہے کہ پانچ کروڑ روپیہ بطور تاوانِ جنگ وصول کر کے، کرنال ہی سے واپس جانے کا عزم کر چکا تھا صفحہ ۱۷) بظاہر تمام معاملات طے ہو چکے تھے، لیکن سعادت خاں برہان الملک نے نادر شاہ کی

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ

فیض آباد کی قدیم "بنگلہ بستی" کے بسانے والے میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک کے انتقال کے بعد[۱۳] ان کے بھانجے اور کنیز زادے داماد میر منصور علی خاں[۱۴] پسر مرزا جعفر بیگ جو برہان الملک کے بہنوئی تھے، مسند نشین ہوئے۔[۱۵] اور ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۲ھ ہجری میں "بنگلہ کی بستی" کو

خوشنودی اور تقرب حاصل کرنے کیلئے یا مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کیلئے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس نے پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ لینے کا فیصلہ کرکے سخت ترین دھوکا کھایا ہے کیونکہ اگر وہ دلی پہنچ جائے تو اسکو کم از کم بیس کروڑ روپے اور بیشمار نقد و جواہر ہاتھ آئیں تاریخ مظفری میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"۔۔۔ سعادت خاں برہان الملک .... نادر شاہ را بر رفتن دارالخلافہ شاہجہان آباد ترغیب نمود۔ داد نمکحرامی ادا کرد و خزائن و دفائن آنجا را گوش زد کرد۔"

(بحوالہ شاہ بیگم اودھ صفحہ ۱۷)

سعادت خاں برہان الملک کے اس سبز باغ دکھانے کے بعد نادر شاہ سیدھا دلی پہنچا اور قتل عام کا اعلان کرکے ہزاروں معصوم و بے گناہ انسانوں کو گاجر مولی کیطرح کٹوا ڈالا۔ جس مکروہ مفاد کے حصول کے لئے برہان الملک نے نادر شاہ کو دہلی کی تباہی و بربادی اور قتل و غارتگری پر آمادہ کیا تھا، اُس کے نتائج یقینی طور پر برعکس متوقع (لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۱۸) کیونکہ دہلی کے شاہی خزانہ میں بیس کروڑ روپے

فیض آباد کا نام دیگر نوابین اودھ کی شان و شوکت کا مثالی نمونہ بنانے کا سنگ بنیاد رکھا۔

نواب صفدر جنگ ___ کردار و شخصیت

نواب ابو المنصور صفدر جنگ ہیں اُنکے ماموں، سعادت خاں برہان الملک

کی خطیر رقم تھی ہی کہاں جو نادر شاہ کو ملتی ؟ دہلی کے شاہی خزانہ میں جو سب سے بڑی رقم جمع ہوئی تھی وہ شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں جمع ہوئی تھی اور وہ بھی سولہ کروڑ روپے تھی اس لئے نادر شاہ کو دہلی کے شاہی خزانہ سے بیس کروڑ روپے ملنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

دہلی پر حملہ کرنے سے قبل نادر شاہ نے میر محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ لیکر واپس جانیکے فیصلے پر دہلی پر حملہ کر رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ شاہی خزانہ سے بیس کروڑ روپیہ کی رقم نہ ملی تو وہ اُن (برہان الملک) سے وصول کرے گا۔ بریں بنا سعادت خاں برہان الملک نے نادر شاہ کے ہاتھوں اپنی تذلیل و توہین کے اندیشہ سے زہر کا پیالہ پی کر ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء مطابق ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ ہجری بروز دوشنبہ اپنے سفینۂ حیات کو بحرفنا میں غرق کر دیا (دی فرسٹ ٹو نواب آف اودھ از ڈاکٹر آشیروادی لال شریواستو)

تاریخ وقائع دلپذیر کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ سرطان کا پھوڑا پھوٹنے سے زہر کا مادہ ان کے جسم میں پھیل گیا تھا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی (صفحہ ۱۸) لیکن حالات و واقعات پر نظر رکھتے ہوئے وقائع دلپذیر کے مقدمہ نگار کی بات بے وزن معلوم ہوتی ہے کیونکہ برہان الملک کی غداری کا چرچا تو زبانِ خلق پر رہا۔ اسی زمانہ کے کسی شاعر

جیسی اولوالعزمی نہ تھی لیکن سیر چشمی، عالی حوصلگی، فیاضی و رحم دلی اور دوسرے

نے ایک عدد کی زیادتی سے ان کی تاریخ ہلاکت اس طرح کہی ہے:

بے سعادت نمکحرام بمرد

۱۲ + ۵۲۵ + ۵۹ + ۳ + ۲۴۷ = ۱۱۵۲ھ = ۱۴۷

برہان الملک کی نعش اولاً دہلی میں دفن کی گئی۔ مابعد اُنکی کنیز زادی بیٹی صدر النسا (صدر جہاں بیگم) الملقب بہ "نواب بیگم" نے جو خدیجہ خانم بطن سے تھی اور نواب ابو المنصور صفدر جنگ کی بیوی تھی، اپنے شوہر نامدار کے زمانہ اقتدار میں، قبر سے ہڈیاں نکلوا کر مرزا بھجو کی معرفت کربلا معلّیٰ روانہ کیا۔ وہاں روضہ مقدسہ کی پشت پر دفن کر دی گئیں۔

تاریخ بادشاہ بیگم اودھ میں تحریر ہے کہ مرزا بھجو صاحب کربلا معلّیٰ سے ہندوستان واپس نہیں آئے تھے بلکہ وہیں مقیم ہو گئے تھے اور جب وہابیوں نے زبان قتل عام کیا تو یہ بھی ہلاک ہوئے تھے۔

۱۴۱۔ اکثر کتب تواریخ میں مرزا منصور علی خاں کا نام مرزا محمد مقیم یا مرزا محمد مستقیم لکھا ہے (بیگمات اودھ وغیرہ) لیکن وقائع دلپذیر بادشاہ بیگم کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ کوئی صفدر جنگ کا نام مرزا محمد مستقیم بتاتا ہے اور کوئی منصور علی خاں (اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری ۲۳۰) صفحہ پر مسٹر ٹی ڈبلو بیل نے صفدر جنگ کا نام مرزا محمد مقیم ہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ منصور علیخاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ______ مولف)، لیکن منصور علی خاں نام زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ ان کے پرپوتے بادشاہ غازی الدین حیدر اپنے گھرانے کو "منصور" یہ خاندان کہا کرتے تھے (صفحہ ۱۸) نواب صفدر جنگ نے اپنے دورِ حکومت میں جو پیسہ چلایا تھا وہ "منصوری پیسہ" کہلاتا تھا۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے "وقائع عالم شاہی" میں تشریحات کے تحت صفحہ ۱۰۳ پر تحریر فرمایا ہے کہ مرزا محمد مقیم نام اور منصور علی خاں لقب ہے۔ جعفر قلی بیگ کا بیٹا اور نواب برہان الملک کا حقیقی بھانجہ تھا۔ نیشاپور میں پیدا ہوا تھا۔ منشی سید غلام حسین طباطبائی نے سیر المتاخرین

مراتب امارت میں اپنے زمانہ میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ عیاشی اور لہو و لعب

(صفحہ ۵۹) میں لکھا ہے کہ "۔۔۔۔ پدر منصور علی کاسہ سازے بود" اس فقرے میں بھی منصور علی خاں ہی تحریر ہے۔

منصور علی خاں (نواب ابوالمنصور صفدر جنگ) باپ کی طرف سے، قوم سے مغل تھے (بعض تاریخ نویسوں نے ترکمان لکھا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مولف)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ برہان الملک کے انتقال کے بعد محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اُن کے صغیر سن بیٹے کو صوبہ اودھ کا صوبہ دار مقرر کر کے صفدر جنگ کو بدستور نائب اور متولی امور حکومت کیا تھا۔ لیکن یہ صفدر جنگ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچہ بچپن ہی میں چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اور یہ بالاستقلال صوبہ دار بنا دیئے گئے۔ مگر اس عہدے کو حاصل کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے کی رشوت دینا پڑی تھی (تشریحات وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۷۲)

۱۵۔ تاریخ اودھ جلد سوم (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ) میں حکیم مولوی نجم الغنی خاں صاحب رامپوری نے لکھا ہے کہ نواب سعادت علی خاں برہان الملک کی موت پر یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ مرحوم کا جانشین کون ہو؟ نواب مرحوم کے بھتیجے، میر نثار محمد خاں، شیر جنگ [جن کے نام سے آج بھی اجودھیا میں موجودہ محلہ ٹیڑھی بازار کے پچھم جانب، اور کامتا پرشاد سندر لال پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج کی مشرقی چہار دیواری سے متصل محلہ انھیں شیر جنگ، کے نام پر ہے۔ کبھی اس مقام کی حیثیت ایک بارونق بازار کی تھی اور "بازار شیر جنگ" کے نام سے مشہور تھا۔ آج اس مقام کی حیثیت صرف ایک چھوٹے سے اُجاڑ محلہ کی ہے زیادہ تر نچلے طبقہ کے لوگ آباد ہیں۔ ضعیف العمر لوگ آج بھی اس محلہ کو بازار شیر جنگ،

جو اُس زمانہ کے با اختیار امرا کا طغرائے امتیاز تھا، سے ہمیشہ متنفر ہے۔ ا

محلہ کہتے ہیں۔ دلکھنوٹی اسٹیشن کے پاس ایک باغ "باغ شیر جنگ" کے نام سے ابتک
موجود ہے۔ مولف) میر نثار محمد خاں میر محمد باقر مخاطب بہ "سیادت خان" کے لڑکے اور میر محمد علی
جمدوز یر المیران کے داماد تھے۔ (شیخ تصدق حسین صاحب نے لکھا ہے کہ میر نثار محمد خاں کو "شیر جنگ
کا خطاب حضرت محمد شاہ بادشاہ دہلی نے عطا فرمایا تھا ــــ مولف) ان کا (میر نثار محم
خاں کا) اور مرزا منصور علی خاں (نواب صفدر جنگ)، ہمشیر زادہ و داماد سعادت خا
برہان الملک سے زبردست مقابلہ رہا۔ میر نثار محمد خاں، شیر جنگ کا دعویٰ تھا کہ از رو
شریعت انہیں مسند نشین ہونا چاہیے اور صفدر جنگ کہتے تھے کہ میں سعادت خ
برہان الملک کا ہمشیر زادہ اور داماد ہوں اس لئے مسند صوبیداری مجھے ملنا چاہیے۔
آخر ش صفدر جنگ کی چال چل گئی۔ اُن کا پلہ بھاری پڑ گیا۔ انہوں نے سب سے بڑ
اور زوردار سفارش یعنی دو کروڑ روپیہ کی نذر نادر شاہ کی خدمت میں گذاری ا
قرعہ انتخاب انھیں کے نام پڑا اور خلوت صوبیداری سے سرفراز ہوئے۔

۱۶۔ بہبہانی نے لکھا ہے کہ خراسان میں نجف اشرف کے پاس فیض آباد نام کا ایک قصبہ ہے۔
یہاں کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے۔ خربوزہ وغیرہ پھل یہاں عمدہ اور کثرت سے ہوتے ہیں۔ صفدر جنگ
نے اس بستی کے نام پر اپنے بسائے ہوئے شہر کا نام فیض آباد رکھا تھا ورنہ پہلے اسے "بنگلہ" کہتے تھے
۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء تک بنگلہ اور فیض آباد دونوں نام زبان پر جاری تھے۔ (تشریحات وقائع عا
صفحہ ۴۱)

۱۷۔ میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک نے چار شادیاں کی
تھیں۔ پہلی شادی ایران ہی میں اُن کے خویش میر محمد یوسف جاگیر دار ایران کی لڑکی

مجلس لہو ولعب سے ہمیشہ خالی رہی۔

ہوئی اور اُسی کے میکے میں بطور "خانہ داماد" رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسی ایرانی بیوی کی تیغ زبان کا جرکا کھاکر، آوارہ وطنی پر کمر باندھا اور ہندوستان آئے (ہندوستان آنے کے بعد موصوف نے کبھی ایران کا رخ نہیں کیا اور نہ کبھی اس ایرانی بیوی کی کھوج خبر لی۔ تاریخ میں اس بیوی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی جس سے معلوم ہوتا کہ ایران میں اس غریب کا کیا حشر ہوا ــــ مولف)

ہندوستان میں سعادت خاں برہان الملک نے تین شادیاں کی تھیں پہلی شادی نواب کلب علی خاں کی دختر سے کی تھی جو سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کے ماموں تھے اور دہلی کے ایک معزز باشندہ و شاہی عہدہ دار تھے۔ اس بیوی کا انتقال شادی کے چند ہی دنوں بعد ہو گیا تھا۔ دوسری شادی سید طالب محمد آصف جاہ کی صاحبزادی سے کی تھی جن سے چار لڑکیاں (۱۔ نور جہاں معروف بہ ہینگا بیگم ۲۔ ہُما بیگم معروف بہ بندی بیگم ۳۔ محمدی بیگم ۴۔ آمنہ بیگم) اور ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو حسن طفولیت میں چیچک کی نذر ہو گیا تھا (عماد السعادت صفحہ ۲۸)۔ تیسری شادی سنہ ۱۷۱۰ء مطابق سنہ ۱۱۲۲ ہجری میں نواب محمد تقی خاں صوبیدار اکبرآباد کی دختر سے کی (جو شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ملک عدم کو سدھار گئی تھیں ــــ مولف) اس شادی میں برہان الملک کو جہیز میں ایک کنیز بھی ملی تھی جس کا نام خدیجہ خانم تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد خدیجہ خانم نواب موصوف کے "تصرف" میں آتی رہیں چنانچہ ان دونوں کے تعلق سے سنہ ۱۷۱۰ء کے آخری ایام میں خدیجہ خانم کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدر النسا رکھا گیا گھر والے اُسے پیار سے "منی بیگم" کہتے تھے۔ (تفضیح الغافلین از مرزا ابو طالب مترجمہ

مسٹر ولیم ہوئے)

سنہ ۱۷۲۲ء مطابق سنہ ۱۱۳۵ ہجری میں جب کنیز زادی صدر النساء کی عمر بارہ سال
کی ہو گئی تو برہان الملک نے اپنی ہمشیرہ خورد کو جو مرزا جعفر قلی بیگ خاں سے منسوب تھیں
ایران سے بلوا کر اس بچی (صدر النساء) کی شادی ان کے لڑکے مرزا منصور علی خاں (نواب
صفدر جنگ) سے کر دی اور صدر النسا کے بجائے "صدر جہاں" کے نام سے موسوم
سسرال سے "نواب بیگم" کا خطاب عطا ہوا۔ (تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۲۲

عماد السعادت میں صدر جہاں کی ماں کے متعلق تحریر ہے کہ:

"ــــ ولادت آں دُر دریائے سیادت و عفت از بطن عفیفہ محترمہ خانم
صاحبہ اتفاق افتادہ کہ مقبرہ اش در باغے کہ شہرت بہ باغ بڑا امّن دارد
تعمیر پذیرافت ــــ"

(عماد السعادت صفحہ ۷۶ مطبوعہ منشی نولکشور پریس
لکھنؤ سال طباعت ۱۸۶۴ء / ۱۲۸۱ھ)

صاحب عماد السعادت نے خانم صاحبہ کے نام و نشان کو ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی
سید کمال الدین حیدر نے اپنی کتاب قیصر التواریخ میں خانم صاحبہ کے نام و نسب پر
کوئی روشنی ڈالی ہے۔ البتہ مرزا ابو طالب اصفہانی نے تفضیح الغافلین میں اس راز
سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے:

"ــــ سعادت خاں برہان الملک کی بیٹی نواب مرحوم (شجاع الدولہ) کی
والدہ ایک جاریہ کے بطن سے تھیں ..... جو بر وقت شادی نو

(تشیع) میں پختہ تھے لیکن ان میں نہ شجاع الدولہ جیسا مجنونانہ جوش تھا اور نہ سعادت خاں کو جیسی تنک ہی تھی۔

تاریخ آصفی (اردو ترجمہ) کے صفحہ ۲۹ پر نواب صفدر جنگ کے ذکر میں تحریر ہے کہ "سعادت خاں کی بیٹی مرحوم نواب شجاع الدولہ کی ماں بی بی اسی خاندان کی ایک کنیز ہیں۔"

مرزا ابو طالب کی عبارت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عماد السعادت نے انتہائی فصیح و بلیغ اور معنی خیز انداز میں صرف چند جملوں میں اُس مفہوم کو ادا کر دیا ہے جو مرزا ابو طالب نے واضح اور صریح الفاظ میں ادا کیا ہے۔

خدیجہ خانم کی قبر، امین الدولہ پارک (لکھنؤ) میں ایک ہشت پہل چبوترہ پر واقع ہے جس کو عوام ناواقفیت کی بنا پر "شہید مرد" کی قبر سمجھ کر پھول چڑھاتے ہیں اور روشنی کرتے ہیں۔ اپنے زمانہ زندگی میں خدیجہ خانم نے اس جگہ ایک باغ لگا کر ایک مسجد اور حمام سماۃ جے کنور کی معرفت جو قوم کی برہمن (پنڈیتائن یا پڑائن) تھی، تیار کرایا تھا (بعد کو جے کنور مسلمان ہوگئی تھی ـــــ مولف)۔ جس سال مسجد بن کر تیار ہوئی، اسی سال خدیجہ خانم کا انتقال ہوا۔ اُن کا یہ باغ ان کی دائمی آرام گاہ قرار پایا، مگر مسجد "پڑائن کی مسجد" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ آج کل لوگ اس مسجد کو "جنوں کی مسجد" کہنے لگے ہیں۔ لوگ یہاں آکر منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ خدیجہ خانم کی قبر پر ایک مقبرہ بنا ہوا تھا جو سن ۱۶-۱۹۱۵ء میں منہدم ہوگیا۔ موجودہ سرکاری سڑک نکلنے سے مسجد، جو اس قبر اور مقبرہ کے پچھم جانب تھی، سڑک کے دوسری طرف ہو کر قبر اور مقبرہ سے بالکل جدا ہوگئی۔

جناب شیخ تصدق حسین صاحب نے، زمانۂ مابعد میں، خدیجہ خانم کے اس باغ

آصف الدولہ جیسی مذہبی تشدد کا کوعنصر۔ وہ نہایت معتدل مزاج، شریف النفس
اور نیک طینت انسان تھے۔

شاہ حمزہ نے اپنی کتاب کشف الاستار (جلد ۳ صفحہ ۸۷) میں لکھا
کہ جس وقت نواب صفدر جنگ نے سنا کہ ان کے فوجیوں نے مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے
شرفا کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا ہے اور ان کی املاک و گھر بار لوٹ لیا ہے
تو انھیں سخت دلی تکلیف ہوئی اور فوجیوں کی اس ناشائستہ حرکت اور بربریت
پر ان کی جو حالت ہوئی تھی وہ ان کے ہمعصر مورخ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"۔۔۔ تمام شب و روز بریں ماجرا ملول و اکثر گریاں بود و طعام
نخورد ۔۔۔"

(شاہ بیگم اودھ صفحہ ۶۸)

کے متعلق لکھا ہے کہ امجد علیشاہ بادشاہ اودھ نے یہ تمام املاک اپنے وزیر اعظم مولوی
امداد حسین خاں، امین الدولہ کو عطا کر دیا تھا جنھوں نے اس باغ کو اپنے نام پر "امداد باغ"
رکھا مگر ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میونسپل بورڈ نے یہ تمام املاک و اراضی لے کر ایک پارک بنوایا
جس کا نام مولوی امداد حسین خاں، امین الدولہ کی یاد میں "امین الدولہ پارک" رکھ دیا
امین آباد کا محلہ بھی نواب امین الدولہ مرحوم کے نام پر آباد ہوا ہے۔ (بیگمات اودھ
در بیان "نواب صدر جہاں بیگم")

بنگلہ سے فیض آباد تک

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کے عہد میں فیض آباد کی آبادی اور
بستی میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تھا۔ امرار، خواص، افسران لشکر کے
علاوہ عوام بھی "بنگلہ بستی" کے ارد گرد بسنے لگے تھے۔ نواب موصوف کی حوصلہ
افزائیوں اور قدر شناسیوں کی وجہ سے فیض آباد میں علوم وفنون کے یکتائے
زمانہ اور صناع و اہل حرفہ کا اجتماع شروع ہو گیا تھا۔ دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد
اہل علم و ماہرین فن کی نگاہیں فیض آباد کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جو بچپن کی منزلوں
کو انتہائی عجلت و سرعت کے ساتھ طے کر کے عنفوان شباب کی ہنگامہ خیزیوں
میں قدم رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ دہلی کے اطبار، شعرار اور علمار و فضلار
وغیرہ نے فیض آباد کا رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن بھی آگیا کہ فیض آباد شاہجہان آباد
کی ہمسری کرنے لگا۔

فیض آباد کی کشش و قدر دانی

جلدی ہی وہ دن بھی آگیا جب شرفائے دہلی اور انکے اعزہ واقارب لباس فاخرہ
پہنے ہاتھوں میں چاندی کی شاندار چھڑیاں نظر آنے لگے۔ دہلی میں آشوب زمانہ سے اُٹھے اور
مرجھائے خوفزدہ، زرد چہرے فیض آباد میں کھل اٹھے۔ خوف وہراس اور اندیشہ
کی پیدا کی ہوئی چہرے کی زردی شگفتگی و شادابی میں بدل گئی۔ دہلی کے
معززین، شرفار، روسار وغیرہ کو دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ یہ "بنگلہ بستی"

کا فیض آباد نہیں دہلی ہے۔ کچھ جانے پہچانے اور کچھ اجنبی و سنجیدہ اور متین چہرے
زرق برق لباسوں میں ملبوس، ایک دوسرے سے خندہ پیشانی اور کشادہ دلی
سے ملتے اور معانقہ کرتے۔ ایک دوسرے کی خیرو عافیت دریافت کرنے کے
بعد معلوم کرتے کہ اس "عروس البلاد" میں تشریف آوری کب ہوئی؟ —
کوئی سفر کو آرام و اطمینان سے طے ہونے کا ذکر کرتا تو چہرے کھل اٹھتے اور شکر
بجالاتے۔ جب کوئی سفر کے مصائب اور افتاد بیان کرتا تو شگفتہ چہرے متین و
سنجیدہ ہو جاتے اور صبر و شکر کی تلقین کرتے۔ ہر شخص فیض آباد کی قدر شناسی
اور حوصلہ افزائیوں کا مدح خواں تھا۔ باشندگانِ فیض آباد کی کشادہ دلی اور پزیرائی
کے سبھی لوگ رطب اللسان تھے۔

اہالیانِ فیض آباد نے جس خندہ پیشانی سے دہلی و لکھنؤ کے لوگوں کی پزیرائی
کیا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، عنایت و نوازشات کا وہ سلوک روا کیا کہ دہلی کی
تباہی و بربادی اور اجڑنے کا غم جاتا رہا۔ اطبائے دہلی کے مطب کی سابقہ شان
و شوکت بدستور سابق ہو گئی۔ شعرائے دہلی نے یہاں کی شعر و شاعری کی محفلوں
کو وہ رونق بخشی جو کچھ دلّی ہی کا حصّہ تھی۔

بہر حال نواب ابوالمنصور صفدر جنگ، فیض آباد کے محلوں کی ترتیب
کاری، تزئین و آرائش وغیرہ پر اس قدر توجہ مبذول کئے ہوئے تھے کہ لوگوں
کو گمان ہو چلا تھا کہ جلد ہی فیض آباد، دہلی ثانی بن جائیگا۔

فیض آباد کی زیب و زینت اور اس کی منصوبہ بند آباد کاری اور اسے
"عروس البلاد" بنانے میں صرف نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کا ذہن ہی نہیں

کار فرما تھا بلکہ اس کی اصل محرک انکی چہیتی بیوی "صدر جہاں" (نواب بیگم) صاحبہ تھیں جن کے پیار و اخلاص نے دونوں میاں بیوی کو ایک جان دو قالب کر دیا تھا۔ نواب بیگم صاحبہ نہایت فیاض، حلیم، مخیر، نیک سیرت، وفا شعار، مطیع و فرمانبردار بیوی تھیں۔ شیخ تصدق حسین نے نواب بیگم صاحبہ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"— نواب ابو المنصور صفدر جنگ نے باوجود دولت و حشمت برخلاف دیگر اکابر، صرف صدر جہاں بیگم پر ہی قناعت کی۔ نہ کوئی دوسرا محل نہ کیا نہ کبھی کسی عورت کیطرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔"[18]

(صفحہ ۲۲)

سید غلام علی نقوی کا تاثر یہ ہے:

"— حیا و آدمیت او مقتضی آں نشد کہ سوائے جلیلہ عفیفہ با دیگر زنے سروکار بہم رساند۔"[19]

۱۸- سید اقبال احمد نے تاریخ دار السرور جونپور، میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں فرخ آبادی پٹھانوں کے لیڈر نواب احمد خاں بنگش نے اودھ پر قبضہ کر لیا تھا اسی دوران نواب صفدر جنگ نے جونپور کے ایک متمول رئیس شبیر زماں خاں کی لڑکی سے شادی کی تھی اور صاحب زماں خاں، شبیر زماں خاں کے بھتیجے تھے، انہیں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فیض آباد، اعظم گڑھ، بنارس پر قبضہ کرلے۔ صفدر جنگ نے صاحب زماں خاں کے ساتھ ایک کثیر فوج بھی کر دی۔ (تاریخ دار السرور جونپور مصنفہ سید اقبال احمد صفحات ۲۲۰، ۲۲۱۔ مطبوعہ نامی پریس لکھنو)

۱۹- عماد السعادت صفحہ ۳۶۔ مطبوعہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ، سال طباعت ۱۸۹۱ء۔

ولادت نواب شجاع الدولہ

شادی کے دسویں سال یعنی ۱۵ جنوری ۱۷۳۲ء مطابق ۲۸ رجب ۱۱۴۴ھ ہجری بروز منگل (سہ شنبہ) اللہ رب العزت نے نواب بیگم صاحبہ کو ایک چاند سا نورِ نظر اور لختِ جگر عطا فرمادیا۔[۲۰] صاحبزادہ کا نام جلال الدین حیدر رکھا گیا۔ یہ ولادت باسعادت دہلی میں "محل دارا شکوہ" میں واقع ہوئی تھی۔ جو شہنشاہ دہلی نے میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک کو دہلی میں قیام کرنے کے لئے عطا فرمایا تھا

۲۰۔ جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) کی تاریخ تولد یہ ہے۔

بدولت خانۂ نواب منصور ؛ برآمد آفتاب از مطلع نور

۴۴۷ + ۴۴۰ + ۰ + ۱۴۹ + ۲۵۶ = ۱۱۴۴ھ

(تاریخ اودھ الملخص صفحات ۶۳، ۱۸۶)

۲۱۔ محل دارا شکوہ، شاہزادہ دارا شکوہ کا محل تھا جسے شاہجہاں بادشاہ نے بنوایا تھا۔ دارا شکوہ، شہنشاہ شاہ جہاں کا بڑا لڑکا تھا۔ جو پیر (دو شنبہ) کی رات صفر کی انتیسویں تاریخ ۱۰۲۴ھ (مطابق ۱۱ مارچ ۱۶۱۵ء ــ مولف) میں ممتاز محل کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ (تزک جہانگیری) سبحان رائے بھنڈاری نے دارا شکوہ کی پیدائش کی تاریخ ۱۹ صفر ۱۰۲۴ ہجری (مطابق خلاصۃ التواریخ) مگر شہنشاہ جہانگیر کے بیان کے پیش نظر سبحان رائے بھنڈاری کی تاریخ کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ بالیقین سہو قلم معلوم ہوتی ہے۔

۲ شعبان ۱۰۴۲ ہجری (مطابق یکم فروری ۱۶۳۳ء ــ مولف) بروز جمعہ نادرہ بانو بنت سلطان پرویز بن جہانگیر کے ساتھ بڑی شان و شکوہ کے ساتھ شادی ہوئی (ڈبلو۔ ٹی۔ بیل نے

خاندان وزارت میں شجاع الدولہ کی شادی

جب صاحبزادہ جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) کی عمر چودہ سال ہوئی تو اُن کی شادی اُمتہ الزہرہ کے ساتھ ہوئی جو محمد اسحاق خاں شوستری، ...ن الدولہ کی نورِ نظر[۲۳] اور مرزا محمد خان شوشتری المخاطب بہ محمد اسحاق خاں نجم الدولہ کی ہمشیرہ اور

...ٹش بایوگرافیکل ڈکشنری میں سہواً ۱۰۴۳ھ لکھ دیا ہے — مولف) سن ۱۶۵۴ء میں ...ہنشاہ شاہ جہاں نے ولیعہد مقرر کیا اور ڈھائی لاکھ روپئے کی قیمت کا خلعت اور ایک لاکھ ...ہزار روپئے کا سرپند اور "شاہ بلند اقبال" خطاب عطا کر کے اپنے تخت کے برابر سونے کی ...ی پر بیٹھنے کا حکم دیا (تاریخ مظفری)۔ ۱۶۵۰ء کے آخر میں پچاس ہزاری تیس ہزار سوار ...ے دُو سپہ و سہ اسپہ منصب عطا کیا۔ اور جنوری ۱۶۵۸ء میں ساٹھ ہزاری تیس ہزار سوار منصب دیکر تیئیس[۲۳] کروڑ دام کا علاقہ اور ایک کروڑ روپیہ نقد اور بہار کا صوبہ مزید عنایت کیا۔

اِس زمانہ میں شہنشاہ شاہ جہاں سخت بیمار ہو کر کام کرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ ...شکوہ نے باپ کی محبت اور اس کی انتہائی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس راہ کا پہلا ...م بھائیوں کے کانٹے کو راہ سے ہٹانا تھا۔ اور نگ زیب سیاسی لحاظ سے تمام بھائیوں میں نمایاں ... دارا شکوہ نے پہلے اسی کو نشانہ بنایا۔

شاہجہاں بستر علالت پر لیٹے لیٹے صلح و صفائی کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ...ور سب بھائیوں نے مل کر دارا شکوہ کے خلاف محاذ قائم کر لیا، اور نتیجۃً اُسے ہر معرکہ میں شکست ...ہوئی۔ وہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ (مطابق ۲۸ اگست ۱۶۵۹ء — مولف) بروز دوشنبہ گرفتار ...کے دہلی لایا گیا۔ خضرآباد کی عمارتوں میں سے خواص پورہ کی ایک عمارت جو کافی مضبوط تھی۔

محمد شاہ بادشاہ کی منہ بولی بہن تھیں[24]۔ اس شادی میں خود شہنشاہ دہلی حضرت محمد شاہ بادشاہ بنفس نفیس مع ارکین دولت و عمائدین سلطنت، فیض آباد میں رونق افروز تھے[25]۔ ۱۷۴۰ء کے

جیل خانہ قرار پائی۔ دہلی میں جو لوگ دارا شکوہ کے ہوا خواہ تھے انھوں نے شورش برپا کردی، اس پر عالمگیر کے حکم سے جمعرات کی رات کے اول حصے میں اکیسویں ماہ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ (مطابق ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء — مولف)، کو دارا شکوہ کو قتل کردیا گیا اور نعش ہمایوں کے مقبرہ میں سپرد خاک ہوئی۔ (عالمگیر نامہ از مرزا محمد کاظم صفحہ ۴۳۲۔ عالمگیر نامہ از مستعد خاں صفحہ ۱۴۔ تاریخ مظفری و آئینہ نجت وغیرہ)

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے وقائع عالم شاہی مصنفہ پریم کشور فراقی میں صفحہ ۱۰۹ پر تشریحات کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ تمام تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ ذی الحجہ کو بدھ کا دن تھا۔ عالمگیر نے بدھ کے دن کے آخری حصے میں قتل کا حکم دیا، اور جمعرات کی رات شروع ہونے پر دارا شکوہ کو قتل کردیا گیا۔ صرف دو کتابوں میں اس سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ پہلی کتاب تاریخ محمدی ہے اس میں سن ۱۰۶۹ھ کے تحت یہ لکھا ہے کہ ۲۲ ذی الحجہ، شب پنجشنبہ کو یہ واقعہ پیش آیا۔ سیر المتاخرین نے آخر روز چہار شنبہ کو وقت قتل قرار دیا ہے۔ لیکن اس اختلاف سے کہیں زیادہ حیرت انگیز منتخب اللباب (تصنیف خافی خاں، مطبوعہ ۱۸۶۹ء۔ کالج پریس، کلکتہ، صفحہ ۸۰) کا یہ بیان ہے کہ ماہ ذی الحجہ کے وسط میں (یعنی ۱۴، ۱۵، ۱۶) کی تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ کو) دارا شکوہ گرفتار ہو کر دہلی آیا۔ حکم شاہی تھا کہ اسے اور سلیمان شکوہ کو کھلے ہودے میں بٹھا کر تشہیر کناں خضر آباد لیجائیں۔ اوباش شہر نے یہ دیکھ کر محافظ دستہ پر گندگی اچھالی۔ دوسرے دن بادشاہ کے حکم سے اس سرکش گروہ کا سرغنہ ہیبت خاں نامی کو قتل کردیا گیا۔ اور اس کے دوسرے دن کہ ذی الحجہ کا آخر تھا۔ دارا شکوہ بھی الحاد و بیدینی کے جرم میں مقتول ہو گیا۔

زمانہ کی یہ شادی بھی یادگار زمانہ ہوئی جس میں بقول سید غلام علی خاں نقوی چھیالیس

غالباً منتخب اللباب کے اسی بیان کے پیش نظر مفتاح التواریخ (تصنیف مسٹر تھامس ولیم بیل مطبع نول کشور۔ کانپور ۱۸۶۷ھ) صفحہ ۲۶۰ پر لکھا ہے کہ بعض مورخین محرم کی چاند رات کو دارا شکوہ کا واقعہ قتل بتاتے ہیں۔

مولانا امتیاز علیخاں عرشی مرحوم نے تشریحات وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۹۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سیر المتاخرین کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ "آخر روز چہار شنبہ" اور "اوائل شب پنجشنبہ" کے معنی ایک ہی ہو سکتے ہیں۔ یہی اتحاد معنی کا پہلو وجہ التباس ہو گیا ہے۔ تاریخ محمدی کی ۲۲ ذی الحجہ بقید شب پنجشنبہ کا یہ مطلب ہے کہ مغرب کے وقت سے ہجری تاریخ کا آغاز ہوا ہے۔ چونکہ جمعرات کی رات کے ابتدائی حصہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس لئے اس نے ۲۲ تاریخ لے لی۔ اور جن مورخوں نے ۲۱ تاریخ لکھی ہے انھوں نے اپنے ذہن میں بدھ کا دن ہے۔

دارا شکوہ صوفی منش شاہزادہ تھا۔ ابتدا میں سلسلہ قادریہ میں مُلّا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت ہوا تھا۔ سکینۃ الاولیاء اور مجمع البحرین اسی ذوق کے تحت اس نے تالیف کی تھیں۔ بعد میں ہندو تصوف کا دلدادہ ہو کر قیود مذہب سے آزاد ہو گیا۔ درباری امراء اور عالم مذہبی رعایا اسی باعث اس سے بدظن تھی۔

دارا شکوہ شاعر بھی تھا۔ قادری تخلص کرتا تھا۔ مختلف مجموعوں اور تذکروں میں اسکے اشعار اور رباعیاں ملتی ہیں۔ مولانا عرشی مرحوم نے اس کے مکمل دیوان کا نسخہ مسٹر ظفر الحسن صاحب ایم۔ اے۔ سابق سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ ہند کے پاس دیکھا تھا۔

لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ عمادالسعادت میں مرقوم ہے کہ:

---

۲۲ (۱) The First Two Nawabs of Oudh

By Dr. Ashirwadi Lall Shrivastav

(۲) نواب شجاع الدولہ کی تاریخ تولد یہ ہے ؎

بدولت خانۂ نواب منصور :: برآمد آفتاب از مطلع نور
۱۱۴۴

(تاریخ اودھ ملخص صفحات ۸۶،۸۳

۲۳۔ موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کے باپ ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان
آئے اور شہر دہلی میں آباد ہوئے، یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں کی تا
میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ پہلے اسحاق خاں خطاب تھا پھر نجم الدولہ ہوا۔ ۲۲ شوال سن ۱۱۶۳
(مطابق ۱۳ ستمبر ۱۷۵۰ء) کو سہاور سے سات میل مشرق اور پٹیالی سے پانچ میل مغرب میں ایک
مقام پر صفدر جنگ کی طرف سے لڑتے ہوئے بنگش افغانوں کی مہم میں کام آئے۔ (خزانۂ عامرہ
از آزاد بلگرامی صفحات ۱۲۲۔۱۲۳، عمادالسعادت صفحہ ۶۹)

۲۴۔ تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۲۲۔

۲۵۔ محمد شاہ بادشاہ ابن خجستہ اختر جہاں شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ، اٹھارہ سال کی عمر
میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (مطابق ۱۸ ستمبر ۱۷۱۹ء بروز جمعہ ـــ مؤلف) کو تخت نشین ہوئے (تغزل
رامپور۔ سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۴۴۔ سفرنامہ آنند رام مخلص حاشیہ نمبر ۳ صفحہ ۱۴۱)
۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا اصل نام 'روشن اختر' تھا۔ وجہاندار شاہ کے لڑکے تھے
سن ۱۱۱۴ ہجری مطابق ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۷۱۹ء (مطابق ۱۱۳۱ھ)

"ــ مختصر ایں است کہ چہل و شش لکھ روپیہ بمصرف در آمدہ بود احدے ایں گونہ طوئے از امیر زادہ یاد نداد و در کتاب ہم مذکورہ نیست ۔ در شاہجہان نامہ می نویسد کہ طوے شاہزادہ عالم عالمیاں محمد دارا شکوہ بہادر کہ عزیز ترین فرزندان حضرت خدیو گو سیہاں ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ غازی بود. بہتر طویہا بودہ است وسی و دو لکھ روپیہ دراں بمصرف در آمد بود۔ ہر گاہ حال طوے شاہزادہا چنیں باشد امیر زادہا در چہ حساب اند ؟ دو امیر زادہا شادی نواب شجاع الدولہ لائقِ ذکر است ــ"[۲۶]

بہو کو سسرال سے "بہو بیگم" کا خطاب عطا ہوا[۲۷]

سرہند کی فتح

۱۷۴۸ء کے آخری ایام میں جب احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تو محمد شاہ بادشاہ نے ولیعہد، شہزادہ احمد کو اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم

نشین ہوئے۔ قمری سال سے تیس سال اور چھ مہینے حکومت کیا۔ سرہند میں احمد شاہ کی لڑائی کے بعد ۱۷۴۸ء (مطابق ۱۱۶۱ ہجری) میں وفات پائی۔

۲۶۔ Beal. OP. cit Page 19 و ـ تاریخ آصفی (مترجمہ ڈاکٹر ثروت علی) صفحہ

۲۷۔ عماد السعادت صفحہ ۳۶

۲۔ تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۲۳

دہلی وغیرہ کے ہمراہ نواب ابو المنصور صفدر جنگ کو بھی مقابلہ کیلئے بھیجا تھا
اس جنگ میں نواب صفدر جنگ کی بائیں آنکھ میں دشمن کا ایک تیر لگا جس سے
انکی ایک آنکھ جاتی رہی۔[29] نواب قمرالدین خاں اعتماد الدولہ، وزیراعظم دہلی
جنگ میں کام آئے۔[30] اعتماد الدولہ نواب قمرالدین خاں وزیراعظم کے ہلاک ہو جا
کے بعد شاہی فوج میں بد دلی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن نواب صفدر جنگ
بر وقت تدبیر اور کوشش سے شاہی فوج ظفریاب ہوئی۔ "فتح خداساز" (۱۱۶۱ھ) اس
جنگ کی فتحیابی کی تاریخ ہے۔

صوبہ دار سے نواب وزیر

اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد نواب ابو المنصور صفدر جنگ د
واپس ہو رہے تھے، انھیں پانی پت ہی میں اطلاع ملی کہ محمد شاہ بادشاہ دہل
۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۷۴۸ء بروز دوشنبہ انتقال ہو گ

۲۸۔ دہلی کی شاہی فوج کا مقابلہ سرہند (پنجاب) میں احمد شاہ ابدالی کی فوج سے
تھا۔ یہ جنگ چودہ دنوں (۱۵ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ یوم جمعہ لغایۃ ۲۸ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ یو
مطابق ۴ مارچ ۱۷۴۸ء لغایۃ ۱۷ مارچ ۱۷۴۸ء) تک مسلسل ہوتی رہی۔ مولف۔
لغایۃ ۱۷ مارچ ۴۸ء بروز پنجشنبہ۔ مولف تک مسلسل ہوتی تھی۔ مولف
۲۹۔ بیگمات اودھ صفحہ ۲۳

۳۰۔ نواب قمرالدین خاں وزیراعظم دہلی کا انتقال ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء مطابق ۱۱ ربی
۱۱۶۱ھ بروز جمعہ، جب وہ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے، نماز کی حالت ہی میں توپ
لگنے سے مصلے پر ہی ہوا تھا۔ (مقدمہ تاریخ دلپذیر صفحہ ۱)

۳۱۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا مصرع تاریخ وفات "افسوس رفت از جہاں محمد شاہ" ہے
۱۱۶۱ھ

چنانچہ پانی پت ہی میں ۱۸ر اپریل ۱۷۴۸ء مطابق یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ ہجری بروز دوشنبہ، ولیعہد شہزادہ احمد نے[21] مجاہد الدین احمد شاہ بہادر غازی" کا لقب اختیار کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر صفدر جنگ نے ایک معمولی ٹوکرے پر زر دوزی کپڑا منڈھ کر اس پر موتیوں کی جھالر ٹانکی اور بطور چتر شاہی، احمد شاہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے بلند کر کے تخت نشینی کی مبارکباد دی۔ احمد شاہ نے موتیوں کا ایک ہار اپنے گلے سے اتار کر اُن (صفدر جنگ) کے زیب گلو کرتے ہوئے فرمایا۔" مجھکو تخت نشینی اور آپ کو وزارت مبارک ہو۔"[22] چونکہ اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم دہلی کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے نواب صفدر جنگ انکی جگہ پر بحیثیت وزیر اعظم کام کرتے رہے۔[23] اور بتاریخ ۱۹ر جون ۱۷۴۸ء مطابق ۴ر رجب المرجب ۱۱۶۱ھ بروز اتوار احمد شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ کی وزارت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اور ۱۶ر جولائی ۱۷۴۸ء مطابق یکم شعبان المکرم ۱۱۶۱ھ ہجری یوم شنبہ (سنیچر) کو ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کو شجاع الدولہ کا خطاب مرحمت فرمایا

۲۲۔ بیگمات اودھ صفحہ ۲۶ (۲۳) بیگمات اودھ در بیان نواب صدر جہاں بیگم؛

۲۴۔ تاریخ بیگمات اودھ آفتاب اودھ از مرزا محمد تقی۔

۲۵۔ وقائع دلپذیر نے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ صفدر جنگ کے پشت پایں سرطانی مادہ کا پھوڑا نکل آیا تھا۔ جو جلد ہی اتنا بڑھ گیا کہ لاعلاج ہو گیا اور مہلک ثابت ہوا (صفحہ ۶۸)

مصرعہ تاریخ وفات صفدر جنگ یہ ہے:۔

"بادا مقیم بہشت بریں"

۸ + ۱۹۰ + ۷۰۰ + ۲۶۲ = ۱۱۶۷ھ

اس طرح اب نواب صفدر جنگ کی صوبیداری کی پگڑی میں وزارت کی کلغی بھی لگ گئی اور وہ صوبیدار سے "نواب وزیر" مشہور ہو گئے۔[۲]

نواب صفدر جنگ کی موت

مرزا منصور علی خاں (نواب ابو المنصور صفدر جنگ) نے ایک زہریلے پھوڑے کے اثر سے ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء مطابق ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ بروز سنیچر بمقام سلطانپور میں انتقال ہو گیا۔[۳۵] نواب بیگم (زوجہ صفدر جنگ) صاحبہ جو ہمراہ تھیں، موصوف کی موت کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ مبادا عالم غربت میں کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ دوسرے دن یعنی اتوار کی صبح کو نعش ہاتھی کی عماری میں رکھ کر سوار ہوئیں اور اسی روز شام کو فیض آباد پہنچ گئیں۔ جب محلسرا میں پہنچیں تو موت کا راز ظاہر کیا۔[۳۶] دوسرے دن یعنی ۷ اکتوبر ۱۷۵۴ء دوشنبہ کو شاہی اعزاز و احترام کے ساتھ جنازہ اٹھایا گیا۔ نعش "گلاب باڑی" میں دفن کی گئی۔ پھر دہلی بھیجکر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الٰہی (رحمۃ اللہ علیہ) سے تھوڑے فاصلہ پر سپرد خاک کی گئی، جس پر ان کے فرزند ارجمند نواب شجاع الدولہ نے سید محمد ابراہیم عرف بلال محمد خاں کی نگرانی میں تیس لاکھ روپے کی لاگت سے ایک عالی شان سنگی مقبرہ تعمیر کرایا۔[۳۶] یہ مقبرہ آج بھی مغل آرٹ کا ایک بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔[۳۶]

خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی نے لکھا ہے کہ نواب صفدر جنگ کا انتقال بابر گھاٹ نظامت سلطانپور میں ہوا۔ (نیرنگ خیال۔ لاہور، عید نمبر ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۲۶)

۳۶۔ بیگمات اودھ صفحہ ۲۷

مصلحت وقت کی مجبوری

گذرا ہے گراں کس لئے احباب پہ جانے :: اک حرفِ شکایت جو زباں تک نہیں آیا

نواب صفدر جنگؒ کا ابتدائی عہدِ حکومت نہایت پُر آشوب تھا۔ ملک میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے اثرات اور سلطنت دہلی کی کسمپرسی کے حالات، قلعہ معلیٰ کے اندر کی سازشوں نے تشویشناک شکل اختیار کر لی تھی ہر طرف امن و امان کا فقدان تھا۔ خود نواب صفدر جنگ کے علاقوں میں بھی بدامنی اور جاگیرداروں کی سرکشی کے آثار واضح اور نمایاں تھے سلطنت سلطنت اودھ میں جس قدر کثیر اور معتبر فوج کی ضرورت تھی ابھی انکے پاس نہیں تھی سلطنت کے سیاسی حالات اس بات کے مقتضی نہ تھے کہ سعادت خاں برہان الملک کے عہد کئے ہوئے مدارس پاٹھ شالاؤں اور منادر کے وظائف اور انکی جاگیروں کو واگذار کرکے معتبر اور اونچے طبقہ کے لوگوں کو محنت و مشقت اور جفاکشی و بردباری کی اعلیٰ ترین انسانی صفات سے محروم کر کے دوبارہ مفت خوری اور پر تکلف عیش و آرام کی عیاشانہ زندگی بسر کرنے کی راہیں کھول دی جائیں۔ چنانچہ یہ دروازے بدستور سابق بند رکھے۔ مآثر الکرام میں تحریر ہے کہ:

۲۷۔ عماد السعادت صفحہ ۶۸۔ یہ مقبرہ دہلی میں ہوائی اڈہ کے آگے لبِ سڑک واقع ہے۔ بشیر الدین احمد نے واقعات دار الحکومت دہلی (طبع دہلی ۱۹۲۳ء) میں مقبرہ صفدر جنگ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ یہ تین لاکھ روپئے کے صرف سے تعمیر کرایا گیا تھا — مولف۔ (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے واقعات دار الحکومت دہلی، ۳، ۲۰۔

۳۔ تاریخ بیگمات اودھ "در بیان نواب صدر جہان بیگم"۔

"— بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ ابوالمنصو خاں صفدر جنگ رسید و وظائف و اقطعات بدستور ضبط ماند[۳۹]

(صفحہ ۲۲۲)

اور اس طرح نواب صفدر جنگ نے اودھ کی نوزائیدہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجنے سے بچالیا۔

نواب شجاع الدولہ کے علاوہ صدر جہاں بیگم (نواب بیگم) صاحبہ کے اولاد نہ تھی البتہ حسن علی خاں کی ایک لڑکی جو بی بی عاشورن کے بطن سے تھی کو انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا؛ جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کی شادی مرزا محمد نصیر کے ساتھ کر دی تھی۔[۴۰]

ناگفتہ بہ

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کے انتقال کے بعد، نواب بیگم صاحبہ کے اکلوتے بیٹے مرزا جلال الدین حید المخاطب بہ نواب شجاع الدولہ مسندِ ریاست پر متمکن ہوئے۔ مسند نشینی کے چند ہی دنوں بعد شجاع الدولہ کی شیطانی فطرت نے انوپ گیر اور امراؤ گیر دو گوسائیوں[۴۱] کی معرفت اجودھیا کے ایک کھتری کے مکان پر رات

۳۹۔ بادشاہ بیگم اودھ

۴۰۔ بیگمات اودھ در بیان "نواب صدر جہاں بیگم"

۴۱۔ انوپ گیر گوسائیں (جس کا خطاب راجہ ہمت بہادر انوپ گیر گوشائیں تھا۔ بڑ اور اس کا بھائی امراؤ گیر گوسائیں جو عمر میں انوپ گیر گوسائیں سے بڑا تھا۔ یہ دونوں بید التشی بر

(ا)ریکی میں شب خون مارا اور اس کی اٹھارہ سالہ پری جمال کو اٹھا منگوایا۔ اپنی آتشِ
(ہ)وس بجھا کر کرن پھوٹنے سے قبل ہی پھر اس کے مکان پر بھجوا دیا۔[42] اس واقعہ سے

(بر)ہمن بارہ ہزار کھتریوں نے رام نرائن دیوان کیساتھ مرزا پار عبداسمٰعیل بیگ خاں کابلی کے پاس شکایت
(کر)گئے[43] اور زبردست شورش پیدا کی اور امکان تھا کہ یہ شورش جنگل کی آگ کیطرح پھیل کر قرب و نواح
(کو) بھی اپنے دامن میں لپیٹ لیگی۔ اور دارالحکومت کا امن و امان آگ و خون کی ہولی کھیل کر تباہ

تھے۔ اسکی بیوہ ماں نے بہت ہی کم عمری میں قحط کے مصائب سے پریشان ہوکر ان دونوں
لڑکوں کو راجندر گیر ناگا گوشائیں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جو نواب وزیر (صفدر جنگ) نے نہیں
(م)یں تھا۔ راجندر گیر گوشائیں نے ان دونوں لڑکوں کی پرورش کی۔ اسکی موت کے بعد ان لڑکوں
(ا)مراؤ گیر (انوپ گیر) کو اسکی ناگا فوج کے انتظام پر مقرر کیا گیا۔ ۱۷۶۰ء میں راجہ ہمت بہادر انوپ گیر گوشائیں
نے نواب شجاع الدولہ کے حکم پر راجہ بندیلی سے جنگ کی تھی۔ اور بکسر کی مشہور جنگ میں بھی
(و)ہ اپنے آقا نواب شجاع الدولہ کیطرف سے لڑا تھا۔ (C.P.C. Vol. III P. 61) اور (U.N. Sircar
Fall of Moghal Empire Vol. II) یہ دونوں گوشائیں تقریباً بیس ہزار سوار و پیدے اپنے
(ا)سار میں رکھتے تھے اور دوآبہ کے علاقہ میں کوڑا سے انوپ شہر تک انکی عملداری تھی (تاریخ اودھ صفحہ
صفحہ ۱۳)۔ یہ دونوں گوشائیں (امراؤ گیر و انوپ گیر) اندر گیر گوشائیں کے چیلے تھے۔ جس نے نواب احمد خاں
بنگش اور اعتماد الملک کی لڑائی میں نواب صفدر جنگ کی بڑی محنت اور جانفشانی سے خدمت کی تھی۔
(ترجمہ تفضیح الغافلین صفحہ ۳۰)

۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) کے شروع میں دونوں گوشائیں معزول کر دیئے گئے اور دوآبہ کے علاقہ پر زین العابدین
کا تقرر ہوا۔ (ترجمہ تفضیح الغافلین صفحہ ۲۳)

۴۲۔ تفصیل کیلئے دیکھئے تاریخ بیگمات اودھ صفحات ۱۲ و ۱۳۔ اور عماد السعادت صفحات ۶۶ و ۶۷

و برباد ہو جائیگا۔ لیکن نواب بیگم صاحبہ کی دور بینی و دور اندیشی اور حسن تد
سے یہ آگ شعلہ دے اٹھنے سے پہلے ہی فرو ہو گئی۴۴۔

نواب شجاع الدولہ نے ہر چند لاابالی اور مضطرب طبیعت پائی تھی لیکن
اپنے صوبہ کے انتظامی امور سے غفلت نہ برتتے تھے۔ ان کے عہد میں بہت
ہندو عہدیدار اور اچھی جگہوں پر ملازم تھے اور نواب کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ ان کے
عہد حکومت میں عموماً اچھے خاندان کے لوگوں کو انتظامی معاملات میں ترجیح دی جا
تھی۔ (تاریخ آصفی صفحہ ۱۸)

قبیح افعال کے پیشرو

یہ ایک حقیقت ہے کہ نواب شجاع الدولہ لہو ولعب و دیگر افعال مذموم
کے ارتکاب میں بیباک تھے۔ یہ اپنے خاندان کے پہلے شخص تھے جنھوں نے اخلاق
گراوٹوں سے نہایت قبیح مثالیں چھوڑی ہیں، جو ان کے اکثر و بیشتر جانشینوں
نے اختیار کیں۴۵۔ نواب شجاع الدولہ اپنے خاندان میں دوسرے وزیر الممالک ہوئے

۴۴۔ اسماعیل بیگ خاں ایرانی نژاد تھا۔ خود کابل میں پیدا ہوا تھا اس لئے اسماعیل خاں
کابلی کہلاتا تھا۔ صفدر جنگ اس کی حسن تدبیر کی وجہ سے اس پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ تمام
حاشیہ نشینوں پر چھایا ہوا تھا۔ صفدر جنگ کے انتقال کے بعد اسماعیل خاں کابلی امور
ریاست پر حاوی ہوگیا۔ جب کھتریوں کا مجمع رام نرائن دیوان کے ساتھ اس کے پاس
پہنچا تو اس نے مغل سرداروں کو جمع کر کے حکم دیا کہ راجہ ہمت بہادر کو نواب سے مانگو اور
اس کی نالائقی کی سزا دو ورنہ ہم محمد قلی خاں (برادر عم زاد شجاع الدولہ) کو الہ آباد سے بلا کر صفدر جنگ

ث اہ عالم بادشاہ نے انھیں "وزیر الممالک" کا منصب عطا فرمایا تھا۔ یہ

بلکہ پر اودھ کا حاکم بنا دیں گے۔ یہ اقدام شجاع الدولہ کو سخت ناگوار گذرا اور

رہ کیلیے ان کے دل میں اسماعیل خاں کابلی کیطرف سے دشمنی پیدا ہوگئی۔ نواب شجاع الدولہ

والدہ (نواب بیگم) صاحبہ نے رام نرائن دیوان اور اسمٰعیل خاں کابلی دونوں کو سمجھا بجھا کر رام

لیا مگر اسماعیل خاں کابلی کا اثر و رسوخ دربار سے اٹھ گیا۔

اسمٰعیل خاں کابلی کا انتقال، محرم ١١٦٩ھ (مطابق ١٣ اکتوبر ٥٥ء، ١٧ بروز دوشنبہ

— مولف) ہوا۔

٤٤ ۔ بیگمات اودھ صفحہ ٢٨ و عماد السعادت صفحہ ٨١

٤٥ ۔ نواب شجاع الدولہ صرف عورتوں ہی سے زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک

وق اور مشہور زمانہ امرد پرست بھی تھے۔ بہت سے نازک اندام و گلفام اور خواجہ سرا آپکے

ت میں رہتے تھے۔ راجہ ہمت بہادر امراؤ گیر جو حسن و جمال کا پیکر تھا، اس سے بھی مثل یوسف

جہ سرا ابہت زیادہ مانوس تھے۔ تاریخ تیموریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ ہمت بہادر امراؤ گیر جبتک نواب

مرد رہا، آپ کے ساتھ زنانہ اطوار سے رہتا تھا۔ (تاریخ اودھ ملخص صفحہ ١٨٦) صاحب

وال واقعات نے لکھا ہے کہ امراؤ گیر اور انوپ گیر دونوں گرنگا نیں بچپن ہی سے اپنے گرد راجندر گیر

استعمال میں رہتے تھے۔ اور اس فن میں اتنی کامل مہارت حاصل کر لیا تھا کہ ایک بار بھی

شخص ان سے لطف اندوز ہوتا وہ تمام عمر دوبارہ حصولِ لذت کے لئے بےچین رہتا۔

١٧٦٣ء (١١٧٧ھ) میں امراؤ گیر نواب شجاع الدولہ کی ایک آشنا طوائف

لے بھاگا تھا۔ لیکن اپنے 'فن' میں یگانۂ روزگار ہونے کی وجہ سے اس نے

اب سے چند "ملاقاتیں" کرنے کے بعد انہیں رام کر لیا اور اپنا تمام قصور معاف

الیا (ایضاً صفحہ ٢٣٤)

اولو العزم اور سیر چشم بھی تھے۔ اِن انسانی صفات کے باوجود بد عہدی، ظلم وتعدی اور بے رحمی وقساوت بھی ان میں بدرجۂ اتم تھی[۴۶]۔

شجاع الدولہ کی بد عہدی و بے رحمی

حافظ رحمت خاں سے جو تعلقات اور دوستی نواب شجاع الدولہ سے تھی، تاریخ کے صفحات گواہ ہیں۔ ان دیرینہ تعلقات کو یکلخت فراموش کر کے روہیلہ افغانوں کے خاندان کے نام ونشان مٹا دینے میں ظلم وستم اور بیرحمی کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا[۴۷]۔ ناظمِ بنگالہ محمد قاسم خان، عالی جاہ، جو مقتدر امیر تھے۔ اپنے تمام زر وجواہر اور قیمتی اشیاء کے ساتھ نواب شجاع الدولہ کے پاس آکر پناہ گیر ہوئے تھے، نواب موصوف نے بکسر کی لڑائی میں شکست اٹھانے کے بعد ان کا سارا زر وجواہر ضبط کر کے انھیں گدائے محتاج کر دیا تھا[۴۸]۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے تاریخ ہندوستان میں لکھا ہے کہ عالیجاہ کے مال کی ضبطی میں وزیر نے ذرا بھی مروت اور انسانیت نہیں برتا۔

یہ وہ ناقابل تردید حقائق ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی تاویل سے ان کی اہمیت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

---

۴۶ - بادشاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۰۔

۴۷ - بادشاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۱

۴۸ - گل رعنا صفحات ۲۵۵ و ۲۵۴۔

...ب مفخر زادِ راہ

نواب شجاع الدولہ کی بد عہدیوں، قساوت کے کارناموں اور بے راہ روی
...اقعات و ناعاقبت اندیش بے اعتدالیوں کے ضخیم دفتر میں[۴۹] صرف ان کی ماں
...بیگم" صاحبہ کے پاسِ ادب اور لحاظ کا ایک ایسا مفخر اور مقدس زادِ راہ
...جود ہے جو نواب موصوف کی تمام غلط کاریوں، بے راہ روی اور افراط و
...کے واقعات و حادثات پر پوری طرح حاوی ہے۔ مولوی فیض بخش
...ی نے نواب شجاع الدولہ کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"۔۔۔ عالم آخرت میں اگر نواب شجاع الدولہ کی نجات ہوگی تو
صرف اسی سعادتمندی کے طفیل ہو گی۔"

...ع الدولہ کی بیماری اور موت

جن دنوں نواب شجاع الدولہ، فیض آباد میں ایک عمارت لب دریا تعمیر
...ہے تھے[۵۰] انھیں دنوں ان کا پروانۂ اجل آپہنچا۔ انکی ران کی جڑ میں ایک
...ی نمودار ہوئی جو بڑھ کر ایک بڑے دنبل کی شکل اختیار کر گئی۔[۵۱] علاج معالجے
...ئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ ایک ماہ تک شدید تکلیف اٹھانے کے بعد ۲۹ر جنوری

۴۹۔ صاحبِ قیصر التواریخ نے لکھا ہے کہ "بہو بیگم" صاحبہ کے علاوہ نواب موصوف
...یں ہزاروں عورتیں تھیں جو "خورد محل" اور "خورد محل" میں رہتی تھیں لیکن مولف تاریخ اودھ
...ی عورتوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تبلایا ہے ۔۔۔ مولف

۱۷۷۵ء (مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ) بروز پنجشنبہ بعمر چوالیس سال دو
بوقت ۲ بجے شب اس عالمِ فانی سے رخصت فرمایا اور "گلاب باڑی" میں
خواصپورہ کے مہوشانِ لالہ رخان کے قرب میں سپرد خاک کئے گئے۔[50]
تاریخ رحلت یہ ہے:

شجاع الدولہ وفات یافت

نواب شجاع الدولہ کی بے وقت جواں مرگ موت کے بارے میں سید
غلام حسین طباطبائی کے تاثرات یہ ہیں:-

"_ دو سہ کار کہاں زشتے از او سرزد کہ ایزد تعالیٰ در انتقام
بماں عملہا اورا بادل پُر از حسرت در عینِ جوانی در زمان برخوردن
از دولت و کامرانی محروم و مایوسی ساختہ بدارِ آخرت با ہزاراں
افسوس رہگرا گردانید _"

جلد ۳ صفحہ ۹۴

---

۵۰ ۔ "خور محل" کے علاقہ کے اردگرد مزید نئی عمارتیں تعمیر کروا رہے تھے کیونکہ ہزاروں
عورتوں کا یہ "قید خانہ" 'خور محل' اب قیدیوں کے روز افزوں اضافہ کی بناپر رہائش
کے لئے قطعی ناکافی ثابت ہو رہا تھا اور مزید قیدی عورتوں کے رکھنے کی ان میں گنجائش
نہیں تھی ــــ مولف ۔

۵۱ ۔ بعض مورخین نے سرطانی پھوڑا بتلایا ہے لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ
آتشکی مادہ کا کوئی بدترین قسم کا زخم تھا ۔ جس کا زہر چند ہی دنوں میں جسم میں پھیل گیا
تھا ۔ واللہ اعلم بالصواب ــــ مولف ۔

شجاع الدولہ کے متوقع جانشین

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے وقت ان کے تین بیٹے بالغ اور عوام

۵۲۔ تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۲۸

نواب شجاع الدولہ نے بقول عماد السعادت (صفحہ ۱۱۹) ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ کی
دو گھڑی رات گذرے انتقال کیا۔ اور ۲۴ کے دن دفن کیا گیا۔ یعنی انتقال ۲۳ اور ۲۴ کے
درمیانی شب میں ہوا۔ اور تجہیز و تکفین ۲۴ کو دن میں عمل میں آئی۔ تاریخ محمدی میں شب جمعہ
پانچ گھڑی رات گئے ۲۴ تاریخ کو انتقال کیا' لکھا ہے۔

تاریخ فرخ آباد (صفحہ ۸۵ الف)، مفتاح التواریخ (مطبوعہ نول کشور، کانپور ۱۲۸۴ھ
صفحہ ۳۵۴) اور اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری (لندن مطبوعہ ۱۸۹۴ء صفحہ ۳۸۲) میں مسٹر
ٹامس ولیم بیل میں بھی ۲۴ ذی قعدہ مندرج ہے۔ لیکن تنقیح الاخبار (تصنیف رائے منو لال
صفی بریلوی) میں تاریخ انتقال ۲۲ ذیقعدہ بتائی ہے۔ یہ رائے غالباً عماد السعادت کے بیان
کو سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ قمری حساب میں بعد مغرب نئی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔

مراۃ الاحوال' میں ۲۲ ذی قعدہ کی وفات لکھی ہے جو بالیقین کتابت کی غلطی ہے۔

'جام جہان نما' میں ۲۵ ذیقعدہ کی تصریح کی گئی ہے مگر یہ قول کسی اور مورخ کی تائید سے محروم
ہے۔ (مولانا امتیاز علیخاں عرشی مرحوم۔ تشریحات وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۵۸)

"گلستان رحمت" میں یہ تحریر ہے کہ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے آٹھ مہینے بعد،
(...) ان میں، شجاع الدولہ کا انتقال ہوا۔ چونکہ اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ شب ۱۱ صفر

کی نگاہوں میں قابل اعتبار تھے۔ سب سے بڑے بیٹے مرزا یحییٰ علیخاں عرف مرزا امانی المخاطب بہ نواب آصف الدولہ تھے، جو نواب بیگم کے بطن سے تھے۔ یہ باپ کے زمانہ ہی سے ولیعہدی کے لئے نامزد ہو چکے تھے۔ چہرے کا نقشہ، باپ سے ملتا جلتا تھا لیکن خوش قامت نہ تھے۔ اوپر کا دھڑ نسبتاً بڑا تھا اور نیچے کا دھڑ کمر سے پاؤں تک اس قدر چھوٹا تھا کہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ اس جسمانی خرابی کے ساتھ مزاج میں حد درجہ سفلہ پن تھا۔ ان کی بدفعلیوں، شراب نوشیوں اور سفلہ پن سے اِنکی دادی نواب بیگم صاحبہ سخت نالاں تھیں[۵۳]۔ یہ باپ کی طرح علحدہ دربار کرتے تھے۔ باپ بیٹے کے درمیان ملکی، انتظامی معاملات وانتظامات کے سلسلہ میں خط وکتابت ہوتی رہتی تھی۔ حکومت کا نظم ونسق میر مرتضیٰ خاں طبا طباعی کے سپرد تھا جو آخر میں 'مختار الدولہ' کے لقب سے مشہور ہوئے[۵۴]۔

۱۱۸۸ھ (اپریل ۱۷۷۴ء) کو واقعہ شہادت پیش آیا تھا۔ لہٰذا شجاع الدولہ کا انتقال رمضان (نومبر ۱۷۷۴ء) میں ہونا چاہیئے۔ "گلِ رحمت" میں بھی مذکورہ بیان ہی نظر آتا ہے، لیکن آٹھویں مہینہ کو شوال کا مہینہ بتایا ہے۔ یہ دونوں بیان قابلِ قبول نہیں رہیا۔ عبرت نامہ (تصنیف خیرالدین محمد الہ آبادی) میں بھی آخر ماہ ذیقعدہ ہی لکھا ہے۔ اور مادہ تاریخ " شجاع الدولہ وفات یافت" بتایا ہے جو غلط ہے۔ ایضاً

مولوی محمد فیض بخش کاکوری نے اپنی کتاب فرح بخش میں لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ کی موت کا واقعہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ بروز پنجشنبہ کو جبکہ چار گھڑی رات باقی تھی، ہوا تھا۔ مفتاح التواریخ میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۷۷۵ء بروز پنجشنبہ لکھی ہے۔ اور سیر المتاخرین

بہو بیگم کو اپنے اس اکلوتے بیٹے (آصف الدولہ) سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ نام لینا بھی گوارہ نہ تھا۔ خطوط پر "برخوردار نور چشم" کے الفاظ کے بجائے صرف "آصف الدولہ" لکھواتیں۔[۵۵] بقول مولف تاریخ اودھ:

"ـــــ اس قدر بے حجابی، نامشروع اور خارج از غیرت و حیا کاموں میں اختیار کر لی تھی کہ پواج اور بازاری آدمی بھی مات ہو گئے وہ بھی ایسے کاموں کو سُن سُن کر شرمندہ ہوتے تھے۔"

(جلد ۳ صفحہ ۱۴۱)

مرزا سعادت علی خاں

دوسرے لڑکے مرزا سعادت علی خاں تھے جو باپ کی وفات کے وقت بیس ہزار سوار و پیدل فوج کے ساتھ بریلی میں رہتے تھے۔ جو ابھی چند مہینے پہلے روہیلوں کے مقابلہ میں فتح ہوا تھا۔ اس علاقہ کا ملکی انتظام اور فوجی نظم و نسق ایک حبشی غلام محمد بشیر خاں کے سپرد تھا۔ تفضل حسین خاں صاحبزادہ مرزا سعادت علی خاں کے اتالیق و استاد تھے۔[۵۶]

تاریخ مظفری میں ۲۲ ذی قعدہ نیز تکملہ ذکر ملوک میں ۲۵ ذی قعدہ تاریخ وفات لکھی ہے۔ یکم جنوری ۱۷۷۵ء ...شنبہ کا دن تھا، اس حساب سے اس ماہ جنوری میں ۵-۱۲-۱۹- اور ۲۶ کی تاریخوں میں پنجشنبہ کا دن ...۔ اسی طرح یکم ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو ...شنبہ تھا۔ اس ماہ میں ۳-۱۰-۱۷-۲۴- اور ۳۱- کی تاریخوں پنجشنبہ کا دن تھا۔

۲۲ و ۲۵ ذیقعدہ کو ترتیب وار منگل اور جمعہ کا دن تھا (جمعہ کے دن سپرد خاک کیا گیا تھا)
ـــ مولف

نواب سہامت علی خاں

نواب شجاع الدولہ کے تیسرے بیٹے نواب شہامت علی خاں عرف مرزا جنگلی تھے،[۵۳] جو غیرت و شجاعت اور تحمل کی اعلیٰ خوبیوں سے آراستہ تھے اور بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ اِنکی نیابت کے فرائض محمد ایرج خاں انجام دیتا تھا جو پہلے لشکر کے بازار کا داروغہ تھا اور ترقی کرکے نیابت کے عہدہ تک پہنچا تھا۔[۵۸] دفتری اور حکام سے محاسبہ کا کام صورت سنگھ[۵۹] اور انکا داماد جگناتھ سنگھ انجام دیتا تھا[۶۰]

---

۵۳ ۔ مقدمہ وقائع دلپذیر صفحہ ۷۹

۵۴ ۔ سید مرتضیٰ خاں مختار الدولہ نواب سید مصطفیٰ خاں کا بھتیجا تھا۔ مرحوم نواب شجاع الدولہ کے خاندان سے اس کا دیرینہ تعلق تھا اور ان کے اعزہ میں سے تھا۔ اس نے ہندوستان میں کبھی محمد شاہ بادشاہ دہلی اور کبھی نواب ابو المنصور صفدر جنگ کی ماتحتی میں ملکی خدمات بھی انجام دیا تھا۔ (تفضیح الغافلین اردو صفحہ ۲۶)۔ مختار الدولہ نواب مصطفیٰ خاں نے نواب آصف الدولہ کے تخت نشین ہونے کے بعد سید مرتضیٰ خاں مختار الدولہ کو اپنا نائب مقرر کرکے انتظامی امور اس کو دیدیئے تھے لیکن مختار الدولہ (سید مرتضیٰ خاں) اپنی بدمزاجی کی وجہ سے کافی بدنام ہوا۔ مارچ ۱۷۷۶ء مطابق صفر ۱۱۹۱ ہجری میں قتل کرادیا گیا

(C.P.C. Vol VII Pg. 278)

۵۵ ۔ بادشاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۹

۵۶ ۔ تفضل حسین خاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش بھی لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ کرم اللہ خاں کے پوتے تھے جو لاہور کے صوبیدار معین الملک کی طرف سے بادشاہ دہلی کے دربار میں وکیل تھے۔ تفضل حسین خان اُس طرف کی تباہی کے

صورت سنگھ بڑا دیانتدار اور کاموں کو سمجھنے والا تھا۔ پیدل اور سوار فوج کا انتظام محمد بشیر خاں کے سپرد تھا۔ گویا وہ ایرج خاں کیطرح "دوسرا نائب" تھا کیونکہ بعض احکام اس سے والبستہ تھے اور کچھ کا تعلق ایرج خاں سے تھا لیکن کچھ احکام ایسے بھی تھے جو ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ (تاریخ آصفی صفحہ ۲۸)

نواب شجاع الدولہ کے آخری زمانے میں اودھ تشریف لائے اور یہاں کی سرکار سے والبستہ ہو گئے۔ (تاریخ آصفی صفحات ۲۸ و ۲۷)

۵۷۔ مرزا شہامت علی خاں کا پورا نام عضدالدولہ مبارز الملک مرزا شہامت علیخاں بہادر ظفر جنگ تھا۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال پر ابراہیم بیگ افسر توپ خانہ اور عبدالرحمٰن خان قندھاری کے بھروسہ پر منصب وزارت کی امید باندھ کر "بہو بیگم" صاحبہ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو سند مستحکم ہو جائے، مگر وہ راضی نہ ہوئیں اور انھیں اپنے اس ارادے سے باز رہنا پڑا۔ (تشریحات وقائع عالم شاہی صفحات ۲۰۹، ۲۱۰) مزید ملاحظہ ہو عماد السعادت صفحہ ۱۶۶، نیز تواریخ اودھ صفحہ ۱۳۵، وسلاطین اودھ از سید کمال الدین حیدر صفحہ ۳ نیز کلنڈر آف پرشین کرسپانڈنس جلد ۸، انڈیکس صفحہ ۴۲

۵۸۔ مرزا ابو طالب اصفہانی لندنی نے لکھا ہے کہ نواب ابو المنصور صفدر جنگ مرحوم کے زمانہ سے اس وقت تک سوائے مختار الدولہ (نواب مصطفیٰ خاں) کے کہ بڑے لوگوں میں سے تھا، ہمیشہ معمولی آدمی نواب وزیر کے نائب ہوئے۔ صفحہ ۲۷۔

۵۹ (۶۰) راجہ صورت سنگھ، راجہ مہا نرائن کا اطلاق نویس اور ہم قوم تھا۔ اور بہادر۔ راجہ مہا نرائن کا صراحی بردار تھا۔ ان کے باپ کا نام مہا نرائن رام نرائن تھا۔ وہ اور ان کے بھائی پرتاپ سنگھ، نواب صفدر جنگ کے دیوان تھے جو آتمارام کھتری کے لڑکے تھے

آصف الدولہ کی نسبت اور شادی

الغرض مسند وزارت نواب آصف الدولہ جو نامزد ولیعہد اور نواب بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے، مقدر ہوئی۔ اِن (نواب آصف الدولہ) کی شادی خاندان وزارت دہلی میں ہوئی تھی۔ اس شادی کی نسبت پانے کے متعلق شیخ تصدق حسین صاحب نے لکھا ہے کہ :

جو برہان الملک کے دیوان رہ چکے تھے۔ (تاریخ آصفی صفحات ۲۷، ۲۸)

صورت سنگھ نواب شجاع الدولہ کا بڑا معتمد اور معتبر دیوان تھا جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے اور مختار الدولہ (سید مرتضیٰ علیخاں طباطبائی) کی کمان چڑھی تو صورت سنگھ کو مہاراجہ بہادر کا خطاب اور خلعت دیکر محمد بشیر خاں کی جگہ فوجدار مقرر کیا گیا (عماد السعادت صفحہ ۱۲۲، تاریخ اودھ جلد ۳ صفحہ ۶۶)

ایلیٹ (ELIOT) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں صورت سنگھ اس خدمت سے برطرف کر دیئے گئے کیونکہ تواریخ اودھ میں لکھا ہے کہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں اسکی برطرفی کا باعث ہوا تھا۔ (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۱۴۴)

۶۰۔ عماد السعادت (صفحہ ۱۲۲) اور تواریخ اودھ (جلد ۳ صفحہ ۶۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ مختار الدولہ (سید مرتضیٰ علیخاں طباطبائی — مولف) نے اِسے راجہ کا خطاب دلا کر نواب آصف الدولہ کا دیوان مقرر کرا دیا تھا — مولف

"—جب نواب آصف الدولہ سن شعور کو پہنچے تو والدین کو آرزو ہوئی کہ اپنے نور نظر کا سہرا دیکھ کر دل شاد کریں اور چاند سی بہو بیاہ کر لائیں۔ اس خواہش کے پیش نظر پدرِ نامدار نے خوش نظر علیخاں کو دہلی بھیج کر انتظام الدولہ کے لڑکے نواب امام الدین خاں کو فیض آباد بلوا کر اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنے لختِ جگر کو آپ کے والدین کی فرزندی میں دیکر آپ کی خواہر شمس النسأ کو اپنے گھر کا چراغ بنانا چاہتا ہوں —"

تاریخ بیگمات اودھ کے بموجب، نواب شجاع الدولہ نے علی بیگ خاں اور لطافت علیخاں[1] کو کئی ہزار سوار فوج دیکر نواب قمرالدین خاں مرحوم وزیر اعظم دہلی کی بیگم (شولاپوری بیگم — مولف) کو فیض آباد بلوایا اور بہت تعظیم و تکریم اور نہایت دریادلی کے ساتھ فرائض مہمانداری انجام دیا چنانچہ ۱۸۶۷ء مطابق

---

[1]۔ لطافت علیخاں خواجہ سرا کا خطاب "اعتقاد الدولہ" تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے معتمد سردار تھے۔ یہ نہایت ہوشیار اور سیاسی داؤ پیچ میں ماہر تھے۔

لطافت علیخاں نے لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا تھا کیونکہ "اعتقاد الدولہ" کا خطاب اور خلعت ہاتھی اور گھوڑا، بادشاہ دہلی نے عطا کیا تھا۔ مرات آفتاب نما کے بموجب ان کے پاس دو تین پلٹنیں تھیں۔ (تواریخ اودھ جلد ۳ صفحہ ۱۰ میں تین جگہ پانچ پلٹنوں کا ذکر کیا گیا ہے — مولف) نجف خاں کے بعد اس کے سر میں یہ سودا سمایا کہ دربار میں اعلیٰ منصب حاصل کرکے حکومت کے نظم و نسق میں دخل حاصل کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں جو بپتا اس پر گذری اُسے پریم کشور فراقی نے اپنی کتاب "وقائع عالم شاہی" کے صفحات ۱۳ اور ۱۴،

۱۱۸۱ہجری قدسی میں یہ نسبت قرار پائی اور سن ۱۱۸۳ ہجری مطابق ۱۷۶۹ء میں نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ فیض آباد میں شادی ہوئی۔ اس وقت شاہ عالم، بادشاہ دہلی فیض آباد ہی میں موجود تھے۔ اس شادی میں نواب شجاع الدولہ نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ شیخ تصدق حسین نے شادی کے مصارف کا محتاط تخمینہ چوبیس لاکھ روپیہ تحریر کیا ہے[۶۴]۔ دوسرے مورخین اور وقائع نگاروں کا تخمینہ مصارف بھی تقریباً اتنا ہی ہے۔

اور آئندہ صفحات میں دہرایا ہے۔ (دوسری تاریخیں بھی یہی کچھ بیان کرتی ہیں — مولف)

لطافت علیخاں، اعتقاد الدولہ خواجہ سرا نے ۱۱۹۰ھ (مطابق ۱۷۷۶ء) میں شہر دہلی کے باغ لگایا تھا۔ کسی شاعر نے اس باغ کا قطعہ تاریخ اس طرح کہا ہے:۔

ساخت باغے علی لطافت خاں — ہمچو فردوس زینت آرائی
سال تعمیر او بگفت دلم — گلستانے لطافت افزائی

۵۰ + ۵۲۰ + ۹۹ = ۱۱۹۰ھ

معلوم ہوتا ہے کہ عماد السعادت کی تالیف تک لطافت علی خاں بقید حیات تھا (وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۸۰) — مولف

۶۲۔ بیگمات اودھ صفحہ ۴۲

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ تاریخ اودھ جلد سوم

ل بر دوش بہار

شادی کے وقت مرزا یحیٰ علی خاں عرف مرزا امانی (آصف الدولہ) کی عمر اکیس سال اور شمس النساء کی عمر اٹھارہ سال تھی۔[18] شمس النساء کو سسرال "نواب بہو" یا بقول دیگرے "دلہن بہو" کا خطاب عطا ہوا۔ مگر بد قسمتی شادی میاں بیوی کو راس نہ آئی۔[63] میاں بیوی میں ہمیشہ ان بن رہی سی کا دل ملا اور نہ کوئی اولاد پیدا ہوئی۔[64]

صف الدولہ کی حکمرانی کی ہوس

نواب آصف الدولہ کی حکمرانی کی ہوس اور فوری حصولِ اقتدار کی ہ و بے موقع اور بے محل کوشش کے متعلق تفضیح الغافلین (اردو ترجمہ) آغاز وقائع آصف الدولہ" کے عنوان کے تحت مرزا ابو طالب اصفہانی ے نے لکھا ہے:

۶۵۔ مسٹر کرنل جون کولنس مرہٹوں کی لڑائی کے خاتمہ پر اودھ میں ریذیڈنٹ ہوئے۔ یہ "بادشاہ کولنس" کے نام سے مشہور ہوئے۔ مسٹر میکفرسن نے ان کی بے مہری لمانہ انداز کو برداشت نہ کر سکتے تھے اور ان کے ماتحت کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ولنس کا انتقال ۱۱ر جون ۱۸۰۷ء بروز دوشنبہ لکھنؤ میں ہوا۔

Buckland O.P. Cit Page
صفحہ ۳۵۔

"— لوگوں نے ابھی نواب شجاع الدولہ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں
کی تھی کہ ولیعہد موقع تخت نشینی کی فکر میں پڑ گئے۔ سالار جنگ
مرزا علیخاں و دوسرے عہدیداروں کو جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے
بلا لیا اور حکومت کی مسند پر بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب نے
عرض کی کہ خدا کے فضل سے کوئی دوسرا سلطنت کا دعویدار موجود
نہیں ہے۔ ملازم و اعزا انگریزوں کی وفاداری کا علم رکھنے کے باعث
سب کے سب فرمانبرداری پر آمادہ ہیں۔ اگر اس کام میں جلدی نہ
کی جائے تو بہتر ہوگا۔ انگریز سرداروں میں مسٹر کولنس (John Collins) [65]
اور مسٹر کنو ائی بھی اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے
تاخیر کو بہتر خیال کیا۔ لیکن انہوں (آصف الدولہ) نے قبول نہیں
کیا۔ اور زیادہ اصرار کیا۔ یہاں تک کہ سب کے سب مجبور ہو گئے
اور ان کا حکم مان لیا۔" [٦٦]

اس موقع پر نواب آصف الدولہ نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔
میر مرتضیٰ کو نائب کُل مقرر کیا۔ جھاؤ لال کو جو فیض آباد کے گمنام زادوں میں تھا، م
انتظام اس کے سپرد کر کے محمد بشیر خاں کا قائم مقام بنا دیا۔ چند ملنگے جو نواب کی ار
رہتے تھے، انھیں نہ صرف "راجہ" کے خطابات دیئے بلکہ بہت سے انعامات
نوازا۔ حالانکہ وہ اس کے قطعی مستحق نہ تھے۔ نواب وزیر (آصف الدولہ)
"فیاضی" کا اثر نواب مرحوم کے نمک خواروں اور بہی خواہوں پر کیا ہوا؟ سنئے
"— ان حرکتوں کو دیکھ کر نواب مرحوم کے قدیم ملازمین ناامید ہو کر

اپنے معاملات کی فکر میں پڑ گئے۔ سب سے پہلے محمد امرج خاں بادشاہ دہلی سے حصول سند کا بہانہ کرکے باہر چلا گیا......

..... (صفحہ ۳۵)

تیرگی حکمراں ہوگئی

نواب شجاع الدولہ مرحوم کے محلسرا (حور محل) کے زلزلہ خیز تحریصی ماحول نے اب آصف الدولہ کی شعلہ بداماں جوانی کے کوہِ آتش فشاں کو قبل از وقت ہی شعلہ بداماں کر دیا تھا۔ تمام لاوا جسے ابھی ضبط و اعتدال کی گہرائیوں میں محوِ خواب رہنا چاہئے تھا۔ اپنی پوری شدت و طاقت کے ساتھ ابل پڑا، چند سالوں تک اپنی دسترس کے نزدیک و دُور کے "حلقوں" میں تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد ایک دن اچانک خاموش ہوگیا۔[۴۷]
نظر تک اس کی لائی ہوئی تباہی و بربادی کے عبرتناک مناظر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ طوفان تو سر سے گذر چکا تھا لیکن فضا اب بھی ہیجان آلودہ اور بوجھل تھی۔

۴۷۔ نواب آصف الدولہ نے اپنے پدر بزرگوار، نواب شجاع الدولہ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی پیروی میں اٹھارہ انیس سال کی ہی عمر میں جنسی خواہش و طاقت سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے (بیگمات اودھ صفحہ ۳۸) بادشاہ بیگم اودھ کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ بچپن ہی سے بدوضع خواجہ سراؤں کی صحبت میں بری عادتوں اور بدفعلیوں کے خوگر ہو چکے تھے (صفحہ ۸)۔ نواب موصوف کے اچانک یا چند دنوں کے اندر ہی جنسی طاقت سے محروم ہو جانے کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں لیکن انکا ذکر و تفصیل اس جگہ غیر مناسب ہے اور خارج از موضوع ہے۔ —مولف

طوفان گذر جانے کے بعد

نواب آصف الدولہ کے محلسرا (حور محل) میں تقریباً پانچ سو حسین و ج
عورتیں نیم شگفتہ کلی لڑکیاں جو مختلف ذات و قوم اور فرقوں کی تھیں جمع تھیں۔ ان
بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو محلسرا میں داخل ہونے کے وقت حاملہ تھیں۔[۶۸]

مرزا ابوطالب اصفہانی لندنی نے اپنی کتاب تفضیح الغافلیں (اردو
میں لکھا ہے کہ :-

"— وزیر (نواب آصف الدولہ — مؤلف) کے ملازم ایری
غیری عورتوں کو ان کے وارثوں سے حاصل کر کے محل میں داخل
کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی ہی حاملہ عورت وزیر کی سواری کے
آگے آکر فریاد کرتی ہے کہ فلاں وقت تمہارے ساتھ سوئی تھی۔
میرے ساتھ تم نے وفاداری نہیں کی لیکن اپنے بچہ پر توجہ کرو
جو میرے پیٹ میں ہے۔ وزیر تصدیق کراکر حرم میں داخل کر لیتا
—"

(صفحات ۱۲۳-۱۲۲)

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"— رذیل لوگوں کو جو اس کی صحبت میں رہتے ہیں ہمیشہ
حرم میں داخل ہونے کی اجازت ہے (اور یہی وجہ ہے کہ) ان
بچوں کی بدشکلی اور سیاہ رنگ انکے نسب کی غمازی کرتے ہیں —"

(صفحہ ۱۲۲)

۶۸- مفتاح التواریخ۔ از ڈبلو۔ ٹی۔ بل مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

محلسرا میں داخل جس عورت کو "خدا کی قدرتِ کاملہ" سے بچہ پیدا ہوتا تھا۔[۶۹] ب موصوف (آصف الدولہ) اُس کی پیدائش پر جشن مناتے اور اپنے نطفہ سے ہونے والے بچے کے طور پر پرورش کرتے۔" نواب موصوف کے محلسرا میں دا کی قدرتِ کاملہ" سے پیدا ہونے والے قسم کے بچوں کی "فوج" میں ساٹھ لِ ذکر بچوں کا ایک "دستہ" بھی تھا جن میں وزیر علی خاں سب سے بڑے ڑکے" تھے، جو نواب آصف الدولہ کی موت کے بعد ستمبر ۱۷۹۷ء میں بحیثیت ب اودھ مسند نشین ریاست ہوئے۔" لیکن چار ماہ پانچ دن بعد ۲۱ جنوری

۶۹۔ نواب آصف الدولہ عنفوانِ شباب ہی میں اٹھارہ انیس سال کی عمر میں جنسی قوت محروم ہو کر تولیدی صلاحیت کھو بیٹھے تھے لیکن صاحب اقتدار اور مطلق العنان حکمراں ہونے ی وجہ سے خدا کی "قدرتِ کاملہ" کا بیکراں فضل و کرم شاملِ حال تھا۔ قدرت کے تولید و تناسل سلسلہ منقطع کر دینے کے باوجود "حسبِ معمول" جاری و ساری تھا — مولف۔

۷۰۔ بیگمات اودھ صفحہ ۳۹۔

۷۱۔ نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ ہجری مطابق ۱۷۷۵ء میں مسند نشین ہوئے تھے ہونے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ اور تیئیس ۲۳ سال ستا ماہ قمری، حکومت رنے کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء بروز پنجشنبہ کو وفات ئی اور لکھنؤ کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ (۱) تاریخ آصفی صفحہ ۲۵۔

۷۱۔ نوٹ:- نواب آصف الدولہ، نواب شجاع الدولہ کے بڑے بیٹے اور موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کے نواسہ تھے۔ صاحبزادگی ہی میں شاہ عالم بادشاہ دہلی نے میر آتشی

۱۷۹۸ء مطابق ۳ر شعبان المکرم ۱۲۱۳ ہجری بروز اتوار، گورنر سر جون شور (John Shore) کے حکم سے کمپنی سرکار بہادر نے بر بنا صحیح النسب ہونے کے[۲] انھیں معزول کر کے بنارس بھیج دیا۔[۳]

اور داروغگی غسلخانہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ۲۴ر ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (مطابق ۲۶ر جنوری ۱۷۷۵ء۔ مولف) کو کرنل جون کولنس، میر اعلیٰ اور سالار جنگ وغیرہ کے اہتمام سے نائب اودھ مقرر ہوئے چہار شنبہ، ۲ر صفر ۱۱۸۹ھ (مطابق ۲۹ر اپریل ۱۷۷۵ء۔ مولف) کو شاہ عالم بادشاہ کا بھیجا ہوا خلعت نیابت پہنا اور آبائی خطاب پایا (تنقیح الاخبار ۲، ۵۶، ۱۔ تاریخ اودھ جلد ۲ صفحہ ۱۰۳۔ تشریحات وقائع عالم شاہی صفحات ۱۸۹ ر ۱۹۰)

۲۔ وزیر علیخاں حقیقتاً ایک فراش کے لڑکے تھے۔ ان کے باپ (فراش) نے اپنی جائز بیوی کو روپیہ کے عوض نواب وزیر کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ معاملہ تنہا وزیر علی خاں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ وزیر کی تمام اولادیں اسی طرح کی ہیں (تاریخ آصفی درمیان وقائع ۱۲۰۸ ہجری مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء کلنڈر آف پرشین کرسپانڈنس جلد دسویں صفحہ ۲۳۲ کے بموجب مرزا وزیر علیخاں (نواب وزیر علیخاں) ایک فراش کے لڑکے تھے جنھیں نواب آصف الدولہ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔

ڈاکٹر حامد آفاق قریشی نے اپنے مقالہ "نواب وزیر علیخاں — لائف اینڈ کیریر" (جس پر لکھنؤ یونیورسٹی سے آپ کو ۱۹۸۲ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری ملی ہے۔) میں تحریر فرمایا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے متبنیٰ لڑکے نہیں تھے۔ تحسین علیخاں، جو نواب آصف الدولہ کے ناظر اور انگریزوں کے خاص آدمی تھے، انگریزوں نے انھیں (تحسین علیخاں) کے جھوٹے بیان کا ڈھنڈورا نہ صرف لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان میں پیٹا۔ بد قسمتی سے تحسین علیخاں کا یہی بدلا ہوا بیان گورنر جنرل کمنٹ (COMMENT) مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۷۹۹ء کی زینت بھی بنا۔

بہو بیگم کے بعد

جیساکہ اودھ سے متعلق تواریخ کتب سے ثابت ہے کہ جبتک "بہو بیگم" زندہ رہیں، فیض آباد کو اجڑنے نہیں دیا۔ اسکی شان و شوکت اور چہل پہل سابق حتی الامکان برقرار رکھا لیکن جیسے ہی اِنکی آنکھیں بند ہوئیں، بادِ سموم

ڈاکٹر قریشی نے وزیر علیخاں کو نواب آصف الدولہ کا صلبی بیٹا ثابت کرنے کیلئے اجمالی اشارے پر اکتفا کیا ہے وہ یہ ہے:-

"۔۔۔ آصف الدولہ کے خاص ناظر تحسین علیخاں نے اُن دنوں، جبکہ ان کے تعلقات علی سے خوشگوار تھے، ایک نجی ملاقات میں نفضل حسین (دیکھئے، فٹ نوٹ ۵۳) اور یڈنٹ کو بتلایا تھا کہ وزیر علی کی ماں رحمت حرم سرا میں فراشنی اور آصف الدولہ کی منظور نظر ۔ اس کے حاملہ ہو جانے پر نواب نے اُس کے خاوند ہیٹھ سے بیکر اپنی حرم سرا میں داخل یا تھا۔ اِس سے ایک اولاد ہوئی جو چالیس دن کے بعد فوت ہو گئی۔ اِس کے حرم سرا میں رہتے ے ہی رحمت سے وزیر علی کی پیدائش (۱۹ اپریل ۱۷۸۰ء مطابق ۱۴ ربیع اوّل ۱۱۹۴ھ بروز ۔۔۔ مؤلف) ہوئی۔ (بنگال سیکرٹ کنسلٹیشن مورخہ ۲۴ نومبر ۱۷۹۰ء۔ نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ)

مراۃ الاحوال (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور، ۱۱۹) کے بموجب وزیر علی کی پیدائش کے موقع مروجہ رسم شادمانی کی گئی تھی۔ بنگال سیکرٹ کنسلٹیشن مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۷۹۰ء کے مطابق ان دنوں خبر گورٹ لکھنؤ میں تھے۔ وزیر علی کی پیدائش کے فوراً بعد نواب آصف الدولہ نے

کے جھگڑوں میں شدت پیدا ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا چمن ویران و

ایک خاص دربار کرکے گورٹ کے سامنے، ان کے اپنا صلبی بیٹا ہونے کا اقرار کیا تھا، اور ا
جانشین مقرر کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد تحسین علیخاں اور وزیر علیخاں میں جھگڑا ہوگیا۔ گورنر جنرل سر جان سو
(SIR JOHN SHORE) کے اودھ میں آنے کے بعد اس نے اپنا بیان بدل دیا۔ او
کہ رحمت کو حرم میں کبھی بھی داخل نہیں کیا گیا۔ نواب صاحب کا اس کے دونوں بار حاملہ
سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ کہ اس کے مندرجہ بالا دونوں لڑکوں کو انھوں نے روپیہ دے
اس سے خرید کر اپنے بیٹے ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

ہم ڈاکٹر حامد آفاق قریشی کی "تحقیق" پر نقد و تبصرہ کرنا نہیں چاہیئے لیکن انھوں نے
جس "اجمالی اشارہ" کے ماخذ پر اکتفا کرکے وزیر علیخاں کو نواب آصف الدولہ کا صلبی بیٹا
ثابت کرنے کیلئے، مورخہ ۱۶ اکتوبر ۹۷ء کے "بنگال سیکرٹ کنسلٹیشن" کا جس ناقابلِ تردید
ثبوت کو بنیاد بنا کر، حوالہ دیا ہے، اس کی حقیقی حیثیت، محض ایک خبر کی ہے جو مختلف مو
اور غیر معتبر راویوں کے ذریعہ "یادداشت" کے طور پر قلم بند کی گئی ہے۔ اس حقیقت کی صدا
کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

نواب آصف الدولہ کی محلسرا کے اندر اکثر ہی بچوں کی پیدائش پر جشن اور مروجہ رسم
شادمانی ہوا کرتی تھی۔ ہر بچے کی پیدائش کا "کریڈٹ" نواب وزیر اپنے سر لیتے تھے۔ اگر وزیر علی
خاں کی پیدائش پر نواب وزیر نے جشن و رسم شادمانی کیا اور لوگوں کے سامنے انھیں اپنا
صلبی بیٹا بنا کر، حسب معمول، اپنا "کریڈٹ" مشتہر کیا، تو عہد آصفی کی تاریخ میں کون سا بہت
بڑا اور اہم غیر متوقع واقعہ رونما ہوگیا؟ ایسے واقعات تو محلسرا اور دربار میں آئے دن ہی

۔ نواب آصف الدولہ کے مستقل قیام لکھنؤ سے چوک، خواصپورہ، دتی
زہ بیگم پورہ، انگوری باغ، مغل پورہ، محلہ ظفر الدولہ، نخاس
وغیرہ محلے جو جنت نگاہ تھے، اور جو قطعات رشک فردوس کہلانے کے
زمانہ میں مستحق تھے، وہ ویران اور سنسان نظر آنے لگے۔ وہ حسن و جوانیاں
ندوستان کے گوشہ گوشہ سے کھینچ کر فیض آباد کو رشک فردوس بنانے کیلئے
تھیں، اب وہ لکھنؤ کو منتقل ہو رہی تھیں۔ وہ فیض آباد جس کے ہر گلی کوچے

نے رہتے تھے دربار کے لوگ اور عوام و خواص ان آئے دن ہونے والے واقعات کے
ہو چکے تھے۔ انھیں نواب وزیر کی شخصیت سے متعلق کمزوریوں اور 'کریڈٹ' کے
ات و اشتہارات کی صداقت کا علم تھا۔
تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ مرزا ابوطالب اصفہانی کی شخصیت عہد آصفی میں باوزن و
شخصیتوں میں سے ایک ثقہ شخصیت تھی۔ وہ متبحر عالم دین، معتبر مصنف مورخ اور آصفی
کے قدیم وفادار نمک خوار تھے۔ اپنے ولی نعمت، نواب آصف الدولہ سے قریب تر
نے اور معتمدین میں سے ہونے کی وجہ سے انکی خلوت و جلوت کے حالات اور مجلسراکے
دربار ہر واقع ہونے والا کوئی بھی واقعہ یا حادثہ اُن سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وزیر علی
حسب و نسب اور استقرار حمل سے بعد پیدائش تک کے تمام حالات و واقعات بالتفصیل
علم میں تھے۔ انھوں نے وزیر علیخاں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا اس میں انکی بدنیتی و
یا بغض و عناد کا کوئی مکروہ جذبہ کار فرما نہ تھا۔ بلکہ اُنکی "حق گوئی" خدا و رسول کے
اور اہلبیت اطہار کے اُسوہ حسنہ کی امانت کا وہ عظیم اور مقدس احترامی جذبہ تھا جس نے
ولی نعمت، نواب وزیر کی خفگی اور متوقع ضرور تعزیر کے احتمال سے بے پروا ہوکر، حق و

سے ساز و نغمہ کی مسحور کن آوازیں جادو جگایا کرتی تھیں، خاموش تھے۔ راگ و رنگ کی محفلوں کی دھینگا مستی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ علماؤ فضلاء اور شعراء و اطباء سب لکھنؤ کو منتقل ہو چکے تھے جو کسی وجہ سے ابتک نہ جا سکے تھے وہ اب پر تول رہے تھے۔ اب نہ علم و فن کا یہاں کوئی قدردان رہا نہ سرپرست۔ وہ لوگ جن سے فیض آباد کی رونق و زینت تھی اور جن پر فیض آباد کو فخر و ناز تھا جن کی شخصیتیں نمایاں اور اہم تھیں وہ تمام لوگ اور ان کے متعلقین نے فیض آباد اور اس کے قرب و اطراف سے لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے کا رخ کر لیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کے ابتدائی دنوں سے ہی فیض آباد اجڑنے اور لکھنؤ بسنے لگا تھا"[۴]

صداقت کے اعلان کو ذریعہ نجات سمجھا۔

۱۶ اکتوبر ۱۷۹۰ء کی مشکوک خبر کی تحریری یادداشت، کو ایک وارثِ سلطنت ہونے والی شخصیت کے معاملہ میں بغیر چھان بین کئے ہوئے دستاویزی سند کا رتبہ دیدینا دیانتداری کے خلاف معیار تحقیق کے منافی تھا۔ اس لئے بعد تحقیق اصل حقائق (REAL FACTS) کو ہی ۱۳ جنوری ۱۷۹۰ء کی گورنر جنرل کمنٹ کی زینت بنانا پڑا، اور ۱۶ اکتوبر ۱۷۹۰ء کی تحریر کو کالعدم قرار دیدیا گیا ۔ مؤلف

۳) ۔ بادشاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۸۔

۴) ۔ صاحب احوال و واقعات نے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے فیض آباد چھوڑنے میں دیگر اسباب و وجوہات میں سب سے بڑی اور اہم وجہ انکی بیوی شمس النساء (دلہن بہو) صاحبہ تھیں جن سے آنکھ ملانے اور دو بول بولنے کی اُن میں جرائت نہ تھی۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم نے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ اپنی ماں نواب "بہو بیگم" صاحبہ سے ناراض ہو کر لکھنؤ میں رہنا

مرحوم فیض آباد

آج ماضی کے دریچوں سے ہٹا کر پردے

ایک بھولی سی کہانی مجھے یاد آئی ہے

یہ اس بنگلہ بستی کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے عروج و زوال اور
تداد زمانہ کے نشیب و فراز کی بھولی بسری حقیقت کی ایک دھندلی سی جھلک
ہے جسے کبھی مشرقی تہذیب و تمدن کے گہوارہ ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ جسکی شہرۂ
فاق نفاست و نزاکت صدیوں سے اودھ کی چاشنی بنی رہی۔ جس کی شیریں بیانی
وشِ انسانی کے لئے شہد و گلاب سے کم نہیں رہی۔ جس کے آباد کرنے والے[5] کی
س کے اولین پانچ حکمراں صوبیدار یا نواب اودھ ہوئے۔ جن کے ہاتھوں میں
نوے سال (۱۷۲۰ء لغایۃ ۱۸۱۹ء) تک صوبہ اودھ کی عنانِ حکومت رہی[6]۔
ر بعد کے پانچ شہر یاروں کے سر پر ستائیس برس (۱۸۱۹ء لغایۃ ۱۸۵۶ء)
ج شاہی جگمگاتا رہا۔

روع کر دیا تھا (صفحہ ۲۵۹) لیکن یہ بالکل بے وزن بات ہے اور حقائق سے دانستہ
م پوشی ہے ــــ مولف۔

۵ ، ۔میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک۔ (مولف)

۶ ، ۔ (۱) میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک (۲) منصور علی خاں
۔۔ رجنگ (۳) مرزا جلال الدین حیدر شجاع الدولہ (۴) مرزا یحییٰ علی خاں نواب آصف الدولہ
(۵) نواب سعادت علی خاں۔

زمانہ کے بیدرد ہاتھوں نے فلک کج رفتار کے اشارے پر، اس کو اسطرح تباہ و برباد کیا کہ اب نہ اس کی شان و شوکت کا نشان ملتا ہے اور نہ مشرقی تہذیب و تمدن کی وہ جھلک جسپر ہندوستان کو فخر و ناز تھا

یہ شہر تو وہی ہے پہ وہ لوگ کیا ہوئے
لہجوں کی اک کھنک تھی جو ہر سو رواں، کہاں گئی ؟
لفظوں کا رکھ رکھاؤ، وہ جملوں کا بانکپن
چینِ جبین و جنبشِ ابرو کہاں گئی ؟
شمعِ جمالِ دوست سے خالی ہے انجمن
برقِ نگاہ و نکہتِ گیسو کہاں گئی ؟
دل ڈھونڈھتا ہے اب وہ نگاہیں وہ صورتیں
یوسف بہارِ شامِ لبِ جو کہاں گئی

آہ ـــ اب وہ فیض آباد کہاں ؟ وہ دن گیا، وہ رات گئی، وہ لوگ گئے، وہ بات گئی۔ آج قدیم فیض آباد کا آٹھواں حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ جو کچھ بچ رہا تھا وہ جدید آبادی میں گھل مل گیا ہے۔ آج فیض آباد کی آبادی کا ایک بڑا حصہ 'مرحوم فیض آباد' کی تہذیب و تمدن، اندازِ گفتگو و طرزِ معاشرت پر

---

(۱) - (۱) شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ (۲) نصیر الدین حیدر بادشاہ (۳) محمد علی شاہ بادشاہ (۴) امجد علی شاہ بادشاہ (۵) جان عالم واجد علی شاہ بادشاہ۔

ندہ زن ہے۔ آج ان مذاق اڑانے والوں کے لئے نزاکت ونفاست میں
متیاز آسان نہیں۔ یہ شرافت کو نزاکت کہہ کر مشرقی تہذیب و تمدن کے زخموں
پر نمک پاشی کرتے ہیں۔

معذرت

مشعلیں عزم کی میں لاکھ جلائے رکھوں
میرے ہاتھوں میں مقدر کا ستارہ تو نہیں

ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہماری دلی کیفیات نے ہمارے قلم کو براہ راست
وضوع سے قدرے ہٹا دیا۔ ہم شہر اودھ (اجودھیا) کی مذہبی اہمیت اور تقدس
ں بات کرتے ہوئے "بنگلہ بستی" کے ذکر تک آگئے ــــ اس بستی (فیض آباد)
ے گلی کوچوں میں اڑتے ہوئے گرد و غبار کا جھونکا کسی نہ کسی داستان کا امین ہے
س بستی کے کھنڈرات کتنے تلاطم خیز قہقہوں کے مدفن ہیں؟ ان میں اُگی ہوئی خودرو
ار دار جھاڑیوں پر مسلط سکوت میں کتنی ناگفتہ بہ داستانیں محوِ تکلم ہیں؟

گذرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا؟
اچھا گذر گیا۔ بہت اچھا گذر گیا

یہ تو اُم شہر ہے۔

کچھ بھروسہ نہیں حالاتِ زمانہ کا نسیم
آج ایسے ہیں تو کل دیکھئے کیا ہوتے ہیں

اجودھیا اور فیض آباد توأم شہر (Twin cities) ہیں۔ ان دونوں شہروں کا ایک دوسرے سے اتنا نازک رشتہ اور تعلق ہے کہ اگر ایک شہر کی حیثیت کو کسی بھی پہلو سے نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرے شہر کی حیثیت ایک بیوہ کی جوانی کی طرح قابل رحم ہو جاتی ہے۔ ان شہروں کا ہر ذرہ قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اس سرزمین پر جنھوں نے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کر کے حکومت کیا، علوم و فنوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کیا ایک ملی جلی ہندوستانی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈال کر اسے پروان چڑھایا انکی تعمیرات کے آثار و باقیات، اُن کے ذوق سلیم کے گواہ ہیں اور انکی تہذیب کی ترقی کے آئینہ ہیں جن سے ان کے کردار کی بلندی و پستی، انکے معاشرہ کے عروج و زوال ان کی شاہانہ شان و شوکت، رعب و جلال اور عیش و عشرت کی فراوانیوں کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے اور انحطاط و زوال کے روح فرسا مناظر کے عبرت آموز خد و خال بھی۔

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جنکے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

شہر فیض آباد کے اندر کتنے بزرگانِ دین، اولیاء اللہ، علماء و فضلا اور فقراء و شہدا پیوند زمین ہیں؟ انکی کوئی تفصیل دستاویزی شکل میں دستیاب نہیں ہے اور نہ مستند روایات سے ہی ہمیں کوئی رہنمائی حاصل ہو سکی۔ لیکن ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہے کہ فیض آباد میں خصوصاً نواب شجاع الدولہ کے دور اقتدار اور اسکے بعد کے زمانوں میں فیض آباد کے بگڑے ہوئے معصیت خیز معاشرہ

کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت امر و نہی سے روشناش کرائے اور گمراہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور انھیں اللہ اور اسکے رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واضح احکامات کی تعلیم دینے نیز گناہ وضلالت کے دلدل سے بچانے کے لئے اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے یہاں نہ آئے ہوں!

فی الوقت شہر فیض آباد میں جن بزرگوں کے فیوض وبرکات سے لوگ مستفیض ہوتے ہیں اور عوام وخواص میں جن کا زیادہ چرچا ہے، ہم ان کے ذکر کے ساتھ کچھ ایسے آثار وواقعات کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کے آشناو دانندہ صرف چند ہی لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کے مرنے کے بعد یہ حقائق ان کے ساتھ ہی ان کی قبروں میں دفن ہو جائیں گے۔

شہر فیض آباد کے جن محلوں یا علاقے میں صاحبِ تصرف بزرگوں کی قبریں ہیں اور لوگ جن سے فیوض وبرکات حاصل کرتے ہیں ہم نے اُن کا ذکر اس کتاب کے آخر میں "شہر فیض آباد کی بزرگ شخصیتیں" کے عنوان سے علیحدہ کیا ہے۔

یہ فیض آباد ہے

دنیا نے کب کسی کو کیا یاد عمر بھر   جو بات ہو گئی وہ نہ ہو کے رہ گئی

اب ہم فیض آباد شہر کے موجودہ گھنٹہ گھر کے سامنے آئے ہیں۔ گھنٹہ

---

*۔ زیادہ تر سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات ہی اب سرمایہ ہیں۔ انھیں کے سہارے پر حالات اور متعلقہ واقعات آئندہ صفحات پر ترتیب دیئے گئے ہیں اور جو مدد فیض آباد گزیٹیر سے مل سکی ہے اُسی کو دستاویزی حیثیت دی گئی ہے۔ مؤلف

گھر کے سامنے سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی تعمیر کی ہوئی پرشکوہ مسجد نظر آئے گی۔ اس مسجد کی تعمیر ۱۷۸۶ء مطابق ۱۲۰۲ھ میں شروع ہوئی اور تین سال بعد ۱۷۹۰ء مطابق ۱۲۰۵ ہجری میں مکمل ہوئی۔

نواب حسن رضا خاں شخصیت و تعارف

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم، بانی سلطنت نوابین اودھ میر محمد امین نیشا پوری سعادت خاں برہان الملک کے خسر نواب کلب علی خاں کی بہن کے لڑکے تھے[۷۹]۔ انکے چچا کا نام محمد ابراہیم خاں تھا جو شاہی منصب دار تھے اور لکھنؤ کی کوتوالی اور حرم سرا کی حفاظت اور برہان الملک و نواب ابو المنصور صفدر جنگ کے خزانوں کی نگہداشت کی خدمت انھیں کے سپرد تھی۔ محمد ابراہیم خاں لکھنؤ کے نیک نام اور معزز لوگوں میں سے تھے[۸۰]۔

نواب حسن رضا خان سرفراز الدولہ زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔ ملکی معاملہ شناسی اور سیاسی داؤں پیچ انھیں نہیں آتا تھا۔ البتہ فن سپہ گری اور اس کے ہنر اچھی طرح جانتے تھے۔ سپاہیوں کے گروہ میں وہ اپنی رائے کی متانت اور وقار رکھتے تھے۔ ان کی بیوقوفی اور فضول خرچی کی بدنامی کی جو داستانیں لوگوں میں مشہور رہیں اس کی اصل وجہ ان کا "سیدھاپن" اور "مذہبیت" ہے[۸۱]۔

۷۹۔ تاریخ آصفی صفحہ ۲۹

۸۰۔ ایضاً صفحہ ۳۰

۸۱۔ تاریخ آصفی صفحہ ۳۰

مرزا ابوطالب اصفہانی[۸۲] نے تفضیح الغافلین میں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا
خاں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ماموں نواب کلب علی خاں اور
چچا محمد ابراہیم خاں کی عزیزداری پر گھمنڈ نہیں کیا اور نہ کبھی پیش نظر رکھا۔ یہ ہمیشہ ایک
دربان کی طرح نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں رہتے تھے۔ اپنی بے لوث

۸۲۔ مرزا ابوطالب اصفہانی ۱۷۵۲ء مطابق ۱۱۶۶ ہجری میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے
وہ بیک وقت ایک نامور سیاح، تاریخ داں، منتظم اور جید عالم تھے۔ ان کا اصفہان کے ایک
عزت ترک خاندان سے تعلق تھا۔ نادر شاہ کے حملوں سے تنگ آکر ان کے والد حاجی محمد بیگ
خاں اصفہانی ہندوستان چلے آئے تھے اور نواب صفدر جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ چودہ سال
کی عمر میں ان کی شادی مرشد آباد میں نواب محمد رضا خاں کی ایک عزیزہ سے ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں
جب کپتان ڈیوڈ تھامس رچرڈسن (David Thomas Richardson) کے ساتھ
جب وہ اپنی چھٹیاں گذارنے لندن جارہے تھے، انھیں کیساتھ مرزا ابوطالب لندن گئے اور تقریباً
ایک سال لندن میں رہے (۱۴ مارچ ۱۷۹۹ء مطابق ۷ شوال ۱۲۱۳ ہجری بروز پنجشنبہ
سے ۲۳ مئی ۱۸۰۰ء مطابق ۵ محرم ۱۲۱۵ ہجری یوم پنجشنبہ تک رچرڈسن نے انگلستان
میں اپنی چھٹیاں گذاریں) ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۲۱ ہجری میں مٹونڈھ (ضلع باندہ۔ بندیلکھنڈ)
میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اسی سال تھوڑے ہی عرصہ بعد چوّن[۵۴] سال کی عمر میں انتقال کیا اور
وہیں مدفون ہوئے۔

(۱) List of officers of the Bengal Army By V.C.P. Hodson.

(۲) تاریخ آصفی صفحہ ۱۲

(۳) Hodson, O.P. Cit Page 644-45

خدمات سے نواب مرحوم کے دل میں بڑی جگہ اور نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت
حاصل کر لی تھی اور ان کے (نواب شجاع الدولہ) مقربین میں سے تھے۔ نواب مرحوم
ان کے ساتھ بڑی خصوصیت رکھتے تھے۔ انکی حیثیت گویا نواب مرحوم کی زبان کی
اکثر احکامات انھیں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے تھے۔

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں، مرحوم نواب آصف الدولہ کے گہرے دوستوں
میں سے تھے اور ایرج خاں کے بعد یہی نواب آصف الدولہ کی خلوت و جلوت میں رہتے
تھے۔ ۱۷۷۷ء میں انھیں نواب آصف الدولہ نے بہت سے اختیارات دیکر اپنا
بنالیا تھا۔[۸۴]

مسٹر جون برسٹو ریزیڈنٹ کا مشورہ

مسٹر جون برسٹو (John Bristow)[۸۵] کے درمیان بات چیت

۸۳۔ مقدمہ تاریخ آصفی صفحہ ۲۹

۸۴۔ (۱) کلنڈر آف پرشین کرسپانڈنس جلد ہفتم صفحہ ۴ (۲) تاریخ آصفی صفحہ ۱۱

۸۵۔ مسٹر جون برسٹو (John Bristow) کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم
۱۷۷۴ء میں مسٹر نیتھانیل مڈلٹن (Nathaniel Middleton) کی جگہ پر لکھنؤ میں ریزیڈنٹ
مقرر کیا گیا۔ چونکہ لارڈ وارن ہسٹنگز (Warren Hastings) اس سے خوش نہیں تھا اس
۱۷۸۱ء میں اسے معزول کر کے پھر مسٹر مڈلٹن کا تقرر ہوا لیکن ۱۷۸۲ء میں اس کا دوبارہ
ہوا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۷۸۳ء مطابق ۶ صفر ۱۱۹۸ ہجری (یوم چہار شنبہ) کو اسے کلکتہ بلا

ذریعہ نواب حسن رضا خاں ہوئے تھے۔ چونکہ نواب حسن رضا خاں سیدھے سادے
آدمی تھے۔ انہیں ملکی معاملہ شناسی اور سیاسی داؤ پیچ نہیں آتا تھا اس لئے ۱۷۷۶ء
مطابق ۱۱۹۰ ہجری میں مسٹر جون برسٹو نے نواب آصف الدولہ کو مشورہ دیا کہ
سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کے ملکی اور سیاسی معاملات میں رہنمائی کرنے
کے لئے ایک آدمی جو سیاست اور ملکی معاملہ شناسی میں تجربہ کار ہو ان کے (نواب
حسن رضا خاں کے) ساتھ کر دیا جائے چنانچہ اسماعیل بیگ شوریٰ، جو ایران کے
معمولی لوگوں میں سے تھا اور بد دیانتی و اپنے آقا کی بد خواہی کے لئے اس وقت مشہور
تھا، اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لئے، اس نے مسٹر برسٹو کو کچھ سبز باغ دکھا
کر حیدر بیگ خاں کی سفارش کیا۔ نائب کل کی خلعت حسن رضا خاں کو دلوایا اور
نائب الملک کا عہدہ حیدر بیگ خاں کو عطا ہوا[۸۶]
ٹکیٹ رائے کو حسن رضا خاں کی طرف سے پیش کار اور حساب کتاب کا نگراں مقرر
کیا گیا۔ یہ شخص اپنے مقابلہ میں حیدر بیگ خاں کو حقیر و ذلیل سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ سے
دیوانی کا کام چوپٹ ہو گیا۔

اگر سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں میں کچھ بھی سیاسی سوجھ بوجھ اور
معاملہ فہمی ہوتی تو ان کا تسلط ملک اودھ میں پھیل جاتا لیکن دُور اندیشی اور
معاملات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ الگ تھلگ رہے اور ٹکیٹ رائے کو

کیونکہ لارڈ وارن ہیسٹنگز کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ خود اودھ کا انتظام کرے ـــ (تفضیح الغافلین
اردو صفحہ ۳۸)

۸۶ - تفضیح الغافلین در وقائع ۱۱۹۰ھ ہجری۔

ہمیشہ آگے رکھا۔ اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود نواب حسن رضا
ہی اُس (ٹکیٹ رائے) کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔ اور اُس نے اپنی تنگ ظرفی
کمینگی کی وجہ سے سرفراز الدولہ کی خدمت میں کوتاہی شروع کردی اور ان دونوں
جھگڑا لڑائی شروع ہوگئی۔

جمعہ و جماعت فیض آباد میں

نواب حسن رضا خاں نے اپنے دورِ اقتدار میں اپنی رہائش گاہ[۸۸] کے قریب
موجودہ گھنٹہ گھر کے پاس ایک عالی شان اور پر شکوہ مسجد تعمیر کرایا جو آج بھی نوابین او
کی گذری ہوئی شان و شوکت اور ان کے مذہبی لگاؤ اور انسیت کی یاد دلا رہی ہے
یہی وسط ہند کی وہ دوسری مسجد ہے جس میں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں م
نے، فیض آباد میں شیعوں کا جمعہ و جماعت قائم کیا تھا[۸۹]۔ شیعوں کی پہلی نماز جمعہ و جماعت

۸۰۔ ٹکیٹ رائے نیچ خاندان کے ایک معمولی کسان کا بے لیاقت لڑکا تھا۔ خوش رو نوجوانوں کی
کو بہت پسند کرتا تھا (تاریخ آصفی صفحہ ۱۲۸)۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں انکے جواہر خا
تحویلدار خواجہ سرا خوش نظر خاں کے پاس پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم تھا اور خیانت کے جرم
نواب مرحوم کے پورے عہد میں قید رہا۔ انکی وفات کے بعد آزاد ہوا۔

(۱) Calender of Persian Correspondence Vol. VII Pg 147

(۲) فٹ نوٹ تاریخ آصفی صفحہ ۵۳

۸۸۔ موجودہ "توپ والی کوٹھی"۔

۸۹۔ عماد السعادت میں نواب حسن رضا خاں کے متعلق تحریر ہے:۔ "القصہ حسن رضا خا

ق نزہتہ الخواطر کے مولف، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا حکیم عبد الحئی
م نے لکھا ہے:

"ـــ شاہ علی اکبر چشتی مودودی اور ملا محمد علی فیض آبادی
کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے
سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں
۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ ہجری کو نماز ادا کی۔[۹۰] یہ پہلا دن ہے کہ وسطِ ہند
میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا ـــ"

(گلِ رعنا صفحہ ۱۵۳ و ۱۵۴)

سیر و شکار در رکاب جناب عالی صوم و صلوٰۃ با ہیچ چیز سروکار نداشت و بانی جمعہ و جماعت
ئے عشریاں در لکھنؤ بودہ است۔ در ہیچ شہرے از شہر ہائے ہندوستان
ہ و جماعت در مذہب امامیہ رائج نبود بلکہ کسے را گماں اینہم نبود کہ در ایران و بلادِ عرب
عت در اثنا عشریاں گذاردہ می شود ـــ" (صفحہ ۱۳۷)

۹۰۔ مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کا آبائی مذہب سنت والجماعت تھا۔
ہ وقائع دلپذیر صفحہ ۱۰۲)۔ انہوں نے ابتداءً کتب درسیہ فرنگی محل میں پڑھا
ں جا کر علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور واپس آ کر خود فرنگی محل
کی تصدیق و تقریب سے مجتہد اور شیعہ فرمانروایانِ وقت کے مقتدا قرار پائے۔
تہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۰)

مولوی سید دلدار علی ہی لکھنؤ کے پہلے شیعہ مجتہد ہیں۔ کتاب تذکرۃ العلماء شیعی
لف سید مہدی بن سید نجف رضوی نے بھی مولوی سید دلدار علی کو پہلا

شامِ اودھ مرحوم فیض آبادکی

نواب شجاع الدولہ کے زمانۂ اقتدار کے تیسرے دور سے لیکر نواب آصف الدولہ
کے زمانۂ اقتدار کے ابتدائی دنوں تک مسجد کا یہی علاقہ "مرکزِ شامِ اودھ" رہا
شہر کے شرفاء تیسرے پہر سے روزانہ اس جگہ جمع ہوتے۔ پیروں میں سیاہ
چمکدار جوتے، شوخ رنگ کے ریشمی موزے، پوڑی دار گرنٹ اور مشروع کے
پاجامے جن میں جھالر دار شوخ رنگ کے ریشمی کمر بند، جو کُرتے کے دامن سے قدرے

"ہندوستانی مجتہد" بتایا ہے۔ متذکرہ کتاب میں مرقوم ہے کہ ـــ "آنجناب اول کسے
بودہ اند کہ در بلادِ ہندوستان بمرتبہ اجتہاد رسیدہ و بنائے اقامت نمازِ جمعہ و جماعت
بطریقہ حقہ امامیہ دریں دیار گذاشتہ اندـــ"

مولوی سید محمد مخدوم حسینی مولف توضیح السعادت نے مولوی سید دلدار علی
نصیر آبادی کے متعلق لکھا ہے کہ:ـــ "از نسل جعفر کذاب، در قصبۂ نصیر آباد و در قصبہ جائس
اکثرے حی و تمام موجود اند .... مولوی دلدار علی کہ از قدیم الایام آبائی مذہب اہلسنت
وجماعت داشتند و در حکومت نواب آصف الدولہ بہادر ولیعہد نیابت مرزا حسن رضا
خاں باوجود کم علمی اولاً پیش امام مرزا حسن رضا خاں شدند و بعد چندے دعویٔ اجتہاد
نمودہ مجتہد مذہب امامیہ شدند۔ بعد فوتش بخطاب مجتہد العصر، غفران مآب ملقب شدند
و پسرانِ مولوی دلدار علی، سید مولوی محمد و مولوی میرن رامردمان معتقدین مجتہد العصر
والزماں میگویند و بالفعل خود را 'نائب مہدی آخر الزماں' قرار دادہ اند ـــ"

لٹکتے ہوئے، جامدانی یا چکن کے نفیس انگرکھے جن سے کرتے کی بیلیں جھانکتی
، کندھوں پر معطر رومال جن سے فن کی نزاکت و نفاست کا کمال نمایاں، سر پر

رسالہ "اجازہ" میں مجتہد مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی نے اپنے فرزند اکبر مولوی سید محمد
لکھا تھا اپنے لکھنؤ میں مقیم ہونے کے تمام حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ"۔۔۔
میرے ولی نعمت مرزا حسن رضا خان نے لکھنؤ میں نماز جمعہ و جماعت بر طبق مذہب
علیہم السلام قائم کرنے کا پختہ ارادہ کر کے مجھ سے باصرار اقامتِ نماز کے لئے کہا
بسبب حقِ نعمت گنجائش انکار نہ تھی مگر دو وجہ سے چاہتا تھا کہ مجھ کو معاف رکھیں
یہ کہ یہ منصب بزرگ اور جلیل القدر ہے اور میرا رتبہ علماء و کملاء حقہ میں قاصر
ہے۔ دوسرے یہ کہ بسبب تسلط اہل خلاف و شوکتِ اہل طغیان و اعتساف ان
شہروں میں امامیہ کی نماز جمعہ و جماعت گذشتہ زمانہ میں نہیں ہوتی تھی۔ لہذا نئی
سے لوگوں میں استعجاب و استغراب کا اور بعضے مخالفین بدکردار کی جانب سے
اندازی کا احتمال تھا۔ مگر یہ جان کر کہ رئیس مملکت (آصف الدولہ) چونکہ ترویج دین
نیتِ صادق رکھتے ہیں اور مذہب ائمہ معصومین کو برتری و فوقیت دینے میں
ان کی مصروف ہے، اس لئے میں نے بھی ہمت کا دامن مضبوط تھام لیا اور حق
استعانت سے اقامت جمعہ و جماعت کا آغاز ۱۳ رجب المرجب ۱۲۰۰ ہجری (مطابق
۱۷۸۶ء بروز جمعہ) کو کیا کہ روز میلاد حضرت امیر المومنین ہے اور دولت خانہ
مرزا حسن رضا خاں میں بصحابت آنحضرت خورشید منزلت جناب نواب وزیر الملک
الدولہ بہادر جماعت مومنین کے ساتھ ظہر و عصر ادا کی اور اسی مہینے کی ۲۷

چکن کی دوپلی ٹوپیاں، جن سے بیل بوٹے کاڑھنے والیوں کی نرم ونازک انگلیوں کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک طرف ادب سے کھڑے ہوئے مالیوں کی قطاریں، جنکی خوبصورت چھڑیوں میں بیلے اور موتیا کے مہکتے ہوئے گجرے، مجمع میں سقّوں کی بھاگ دوڑ، چاندی کے چمکتے ہوئے پیالوں میں ٹھنڈے پانی کی پیشکش، خالی پیالوں کی ایسی مدھر جھنکار کہ شوقِ تشنگی بیدار ہو جائے۔ یہیں حقہ پلانے والوں کا بھی ہجوم ہوتا تھا۔ شانوں پر سرخ رومال، پیتل کی چمکتی ہوئی سنہری چلموں پر چاندی کے منقش سرپوش چلم میں زعفرانی، عنبری یا مشکی خمیرہ تمبا کو نیچے پر دسیوں بیلے اور موتیا کی لڑیاں چاندی کی مہنال ہر ایک کے سامنے ادب سے پیش کرتے۔ پینے نہ پینے والے سب ہی پیسے دو پیسے سے مراعات کرتے۔

عجیب منظر ہوتا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی تھی کچھ نوابین، کچھ خاندان وزارت کے متعلقین، کچھ سلطنت دہلی کے معززین، کچھ پروردہ، کچھ کوکا، کچھ بانکے، کچھ ترچھے کچھ رنگیلے، کچھ چھبیلے، سب ہی اس مجمع میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ نوابین ومعززین سلطنت دہلی کے ہاتھوں میں چاندی کی شاندار چھڑی۔ خاندان وزارت کے ہاتھوں میں موتیا یا بیلے کے مہکتے ہوئے گجرے، پروردوں کے ہاتھوں میں

(یعنی ۲۷ مئی ۱۷۸۶ء بروز جمعہ) کو کہ روز مبعث حضرت سید المرسلین ہے، نماز جمعہ کی سعادت حاصل کی —"

— (ملخصاً)

(از بادشاہ بیگم اودھ صفحات ۱۰۳ و ۱۰۴)

تیریں جن پر سرخ رومال پڑا ہوا، بانکوں کے ہاتھ میں قمچیاں، ترچھوں کی ہاتھوں میں جن کر ٹیڈ یو ہو ہوا کرتے تھے۔

یہ دنیا ہے۔ یہاں کسی چیز کو قرار و استحکام نہیں۔ تغیر و تبدل کا عمل ساری کائنات پر مسلط ہے۔ یہی تو نظامِ قدرت ہے ــــ زمانہ بدلا، لوگ بدلے تہذیب و تمدن بدلا، معمولات و مشاغل بدلے۔ گردشِ زمانہ کے نشیب و فراز نے افکار و آلام کے ڈیرے ڈال دیے۔ اب نہ کہیں پالیوں کے تذکرے ہیں نہ مشاعروں کا ذکر، نہ مرغ بازوں کی گفتگو، نہ کہیں کنکوؤں کے میدان کا کوئی قصہ سناتا ہے اودھ کا دارالخلافہ تو اب بھی موجود ہے لیکن اودھ کی وہ شیریں بیانی، وہ شرافت کے مظاہرے، القاب و آداب کا وہ باموقع اور برمحل استعمال اب کہاں؟ وہ دل موہ لینے والا مہذب اندازِ گفتگو، وہ نشست و برخاست کے آداب اب کہاں وہ مشرقی تہذیب جس پر کبھی ہندوستان کو فخر و ناز تھا، فیض آباد میں اب کہاں تلاش کیا جائے؟ انیس و چکبست کا فیض آباد کہاں ہے؟ کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سب کا ایک ہی معاشرہ تھا۔ ہاں اگر کہیں کوئی فرق نظر آتا تھا تو وہ دھوتی اور پاجامہ کا تھا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ

اب اس مسجد میں ایک پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم دارالمطالعہ ہے جو پابندیٔ وقت کی پابندی کے ساتھ، علاوہ تعطیلات کے دنوں کے کھلا رہتا ہے۔ شام کے وقت اکثر جب "اگلے وقتوں" کے لوگ دارالمطالعہ میں اکٹھا ہوتے ہیں تو وقت گذاری

کے لئے افیمچیوں جیسی بے سروپا یا خواب و خیال کی دنیا کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ
جا سکتے ہیں۔ یہ کتب خانہ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کے نام سے
منسوب ہے۔ اس مسجد کا سنِ تعمیر ۱۰۷۹ھ ہے۔ اسکی تعمیر میں تین سال زاید کا عرصہ
لگا تھا۔ اس مسجد میں روزانہ ایک مجتہد بطریق مذہب امامیہ نماز باجماعت پڑھاتے
ہیں۔ اب جامع مسجد حسن رضا خاں سے اتر ئیے اور گھنٹہ گھر سے پورب کیطرف
جانے والی سڑک پر چلیئے۔ تقریباً سو میٹر پورب کی طرف چلنے کے بعد داہنے ہاتھ
کوٹھ پارچہ گلی کا دوسرا پھاٹک ملے گا۔ اس پھاٹک کے ارد گرد اب کتب فروشوں
اور اسٹیشنری والوں کی دوکانیں ہیں۔ پھاٹک کے اندر چند میٹر آگے دکھن
جانب چلنے کے بعد فیض آباد کی مشہور مسجد "مسجد ٹاٹ شاہ" کا پھاٹک ملے گا۔ جس
کے دونوں طرف اب جوتے بیچنے والوں اور جوتا و سوٹ کیس بنانے کے سامان
بیچنے والوں کی دوکانیں ہیں۔

مسجد ٹاٹ شاہ اور ٹاٹ شاہ

پھاٹک کے سامنے ہی سے مسجد کی عظیم الشان عمارت
اور اس کا وسیع صحن نظر آتا ہے۔ اس مسجد کی حالیہ جدید تعمیر ۱۹۳۸ء
مسلمانان فیض آباد نے کی ہے۔[۹۱] مسجد کی جدید تعمیر کے خاص محرک مولانا شاہ
عبد العلی صاحب تھے[۹۲] مسجد کے اندر و باہر کے نقش و نگار، آیات قرآ

۹۱۔ قدیم مسجد ٹاٹ شاہ کو مسلمانان فیض آباد نے ۱۹۲۶ء میں شہید کیا اور
میں اس کی جدید تعمیر مکمل ہوئی ـــــ مولف۔

۹۲۔ مولانا شاہ عبد العلی صاحب مرحوم گورنمنٹ کالج فیض آباد میں عربی کے لکچرر تھے

کے طغرے اور رنگ کاری اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے

موجودہ مسجد ٹاٹ شاہ، زمانہ ماضیہ میں ایک اوسط لمبائی چوڑائی کی مسجد تھی اس کی چھت بھی نیچی تھی۔[۹۲] زمانہ ماضی میں اس مسجد سے ملحق ایک کشادہ حجرہ بھی تھا اسی حجرہ میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد کے ابتدائی ایام میں جب خاندان مغلیہ پر تباہی و بربادی کے بادل چھائے اور افراد خاندان حفظِ جان و ناموس کے لئے دہلی چھوڑ کر جدھر منہ اٹھا چل پڑے اسی زمانہ میں خاندانِ مغلیہ کے ایک شہزادے نے دنیا کی بے ثباتی و بے مروتی اور اس کے عیش و آرام کی بے بضاعتی کو دیکھ کر اس درجہ شدید تاثر لیا کہ لذتِ دنیا سے منھ موڑ کر، فقیری اختیار کر کے، تارک الدنیا ہو گیا اور اُسی "فقیرانہ حلیہ" میں فیض آباد آ کر اسی حجرہ میں قیام فرمایا۔

اور مولانا شاہ عبداللطیف صاحب کے مخصوص بے تکلف معتقدین میں سے تھے۔ مسجد ٹاٹ شاہ کی تعمیر جدید کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ بارہ بنکی ضلع کے رہنے والے تھے اور بریلوی مشرب رکھنے کے باوجود نہایت معتدل المزاج تھے، ساری زندگی فیض آباد میں گذاری۔ بڑی بوا صاحبہ کے قبرستان مدفون ہوئے ——— مولف۔

۹۲ ۔ اکثر ضعیف العمر لوگ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ زمانہ ماضی میں اس مسجد کی ضروریات کی کفالت کے لئے مسجد سے متصل ہی کچھ آراضی شاہان ماضیہ نے عطا کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب ——— مولف۔

فقیر شہزادہ کے کریمانہ اخلاق، مغلیہ وسیع المشربی، ہمدردی وغمگساری نے
چند ہی دنوں میں اس درویش کی شہرت کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ درویش کو دنیا کے
جھمیلوں اور لذت دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق
کسی نے کچھ تحفتہً دیدیا تو بصد شکریہ لے لیا۔ ورنہ عبادت وریاضت اس کا محبوب
مشغلہ تھا۔ اس میں مشغول رہتا۔ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کی
قناعت وتوکل کا پیکر تھا۔ ستر پوشی کے لئے موٹے اور کھردرے کپڑے پہنتا تھا
جس کی مناسبت سے لوگ اسے "ٹاٹ شاہ" کہنے لگے تھے۔ کچھ دنوں بعد زمانہ ماضی
کی یہ مسجد اسی درویش کے نام سے منسوب ہوگئی۔

سن ۱۲۰۲، ۱۲۰۱ھ (مطابق ۸۸ء ۱۸۸۴، ۱۸۸۲ء) کے درمیان ٹاٹ شاہ کا انتقال ہوا اور اسی حجرہ
کے باہر دفن کئے گئے۔ انتقال کے بعد جو چیزیں ٹاٹ شاہ کے حجرہ سے برآمد
ہوئی تھیں ان میں کچھ بوسیدہ اور کرم خوردہ کاغذات کے ساتھ سرخ عقیق کا
ایک تعویذ بھی تھی جس میں آپ کا سلسلۂ نسب بہادر شاہ ظفر تک کندہ تھا
تعویذ میں کندہ عبارات کے مطابق آپکا بہادر شاہ ظفر کا پَرپوتا ہونا ثابت
کچھ دنوں تک یہ تعویذ محلہ مقبرہ کے کسی شکور شخص کے پاس تھا۔ ۱۹۰۳ء
تک اس تعویذ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے لیکن اس کے بعد یہ تعویذ کن لوگوں
ہاتھ لگا اور کیا ہوا؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

زمانۂ دراز سے لوگ ٹاٹ شاہ کو ولیٔ کامل تصور کرتے چلے آرہے ہیں اور
ان سے منسوب بہت سی کرامات بیان کرتے ہیں۔

ٹ شاہ کا حجرہ آباد رہا

ٹاٹ شاہ کے انتقال کے بعد مدتوں یہ حجرہ خالی رہا۔ بہت دنوں بعد مولوی
اللہ صاحب بہرائچی جو مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے خلیفہ تھے، نے آکر
حجرہ میں قیام کیا۔ اس کے بعد حاجی سید احمد علی اور ان کے بھائی سید
دوست جو مولانا محمد نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے خلیفہ بھی تھے، مسجد ٹاٹ شاہ
بنے لگے تھے۔ محلہ کے مسلمانوں نے انہیں مسجد کا متولی اور نگراں بنا دیا
جب ان دونوں اصحاب کا انتقال ہو گیا تو یہ لوگ بھی ٹاٹ شاہ کے قرب
دفن کئے گئے۔ مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس
یں کچھ دنوں مولوی محمد یعقوب دہلوی نے بھی قیام کیا تھا اور جب آپ کا
ل ہوا تو آپ کو بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔

مولوی محمد یعقوب دہلوی کے انتقال کے بعد حافظ سید محمد اسماعیل صاحب
ہ مولوی بشارت اللہ صاحب جو مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے داماد
، اس حجرہ میں آکر قیام کیا اور کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ کہتے
ہ آپ کی محنت اور خلوص کا یہ ثمرہ تھا کہ ہر سال دو تین بچے حافظ قرآن ہو کر
رہے۔ ۹۴

اب اس مسجد کی بالائی منزل پر مسجد کی انتظامیہ کمیٹی ایک اسلامی مکتب
رہی ہے جس میں محلہ کے بچے اردو، عربی اور ہندی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے

۹۴- یہ ذکر ۱۹۱۳ کے پہلے کا ہے۔

ہیں۔ مسجد اور اُس سے متعلق دو کانوں وغیرہ کا انتظام ایک رجسٹرڈ باڈی کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے اور جیسا کہ ہر مسلم اداروں میں اقتدار کے لئے رسہ کشی اور جنگ آزمائی ہوتی رہتی ہے وہ حالت وکیفیت یہاں بھی دیکھنے کو آسانی سے مل جاتی ہے۔

ٹاٹ شاہ مسافر خانہ:

ابھی چند دن ہوئے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے محلہ کنگھی محال میں جو چوک گھنٹہ گھر کے پورب داتر جانب ہے محلہ کنگھی محال کی مسجد کے پچھم جانب ٹاٹ شاہ مسافر خانہ کے نام سے ایک مسافر خانہ کی بنیاد ڈالا تھا، اب تک چھ سات کمرے، دو غسلخانے اور پاخانہ بن چکے ہیں۔ چار روپیہ یومیہ کے حساب سے اس مسافر خانہ میں قیام کرنے کا کرایہ پڑتا ہے۔ ذمہ داروں سے بات چیت کرنے پر مولف کو محسوس ہوا کہ ان کے منصوبے عظیم ہیں لیکن عوامی عظیم منصوبے خصوصاً مسلمانوں کے ذریعہ تکمیل پانے کے تجربے مولف کو بہت تلخ ہیں۔

اب مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے باہر نکلئے تو سامنے ہی ایک پتلی سی سڑک ملے گی جو جمنیا باغ سے آریہ سماج ہندر ادر راج کرن دیار گ انٹر کالج کے سامنے سے ہوتی ہوئی مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ، چھوٹی درگاہ حضرت عباس کے سامنے سے چوک بزازہ کو چلی جاتی ہے۔ مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے سامنے ہی ایک زمانہ دیدہ، دیوہیکل برگد کا درخت ہر آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔ مسجد کے اس دروازہ سے دس پندرہ میٹر پچھم کی طرف اسی سڑک پر چلنے کے بعد، بائیں ہاتھ پر حضرت عباس کی چھوٹی درگاہ ملتی

ہے جہاں پر ہر جمعرات کو شیعوں کی مجلس ہوتی ہے۔ ایام محرم میں دس دن متواتر مجلس کا نظم اب تک بدستور سابق چلا آرہا ہے۔ لیکن وہ روح جو ساٹھ ستر برس قبل یہاں نظر آتی تھی اب عنقا ہے۔

موتی مسجد اور علاقہ موتی مسجد

حضرت عباس کی چھوٹی درگاہ سے پورب مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے سامنے برگد کے درخت کے پچھم جانب سے ایک ٹیڑھی میڑھی سڑک دکھن جانب پرانی سبزی منڈی محلہ کو گئی ہے۔ اس درخت کے پاس سے دو ڈھائی سو میٹر دکھن جانب چلنے کے بعد موتی مسجد کا عقبی حصہ ملتا ہے جسکی پشت پر جھونپڑیاں ڈال کر لوگ رہ رہے ہیں۔ کچھ لوگ مسجد کے مینارے کے نچلے حصے میں بھی رہتے ہیں۔ یہ عظیم الشان مسجد نواب شجاع الدولہ کے وسطی دور حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ فنِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مسجد کی لمبائی اور چوڑائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ جس زمانے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی اس وقت ضرورت کے پیش نظر اتنی وسیع و عریض مسجد بنانے کی یقیناً ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ فی الوقت اس مسجد کو آباد رکھنے والوں کی تعداد برائے نام نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ محرم کے ایام میں ایک عشرہ کیلئے کچھ رونق و آبادی بڑھ جاتی ہو۔ مسجد کو باہر سے دیکھنے کے بعد، مسجد کی دیکھ بھال کرنے والوں پر "بے پروائی" برتنے کا جرم، اندر کی صفائی اور قدرے توجہ دینے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ تاہم منتظمین کو اس جرم سے

بری نہیں کیا جاسکتا کہ جس سست روی سے مسجد کی دیکھ بھال کیجا رہی ہے، اُس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ خستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کل اس مسجد کے احاطہ میں شیعہ فرقہ کے بہت سے خاندانوں کی رہائش گاہ ہے۔

بہاروں کا مسکن ہے یہ

شاہراہوں پہ سناٹا نہ دیکھا تھا کبھی
پھولوں سے چہرے کبھی اتنے تو رنجیدہ نہ تھے

موتی مسجد کا یہ علاقہ آباد ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں اجاڑ اور ویران سا نظر آتا ہے۔ اس علاقہ کے ہر در و دیوار سے وحشت و حسرت برستی ہے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں خواصپورہ کے بعد جس علاقہ کی اہمیت اور حیثیت قابل رشک تھی اور جسے "پرستان" کہلانے کا فخر حاصل تھا وہ یہی موتی مسجد کا علاقہ یا محلہ تھا۔ جس میں عموماً عمائدین سلطنت اور ارکین دولت کی داشتائیں اور رکھیلیں شاہانہ ٹھاٹھ سے رہا کرتی تھیں۔ امراء و رؤساء۔ ارکین دولت و عمائدین سلطنت کے افراد زرق و برق لباسوں میں ملبوس، ہاتھوں میں موتیا و بیلے کے گجرے لئے ہوئے خدام و مصاحبین کے جلو میں ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آتے تھے لیکن آج اس علاقے پر ایک ایسی ناقابل بیان وحشت و خموشی اور ویرانی و اداسی کا عالم چھایا ہوا ہے کہ ہر ایک نووارد بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ اس محلہ کا سارا ماحول خاموش و پژمردہ سا لگتا ہے۔ لوگ متفکر، چہرے اترے ہوئے۔ بے رونق، جیسے پریشان حال، کسی انجانی فکر یا اندیشہ

خوف دہراس سے سراسیمہ سے لگتے ہیں لیکن عورتوں کی "حالت" ان کے
وں کے برعکس ہے۔ آج یہ محلہ یا علاقہ ہر صاحب نظر کے لئے جلتے عبرت ہے۔
موتی مسجد کی پشت سے گذرنے والی پرانی سبزی منڈی کی سڑک سے دکھن
ف تقریباً دو سو میٹر مزید دکھن کی طرف چلنے پر بائیں ہاتھ (پورب جانب)
سڑک گورنمنٹ بیسک ٹریننگ اسکول کا ہندی زبان میں بورڈ لگا ہوا ہے دکھن
نب۔ جس مقام پر اس اسکول کی چہار دیواری لگی ہے۔
سے تقریباً پچاس میٹر مزید آگے دکھن جانب ایک چوراہا ہے اس چوراہے پر بائیں ہاتھ مڑنے
کھومی ٹولہ نامی علاقہ ہے (اب محلہ ہے، جو پرانی سبزی منڈی کا پوربی حصہ ہے
داہنے ہاتھ پر نخاس کا قدیم محلہ ہے۔

قت کتنا بدل گیا

عہد ماضی دوبارہ تو آتا نہیں
یاد ماضی ہی سے دل کو بہلایئے

نوابین اودھ   کے دور میں یہ دو منزلہ
و یہ بازار تھا۔ نخاس کا بازار پہلے بھی عصمت فروشی کا بازار رہا ہے اور آج
عصمت فروشی کا بازار ہے۔ لیکن اس وقت آج جیسی ضلالت و رذالت
ں کہ کنجڑوں کی طرح "گاہک" کو بلائیں اور مخش انداز و اطوار سے جنس کی
ن کریں۔ دو ٹک بات کر کے معاملہ طے ہو جائے۔ پہلے وقتوں میں تماش بینوں
یکھا جاتا تھا۔ متعدد ملاقاتوں   کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔

مہینوں بعد پھر کہیں عرض مدعا کی نوبت آتی۔ اِس بازار میں بہت سی ڈیرہ دار اور پیشہ ور طوائفیں تھیں لیکن آج جیسی بڑنوں کا ہجوم نہ تھا۔ سارے بازار میں طبلہ وسارنگی کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ایک سے ایک مہذب اور تہذیب یافتہ طوائفیں تھیں جن میں "مجرئی" زیادہ "حجرئی" کم۔ "حجرئی" کے لئے بھی ایک صبر آزما وقت کی ضرورت تھی۔ "مجرئی" کا تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ شرفائے شہر معتبر وبرخواستہ کی تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو یہاں بھیجتے تھے۔

یہ طوائفیں مزاج شناس اس قدر ہوتی تھیں کہ غزل چھیڑنے سے پہلے سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھیں کہ محفل میں حافظ کی شرابِ شیراز کارگر ہوگی کہ غالب کی شوخیاں کام آئیں گی یا میر کے سوز و درد سے قیامت بپا کی جائے؟ —— ان طوائفوں کی معاشرت تو سب سے جداگانہ تھی مگر اخلاق و آداب، تہذیب و تمدن اور انداز گفتگو و شیریں بیانی میں بے مثال ہوتی تھیں۔ زبان میں شستگی و نرمی، حاضر جوابی اتنی کہ اچھے اچھوں کے منہ میں تالے پڑ جائیں —— کیا مقابلہ ہے آج کے نخاس سے کل کے نخاس کا۔ !

نخاس سے ملحق، چوراہے کے پورب جانب، پرانی سبزمنڈی کا محلہ گھوسی ٹولہ ہے جو اسی محلہ کا ایک حصہ ہے۔ اسی سبزمنڈی میں ایک مکان کے باہری صحن میں مولانا نیاز احمد صاحب کا مزار ہے

مولانا شاہ نیاز احمد:

مولانا نیاز احمد صاحب جائس کے رہنے والے تھے ۱۳۲۲ ہجری مطابق ۱۹۰۴ء میں فیض آباد میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال سے

باکھی۔ آپ اپنے زمانہ کے عالم باعمل اور ماہر طبیب تھے۔ فیض آباد آنے کے بعد
آپ نے سبزی منڈی کے محلہ میں منور خاں نامی شخص کے مکان پر قیام فرمایا
آخر عمر تک اسی مکان میں رہے اور جب انتقال ہوا تو اسی مکان کے
سامنے آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت مولانا نیاز احمد مرحوم صاحب زمانۂ حال کے صاحب کمال بزرگ، عالم
اور حاذق طبیب اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ آپ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی
کے خلیفہ تھے اور سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ آپ نے کسی کو اپنا خلیفہ
جانشین نہیں بنایا کیونکہ کوئی بھی معتقد یا مرید آپ کے معیار کے مطابق پابند
شریعت اور زہد و تقویٰ کا نہیں تھا۔

آپ کے زمانۂ حیات میں، لوگ دور دور سے آپ کی ملاقات اور دعاؤں
کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ کی ذات بابرکات شہر فیض آباد
کے لئے خصوصاً اور اطراف و جوانب کیلئے عموماً باعث برکت تھی۔ آپ کی بیشمار
کرامات لوگوں میں مشہور ہیں۔ لوگ اب بھی آپ کے باطنی فیوض سے مستفیض
ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء کی گرمیوں کے ایام میں آپکا انتقال ہوا۔

انتقال کے فوراً ہی بعد معتقدین کا دو گروہ ہو گیا۔ ایک گروہ کی خواہش تھی آپ کو
والی تکیہ دکھڑکی علی بیگ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے، اور اس نے تاڑ والی
قبرستان میں قبر کھدوائی تھی۔ دوسرا گروہ چاہتا تھا کہ آپ کو منور خاں کے مکان کے
سامنے صحن میں دفن کیا جائے اور اس نے اس جگہ پر قبر بھی تیار کروالیا تھا۔
آپ کی نماز جنازہ، بعد نماز ظہر، مسجد ٹاٹ شاہ کے پوربی دروازہ کے سامنے ہوئی

ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اُس دن فیض آباد شہر کی تمام دکانیں آپکے سوگ میں بلا کسی اعلان "بندی" کے بند ہوگئی تھیں۔ تدفین کے وقت تنازعہ رونما ہوا۔ ہر گروہ اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ کشمکش ایک بدترین ہنگامہ کی شکل اختیار کرنے ہی والی تھی کہ پولس اور ڈپٹی کمشنر مسٹر آر۔ سی۔ ہوبرٹ (MR. R. C. HOBET) کے ہمراہ ضلع کے تمام اعلیٰ حکام موقع پر پہنچ گئے اور انھوں نے مشتعل ہجوم کو قابو میں کرکے لوگوں سے دریافت کیا کہ مولانا مرحوم کا کوئی رشتہ دار، عزیز یا ان کا جانشین اگر کوئی ہو تو ہمارے سامنے لایا جائے۔ لوگوں نے حکام کو بتلایا کہ مولانا مرحوم کا کوئی رشتہ دار، عزیز یا جانشین یہاں نہیں ہے صرف ایک منوّر خاں کی ضعیف بیوی ہیں جنکے مکان میں آپ رہتے تھے۔ اور جو آپ کو لڑکے کیطرح مانتی تھیں اور وہی آپکے قریب تر رہتی تھیں۔ بیماری میں وہی تیمارداری بھی کرتی تھیں۔ چنانچہ کمشنر مسٹر ہوبرٹ نے چند معزز لوگوں کو ہمراہ لیکر منوّر خاں کی اہلیہ کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا کہ مولانا مرحوم نے آپ سے کوئی وصیت تو نہیں کیا ہے؟ یا اپنے دفن ہونے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا ہے؟ ــــ مسماۃ موصوفہ نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو تبلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے، البتہ مرنے کے دو دن پہلے مجھے کہا تھا کہ "اب میں یہیں رہونگا"۔ چنانچہ کمشنر نے مسماۃ کا بیان سنکر فیصلہ کیا کہ مولانا مرحوم کو منوّر خاں کے مکان کے باہر سامنے صحن میں دفن کیا جائے گا۔ عوام نے ڈپٹی کمشنر صاحب کے فیصلہ کو تسلیم کیا۔ چنانچہ پولس کے حسنِ انتظار اور ضلع کے اعلیٰ حکام و ڈپٹی کمشنر صاحب کی نگرانی میں آپ کو منوّر خاں کے مکان کے باہر سامنے صحن میں سپردِ خاک کیا گیا۔ مٹی دینے کا سلسلہ تقریباً ساڑھے تین بجے بعد دوپہر سے شروع ہوا اور رات تین بجے تک چلتا رہا۔ ہزاروں مسلمانوں اور

ہندوؤں نے مٹی دیا۔ آپ کے مزار پر جو قطعہ تاریخ لگا ہوا ہے اسکی عبارت ہے:

عارفِ حق نیاز احمد شاہ — زیں جہاں در جوار رحمت رفت
از پئے سال رحلتش معجز — گفت حق گو ہوئے جنت رفت

= ۱۲۳۵ھ

آپ کے مزار کے بغل میں بائیں طرف آپ کے خادم شیخ محمد حفیظ کا مزار ہے آپ کے معتقدین میں سے تھے اور مدرسہ کے بانیوں میں سے تھے۔

شیخ محمد حفیظ کا انتقال ۴ نومبر ۱۹۴۶ء مطابق ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ بوقت ۸ بجے شب ہوا تھا اور تدفین ۵ نومبر ۱۹۴۶ء بعد نماز جمعہ ہوئی تھی۔ آپ شہر کے ایک سرگرم سماجی کارکن تھے۔ اور مسلم لیگ (فیض آباد شہر) کے صدر تھے اسپتال، جیل اور پھانسی گھر کی لاوارث میتوں کی تجہیز تکفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

جنکا انتقال مولانا کے انتقال کے تقریباً ۱۲۱ سال بعد ہوا لوگوں نے آپکو بھی مولانا کے پہلو میں دفن کیا

آپ کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ مولانا عبدالغفار صاحب ایم. اے.

جو مرحوم منور حان کے مکان کے متصل ہی رہتے ہیں اور

انکی عمر اس وقت اسّی بچاسی سال کی ہے۔ انہوں نے تھوڑا زمانہ مولانا نیاز احمد صاحب کا آخری زمانہ دیکھا ہے اور ان کے متعلق اچھی معلومات رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار سے واپس ہوکر مسجد ٹاٹ شاہ کے پھاٹک کے سامنے سے چوک گلاب باڑی روڈ پر آئیے۔ گلی گوٹاباز کے اس پھاٹک سے چند قدم پورب کی طرف چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر "توپ

والی کوٹھی" نام کی مشہور عمارت ملے گی۔ کوٹھی کا صحن وسیع و عریض ہے۔
کوٹھی کے سامنے ہی صحن میں ایک چبوترہ پر ایک برطانوی توپ رکھی ہوئی
آئے گی جس پر آج بھی تاج برطانیہ کا نشان بنا ہوا ہے اور شاید اسی برطانوی
کی مناسبت سے زمانۂ مابعد میں لوگ اسے "توپ والی کوٹھی" کے نام
پکارنے لگے۔ اس کوٹھی کے جنوبی حصہ میں فیض آباد چوک کا سٹی پوسٹ آ
ہے۔ پچھمی اور پوربی حصہ میں جو بہت کے آڑھتیوں کے گودام اور ایک پریس ہے۔

یہ وقت کی بات ہے

اب اتنے بھی سادہ تو نہیں ہو کہ نہ مانو
یہ بات الگ ہے کہ الجھنے ہی کو ٹھانو

یہ کوٹھی جو آج توپ والی کوٹھی کہلاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے
نائب و معتمد، سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی حویلی تھی جو نواب وزیر
کے معتمد اور کمپنی سرکار کے خیر خواہوں میں تھے۔ عہد آصفی میں اس کوٹھی کے اردگرد
انکے ملازمین اور شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات تھے۔ بعد انتقال انکی حویلی کے صحن میں
انکو سپرد خاک کیا گیا اور کمپنی سرکار بہادر (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی اجازت سے انکے انگریز حاکم دوست
نے ان کے اعزاز میں ان کی قبر پر برطانوی توپ رکھ کر برطانیہ سے وفاداری کا
خصوصی امتیاز بخشا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا
خاں اور ان کی حویلی کو فراموش کرتے چلے گئے۔ ان کی قبر پر رکھی ہوئی برطانوی
توپ، جو صاحب قبر کی تاج برطانیہ سے خیر خواہی کے اعزاز میں رکھی ہوئی ہے

اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے [۹۵] اور نواب موصوف کی قبر کی حیثیت ایک چبوترہ کی ہو کر رہ گئی۔ آج فیض آباد شہر ہی میں ایسے چند ہی لوگ موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ "توپ والی کوٹھی" میں جس چبوترہ پر برطانوی توپ رکھی ہوئی ہے وہ کوئی چبوترہ نہیں بلکہ نواب آصف الدولہ کے نائب و معتمد سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی دائمی آرامگاہ ہے۔ اب یہ 'چبوترہ' بھی انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ اگر چبوترہ کے ساتھ اسی طرح کی بے پروائی و بے اعتنائی برتی جاتی رہی تو آئندہ دس پانچ سالوں میں اس چبوترہ کا نام و نشان بھی مٹ جائیگا اور صرف توپ والی کوٹھی کا نام کچھ دنوں کے لئے باقی رہ جائیگا۔

فیض آباد کی آبادی کے ایک مخصوص طبقہ کے افراد کی رگوں میں نواب شجاع الدولہ اور ان کے اراکین و عمائدین کا وہ "گرم خون" آج بھی گردش کر رہا ہے جو اخلاف و اسلاف کے درمیان کسی تعلق و رشتہ کا "لازمہ" بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ کوئی المیہ نہیں ہے۔

خود غرض ہیں یہ اُجالوں کے پرستار بہت
صبح ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

۹۵۔ جس 'چبوترہ' پہ برطانوی توپ رکھی ہوئی وہ اب نہایت خستہ ہو چکا ہے۔ اس پہ لگا ہوا چونے کا پلاسٹر بھی 'مردہ' ہو کر اکھڑ چکا ہے جس سے چبوترہ کی جڑائی کی اینٹیں صاف ظاہر ہونے لگی ہیں۔ چبوترہ کی اینٹوں کی چنائی محراب دار ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کوئی چبوترہ نہیں قبر ہے اور قبر ہونے میں اب کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے — مولف

قدرت کا ایک عبرت آموز تازیان

ہے جو کچھ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود
نہیں ہے وہ تو ایک معتدل مزاج خون کے آدمی تھے اسوقت کے "گرم خون" رکھنے والی
بیشمار معزز صاحبِ اقتدار شخصیتوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ و معاملہ ہے۔

اب توپ والی کوٹھی سے نکل کر، سامنے سڑک پر پورب کی طرف جل
آگے "گلاب باڑی" کا مشہور زمانے کا پارک ملے گا جو خواصپورہ کے علاقہ یا محلہ میں
ہے۔ اس پارک کے وسط میں ایک مربع عمارت میں نواب شجاع الدولہ کی ق
ہے۔ اب سے ساٹھ، ستر سال پہلے کی "گلاب باڑی" اور اس سے ملحق بیر
میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور تبدیلیوں کا سلسلہ اب بھی اپنی شد
کے ساتھ جاری ہے۔

دیکھتا ہوں جاگتا خواب اک نئی دنیا کا آج
اگلے وقتوں کے جو تھے ہنگامہ آرا سو گئے

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اب نہ وہ گلاب باڑی ہے اور نہ گلاب باڑی کی وہ صبح
شام نہ وہ خواص پورہ ہے اور نہ خواص پورہ کے وہ بے فکر عوام و خواص ــــــ
ہاں ابن آدم کی عبرت کے لئے کہیں کہیں خستہ و بوسیدہ قبروں کے قبرستا
اور ان میں ٹوٹے پھوٹے مقابر یا مقابر کے باقیات و آثار، دیو ہیکل، زمانہ دیدہ کچھ
درخت اب بھی باقی رہ گئے ہیں جو اپنی زبانِ بے زبانی سے اپنے گذرے ہو

دنوں کی پر آشوب داستان سنانے کے لئے کافی ہیں۔ ان کے قرب کی اداس وخاموش فضا نہ جانے اپنی خموشی کے دامن میں کتنی بہار آشنا اور خزاں رسیدہ صبح وشام کے ہنگامے سمیٹے ہوئے ہے وہ خواص پورہ جہاں کبھی غربت و افلاس کے سایہ کا تصور بھی محال تھا آج اسی خواص پورہ میں نہ جانے کتنے معصوم بچے، سرد چولہے پر رکھی ہوئی خالی پتیلی کو دیکھتے دیکھتے اپنی افلاس زدہ ماؤں کے پہلو سے ویک کر سو جاتے ہیں۔ کتنی نواب زادیاں، خانگیوں کی اذیت ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کتنی مریم زادیاں، ستر پوشی کے لئے پھٹے پرانے کپڑوں کی محتاج ہیں —— یہ انقلابات زمانہ کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ جن کے اسلاف کے الطاف و عنایات نے لوگوں کے ذہن سے غربت و افلاس کا تصور تک مٹا دیا تھا آج انہیں کے اخلاف دستِ سوال دراز کرتے ہیں جن کے باپ و دادا اپنی دولت و امارت کی نمائش کے لئے داشتائیں اور رکھیلیں رکھا کرتے تھے آج انھیں کی بیٹیاں بھوک اور غربت سے مجبور ہو کر داشتائیں اور رکھیلیں بنی ہوئی ہیں جنکے اسلاف کی داد و دہش مشہور تھی آج ان کے اخلاف کی دریوزہ گری کی شہرت ہے۔

ابر برسا پھول مہکے اور معطر کر گئے
ہے یہی آئینِ ہستی مر گئے جو مر گئے

گدڑی بازار بنام لوہا بازار

اب "گلاب باڑی" پار کر کے سے چوک گھنٹہ گھر واپس آیئے۔ سامنے اتر جانب ایک بڑا سا پھاٹک نظر آئے گا، اسے "یکدرہ" کہتے ہیں۔ "یکدرہ" کے باہر کے بازار کو پہلے

"گدڑی بازار" کہا جاتا تھا اور آج بھی کہا جاتا ہے۔ ادھر کباڑیوں کی ہی دوکانیں تھیں لیکن
ادھر کچھ دنوں سے لوگ اسے "لوہا بازار" کہنے لگے ہیں کیونکہ اب اس علاقے میں لوہے
کے سامان بیچنے والوں کی بڑی بڑی دوکانیں ہوگئی ہیں۔ لیکن عوام فی الوقت
گدڑی بازار کو لوہا بازار کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ابھی نوے اور پچانوے فیصد
لوگ اسے گدڑی بازار ہی کہتے ہیں۔ جب کبھی اس علاقے کی حیثیت و حالت
بدلے گی اس وقت "گدڑی بازار" کا نام یقیناً "لوہا بازار" ہو جائے گا لیکن
فی الوقت ایسے حالات پیدا نہیں ہیں۔

یکدرہ کے باہر سے سٹی بس، تانگہ، یکہ، ٹمپو ٹیکسی اجودھیا اور نواب گنج
(گونڈہ) کیلئے ہر وقت ملتے رہتے ہیں۔

یکدرہ سے جو پختہ سڑک سیدھے اتر جانب گئی ہے، اُسے اب "دھارا روڈ"
کہتے ہیں۔ یہ سڑک "حور محل" [96] کے اس حصہ تک گئی ہے جو "خورد محل" کہلاتا ہے۔
اور جس کی وسیع عمارت کے ایک باقی بچ رہنے والے حصہ کو، جو دریائے گھاگھرا
کے عین کنارے پر واقع ہے، اور زمانہ کی تباہی و بربادی سے بچ رہا ہے، اُسے
لوگ "افیم کی کوٹھی" کے نام سے جانتے ہیں۔ [96]

یہ افیم کی کوٹھی حور محل، جو بہت سے زمانہ محلوں کا مجموعہ تھا، اس محلسرا کا شمالی
حصہ ہے جو "حور محل" کہلاتا ہے اور جو انسان کی عبرت کے لئے زمانہ کی دست برد
سے تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے۔ کسی زمانہ میں دریائے گھاگھرا کا دھارا "حور محل"
کے پشتہ سے لگ کر بہتا تھا۔

96۔ حور محل دراصل نواب شجاع الدولہ کے "تصرف" میں آئی ہوئی عورتوں کا انتہائی ...

جس مقام پر افیم کی کوٹھی کی عمارت واقع ہے اُسی مقام کے قرب میں میر
محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک نے اپنے اور اپنی بیگمات کے رہنے
کے لئے پھوس کے بنگلے بنوائے تھے۔ ان بنگلوں کے اردگرد انکے لشکر کے افسران
اور امراء کے بنگلے تھے۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد انکے بھانجے اور داماد مرزا منصور علی
خاں (نواب صفدر جنگ) نے خس پوش "بنگلہ بستی" کی تجدید کاری کی ابتدا
کیا اور ۱۷۳۵ء میں بنگلہ بستی کو فیض آباد کا نام دیا اور پختہ عمارتیں بنوانا شروع
کیا۔ بستی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر، اُس کے اردگرد امراء و خواص وغیرہ نے
بھی اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرانا شروع کیا۔ بستی کے باشندوں کی بڑھتی ہوئی
ضروریاتِ زندگی نے تجارت پیشہ لوگوں سے دکانیں کھلوائیں اور بازار لگوائے
اور جلد ہی ترقی کے وہ مراحل طے کئے کہ فیض آباد، شاہجہان آباد کی ہمسری کرنے

اور آراستہ و پیراستہ "قید خانہ" تھا جس میں ہزاروں "مستعملہ عورتیں" رہتی تھیں۔ لیکن "خورد محل"
جو اسی محل کا ایک حصہ تھا، اسمیں صرف "نو گرفتار شکار" ہی رکھا جاتا تھا جو چند دنوں کے بعد 'حور محل' میں
منتقل کر دیا جاتا تھا۔ صاحب "احوال و واقعات" نے لکھا ہے کہ نواب وزیر کے محل میں انکی ہزاروں
عورتوں کے علاوہ ایسی بہت سی عورتیں تھیں جنھیں نواب وزیر (نواب شجاع الدولہ ــ مؤلف) نے
کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ تمام عورتیں محافظین 'حور محل' کے استعمال کے لئے تھیں اور انھیں کی نظرِ عنایت
سے حور محل میں عیش و آرام سے رہتی تھیں۔ نواب وزیر اُن سے لاعلم تھے۔

۵۷ - زمانہ دراز سے اس میں محکمہ اکسائز کا دفتر ہے۔ ضلع بھر کے افیم پیدا کرنے والے کاشتکار
اپنی افیم کی پیداوار اسی دفتر میں لا کر جمع کرتے ہیں، اس لئے یہ عمارت لوگوں میں 'افیم کوٹھی' یا 'افیم کی
کوٹھی' کے نام سے مشہور ہو گئی ـــــ مؤلف

رگا۔

موجودہ افیم کی کوٹھی، سابق حور محل کے خورد محل کا وہ حصہ ہے جو انقلا
زمانہ کے ہاتھوں انسان کی عبرت کے لئے بچ رہا ہے۔ حور محل کی عمارات نص
مربع میل سے زائد رقبہ میں پھیلی ہوئی تھیں موجودہ محلہ راٹھ حویلی، وثیقہ عرب
کدڑی بازار کا شمالی حصہ (دریائے گھاگھرا کے کنارے تک) اور دلی درواز
کا شمالی مغربی علاقہ وغیرہ سب حور محل کے اندر تھے۔ حور محل کے اندر کی عما
کے اردگرد سنترہ، آم اور دیگر اقسام کے لذیذ پھلوں کے باغات تھے۔
سے ستر اسی برس پہلے تک ان باغوں کے باقیات موجود تھے۔

فن تعمیر کا نمونہ خورد محل

کنارے ہی سے طوفاں کا تماشا دیکھنے والے
کنارے سے کبھی اندازِ طوفاں نہیں ہوتا

خورد محل کے نام سے جو کھنڈر آج ہماری نظروں کے سامنے ہے،
صحن میں اب سے تین چوتھائی صدی سے پہلے تک بہترین قسم کے سنتروں اور آم
وغیرہ کے درخت موجود تھے۔ عمارت میں لگی ہوئی ساکھو اور ساگون کی کڑیوں
شہتیروں میں کی ہوئی نقاشی کو دیکھنے کے بعد، نوابین اودھ کے ذوق ونف
پسندی اور اُس زمانہ کے کاریگروں کی فنکارانہ مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔

...ردمحل ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

آج خوردمحل کے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے
...ے درودیوار سے حسرت برستی ہے۔ ہنستے ہوئے بشاش وشگفتہ چہرے
...نڈروں میں پہنچ کر سنجیدہ دل ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں اشک آلودہ
...ی ہیں ——— کتنی گریہ وزاریاں، کتنی منتیں والتجائیں اور کتنی
...ھنچی سی سسکیاں: لب بستہ آہیں جذب ہیں یہاں کی اداس اور
...ں فضا ہیں!

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

اب نہ خورمحل کے آثار و باقیات کا کوئی نشان باقی رہ گیا ہے اور نہ
...ل میں سنتروں، آموں یا لذیذ پھلوں کا باغ ہے، نہ دلکش و رنگین پھولوں
...ں، نہ گلاب و موتیا کے پودوں کی روشیں، نہ رات کی رانی اور دن کے راجا
...ڑیاں، نہ حوض و فوارے ہیں، نہ نرگسِ بیمار کے نظارے ہیں۔
...ہ جگہ آلو، گوبھی اور مختلف ترکاریوں کی کیاریاں ضرور ہیں۔
"خوردمحل" کی اس بوجھل اور خاموش فضا میں کھڑی بلند و بالا منقش
...یں، وسیع وعریض کمرے و دالان، نہ جانے کیسے کیسے رازہائے سربستہ

کے امین ہیں؟ وعدہ وعید کی سرگوشیوں کے گواہ، اور تلاطم خیز قہقہوں، بھنچی بھنچی سی سسکیوں ولب بستہ آہوں اور چیخوں کی رازداں ہیں؟ کتنی لغزشوں اور گناہوں کے پردہ پوش اور الطاف وعنایات کی مدفن ہیں؟ کتنے عفو ودرگذر اور سزا دتازیانے کے نظاروں کا یہ گورستان ہے؟ — ایک وقت اس جگہ وہ بھی گذرا ہے جب ان دالانوں اور وسیع وعریض کمروں میں پری پیکر اور حور شمائل رقاصاؤں کے رقص ونغمہ سے ہنگامہ سا مچا رہتا تھا — بڑے بڑے بلوری فانوسوں سے ان کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بنا رہتا تھا — آج رات کے سناٹوں میں ان کی برہنہ دیواروں پر بیٹھ کر نوحہ خوانی کرنے والے الّوؤں کی مہیب آوازیں دل میں خوف وہراس سے لرزہ طاری کرتی ہیں۔ اطلس وکمخواب کے پردوں سے مزین اور شمع وفانوس سے منور رہنے والی یہ رہائش گاہیں، مٹی کے ایک دیئے کی مدھم سی روشنی کو ترستی ہیں۔

زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

ان راستوں سے

آیئے — 'خورد محل' کے کھنڈروں سے اب واپس یکدرہ چلیں۔ یکدرہ کے باہر سے مینی گنج، اور آئی ٹی آئی کالج تک جانے کیلئے، ایک روپیہ ڈیڑھ روپیہ میں رکشا مل جاتا ہے۔[98]

۹۸۔ اسی جگہ سے ٹیمپو، تانگہ، یکہ اور سٹی بس: جودھیا اور نواب گنج (گونڈہ) کیلئے ملتے لیکن اس جگہ، جودھیا اور مینی گنج وصاحب گنج وغیرہ کو جانے کیلئے چوک گھنٹہ گھر کے باٹا کی جوتوں کی دوکان کے سامنے سے ہر وقت رکشے ملتے ہیں — مؤلف

یہاں سے بینی گنج چوراہا کے لئے رکشا کیجئے۔ رکشا گدڑی بازار کے چوراہا سے پورب کی طرف فیض آباد وا جودھیا روڈ پر چلے گا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ساکیت پرنٹنگ پریس کی عمارت اور خواص پورہ کا چوراہا ملے گا۔ اس کے آگے خواص پورہ محلہ کا شمالی مشرقی حصہ اور پتھر کٹوں کی پتھروں کی دوکانیں، اس کے بعد سیتاپور آنکھ کے اسپتال کی عمارت پھر صاحب گنج، اسماعیل گنج، امانی گنج اور بینی گنج (جسے کبھی بہادر گنج بھی کہا جاتا تھا)، کے محلے آتے ہیں اس محلہ کے چوراہا پر دکھن جانب ایک قدیم املی کا درخت اور ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہی بینی گنج کا چوراہا ہے۔ سامنے کی سڑک پر جو اجودھیا شہر کو جاتی ہے (دکھن جانب جانے والی سڑک دیوکالی کو سیدھی چلی جاتی ہے۔ مولف)

مالک کی مسجد

سامنے کی سڑک جو اجودھیا شہر کو جاتی ہے بائیں ہاتھ پر لب سڑک ہی نوابین اودھ کے وسطی دور کی ایک عظیم الشان مسجد ہے جو مالک کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کا شمالی حصہ پندرہ بیس سال ہوئے بارش سے منہدم ہو گیا تھا۔ اس گرے ہوئے حصہ پر اب آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج کا قبضہ ہے جس میں ترکاریاں پیدا کی جاتی ہیں۔ آگے داہنے ہاتھ پر اب آئی ٹی آئی کالج کے پوربی گیٹ کے سامنے سڑک کے دکھن جانب مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کو جانے کا راستہ ہے۔ راستہ کے کنارے ایک پتھر کا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر "مسلم یتیم خانہ بڑی بوا روڈ" لکھا ہوا ہے۔ بائیں جانب سامنے ہی آئی ٹی آئی کالج کی پختہ چہار دیواری اور کالج کی عمارتیں ہیں۔ سامنے پورب جانب جالپا نالہ کا پل ہے۔ پھر گرکل آیوروید کالج، کامتا پرشاد سندر لال پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج، کالرا اسپتال کے سامنے سے گذرتی ہوئی، یہ سڑک

اجودھیا شہر کو جاتی ہے۔

مالک کی مسجد کا پہلے کیا نام تھا؟ یا ماضی میں لوگ اس مسجد کو کس نام سے پکارتے تھے؟ اس بات کو بتانے والا اب نہ کوئی شخص موجود ہے اور نہ کسی اخبار و کتاب میں اس مسجد کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ مسجد کی طرز تعمیر سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد کی تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسی علاقہ میں میر ابو البرکات، سید احمد بانسی والا وغیرہ جو نواب شجاع الدولہ کے معتمد امرا اور فوجی افسر تھے رہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں لوگوں میں سے کسی نے یہ عالی شان مسجد کو بنوایا ہو۔

گذشتہ نصف صدی سے لوگ اس عالی شان مسجد کو "مالک کی مسجد" یا "مالک شاہ کی مسجد" کہنے لگے ہیں تقریباً ستر پچھتر سال قبل کی بات ہے فیض آباد شہر میں گورا چٹا رنگ سفید ریشم جیسی لمبی داڑھی (جو ناف سے نیچے تک پہنچتی تھی)، عمر تخمیناً اسی، بچاسی سال الجھے الجھے برف جیسے سفید گھونگھریالے بال۔ متوسط قد، تندرست و توانا، مجذوب گھوما کرتے تھے جنھیں لوگ مالک شاہ کہتے تھے۔ شہر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا، ۱۹۱۰ء میں یہی مالک شاہ مجذوب فیض آباد شہر کو چھوڑ کر اس مسجد میں آکر رہنے لگے تھے۔ حاجتمند لوگ درخواست دعا کیلئے اسی مسجد میں آکر آپ سے ملاقات کرتے اور درخواست دعا کرتے۔ کچھ دنوں بعد یہ مسجد لوگوں میں "مالک شاہ کی مسجد" کے نام سے منسوب ہوگئی۔

مالک شاہ کے آخری دنوں کو دیکھنے والے اکثر لوگ اب بھی مینی گنج۔ سلطان پور وغیرہ محلوں میں بقید حیات ہیں اور مالک شاہ کی اپنی آنکھوں دیکھی کرامات بیان کرتے ہیں محمد اسماعیل انصاری جنکی عمر اس وقت اسی بچاسی سال کے قریب ہے انھیں مالک شاہ کے آخری دنوں کے بہت سے واقعات کا علم ہے۔

ک شاہ نے ۱۹۲۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انتقال سے ایک دن قبل اسی مسجد
ہنے والے عبدالغفور نامی ایک شخص سے جو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا
آپ بھی اکثر شفقت فرمایا کرتے تھے، بلا کر وصیت کیا کہ جب میرا انتقال ہو جائے
ے ہاتھ کے بُنے ہوئے موٹے کپڑے کے کفن کے ساتھ گنج شہیداں (موجودہ
باری تعالیٰ قبرستان) میں دفن کرنا اور میری قبر کو پختہ نہ بنانا۔ چنانچہ وقف باری قبرستان
ی کچی قبر اب تک موجود ہے۔

یعنی گنج چوراہا سے ایک پختہ سڑک دکھن جانب کو جاتی ہے جو ریلوے لائن
کرتی ہوئی دیوکالی نامی محلہ کو جاتی ہے اور بائیں جانب یعنی اتر جانب ایک خام
شکل میں راستہ جاتا ہے۔ اس پر پندرہ بیس میٹر اتر کی طرف چلنے کے بعد سامنے
یعنی اتر ہی جانب) ایک پتھروں کی پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت نظر
ہے جو بلندی پر واقع ہے۔ اس عمارت کو لوگ گنبد بخشی بابا کے نام سے پکارتے

نبد بخشی بابا

اس عمارت کو لوگ بخشی بابا کا گنبد یا گنبد بخشی بابا کہتے ہیں۔ اس گنبد کے
ر تین قبریں ہیں۔ اس محلے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ معتبر اور ضعیف العمر لوگوں
سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ ان تینوں قبروں میں سے ایک قبر سید سالار مسعود غازی
رحمۃ اللہ علیہ) کی فوج کے بخشی کی ہے اور دوسری دو قبریں ان کے مصاحبین کی
۔ (واللہ اعلم بالصواب)[99] اس گنبد کے پچھم جانب ایک ٹوٹی مسجد شکستہ حالت میں

۹۹۔ بخشی بابا اور ان کے مصاحبین کا نام اور دیگر حالات کسی قدیم و جدید کتاب میں

اینٹ موجود ہیں جنھیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد متوسط عرض وطول
رہی ہوگی۔ گنبد کے پورب، اتر، پچھم جانب زمانہ قدیم کی ہزارہا قبریں
اس وسیع وعریض قبرستان کا سلسلہ کامتا پرشاد سندر لال ساکیت پو
گریجویٹ ڈگری کالج سے آگے اجودھیا شہر کی عیدگاہ کے پیچھے لعل شاہ باز
کی خانقاہ تک چلا گیا ہے۔

یہ وسیع قبرستان، جس میں گنبد بخشی بابا بھی واقع ہے، زمانہ ماضیہ میں
گنجان جنگل تھا۔ اس جنگل میں لاکھوں پختہ وخام قبریں، مقابر اور تباہ برباد خانقا
تھیں۔ چونکہ یہ تمام علاقہ دریائے گھاگھرا کے کنارے پر ہے اس لئے اسمیں جنگ
بھینسیں، بھینسے، گائیں، ہرن، نیل گائیں، ساہی، لومڑیاں، خرگوش، بھیڑیئے
جنگلی سور وغیرہ جانور اور مور، مرغابیاں، بٹیریں، تیتر، جنگلی مرغابیاں، ہار
بطخ اور کھلک وغیرہ پرندے ملتے تھے اور اب بھی ملتے ہیں۔ جانوروں اور پرند
کی بہتات کی وجہ سے نوابین اودھ نے اس وسیع وعریض قبرستان کے علاق

مولف کی نگاہ سے نہیں گزرا اور نا ہی یہ معلوم ہو سکا کہ ان تینوں قبروں میں بخشی بابا کی قبر کونسی
ہے؟ لیکن اس علاقہ کے باشندے بتلاتے ہیں کہ جو قبر درمیان میں ہے اسی کے بارے میں
سنتے چلے آئے ہیں کہ یہ بخشی بابا کی قبر ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ماہ شعبان کی تیرہ تاریخ کو لوگ
کرتے ہیں جس میں مراسم عرس کے بعد قوالیوں اور تقریروں کا پروگرام بھی ہوتا ہے۔
گنبد بخشی بابا کی عظمت و شوکت کو دیکھکر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ کسی صاحب اقتدار شخصیت کی دائمی
آرامگاہ نہ ہو (واللہ اعلم بالصواب) — مولف۔

جو ایک گنجان اور دشوار گذار جنگل کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا، اپنی تفریح کے لئے "شکار گاہ" بنالیا تھا۔ یہ سارا علاقہ نوابین اودھ کے عہد میں شکار گاہ کے نام سے منسوب تھا۔

گنبد بخشی بابا سے پھر اُسی راستہ سے واپس، یعنی گنج چورا بار آئیے اور فیض آباد جانے والی روڈ پر پورب کیطرف چلئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی بائیں ہاتھ پر آئی ٹی آئی کالج کی چہار دیواری (Boundary) ملے گی۔ کالج کے مغربی گیٹ سے تمام چہار دیواری کو پار کیجئے۔ (یہ عام راستہ نہیں ہے اصل راستہ مذکورہ کالج کی چہار دیواری کے کنارے سے جاتا ہے — مولف) تو سامنے ہی جنگی شہید کا قبرستان نظر آئے گا

جنگی شہید

اس قبرستان میں پہنچنے کے بعد سامنے ہی ایک قدیم آم اور پیپل کا درخت اور ایک قناتی مسجد نظر آئے گی جس کے صحن میں کسی صاحب تصرف شہید مرد کی قبر ہے جنھیں لوگ جنگی شہید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جنگی شہید کا علاقہ دریائے گھاگھرا کے کنارے پر واقع ہے۔ اسوقت جنگی شہید کا مزار اور قناتی مسجد دریا کے کرارہ پر ہی واقع ہیں۔

---

۱۰۰ - ابھی حال ہی میں صوبائی محکمہ آثار قدیمہ نے اسکو اپنی نگرانی اور تحفظ میں لے لیا ہے۔ مولف

۱۰۱ - مسلمانوں کی قبریں اتر دکھن ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ان کے برعکس ہیں۔ مولف۔

عجیب قبریں

جنگی شہید کے علاقہ کے قبرستان میں آج کل تقریباً آٹھ سو پختہ اور ایکہزار کچی قبریں ہیں۔ اس علاقہ میں پانچ پختہ قبریں ایسی ہیں جو شمالاً و جنوباً ہونے کے بجائے پورب پچھم ہیں[۱۰۱]۔ یہ تمام قبریں ایک ہی زمانہ کی اور ایک ہی کاریگر کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی قبر جو پورب پچھم بنی ہوئی ہے وہ جنگی شہید کے مزار کے پیچھے اُتّر کی طرف ہے دوسری قبر جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ایک سو پچاس میٹر کی دوری پر دکھن جانب بنی ہوئی ہے۔ تیسری قبر جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ڈھائی سو میٹر دوری پر پورب کی طرف ہے۔ چوتھی قبر، تیسری قبر کے تقریباً ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر بنی ہوئی ہے اس چوتھی قبر کے دکھن اور پچھم کے کونے پر تقریباً ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر ایک کنویں کے پورب جانب پانچویں قبر ہے[۱۰۲]۔

ان پانچوں فرضی قبروں یا مصنوعی قبروں کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی زمانہ میں اسی طرح رخ دیکر بنائی گئی ہیں۔ ان قبروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان پر کچھ "نشانات" بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نشانات اس قدر غیر واضح اور مبہم ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے نہ ان سے کسی "راز" کے آشکارا ہونے کی امید کیجا سکتی ہے اور نہ ان سے کوئی رہنمائی ہی مل سکتی ہے۔

---

۱۰۲ یہ کنواں اور قبر مسٹر منیر احمد قریشی ساکن مغل پورہ فیض آباد کے ملوکہ باغ کے اندر واقع ہے — مولف

تحریریانشانات

ان قبروں پر بنے ہوئے مبہم نشانات یا علامات کو خواہ مخواہ کسی زبان کی تحریر تسلیم کرنا یا کرانا ایک انتہائی گمراہ کن بات ہے۔ یہ نشانات یا علامات جنھیں "کسی زبان" کی عبارت یا کسی راز کی کلیدی علامات بیان کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل سیکڑوں سال کی بارش اور موسم کی گرمی و سردی کے مسلسل اثرات کا نتیجہ ہیں جو "تجریدی آرٹ" کی شکل میں عموماً چونہ کے کہنہ پلاسٹروں پر کسی بھی پرانی عمارت میں اور کہیں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سونے کے سکوں کا دفینہ

جب سے صوبائی محکمۂ آثار قدیمہ نے مرکزی محکمۂ آثار قدیمہ کی اجازت سے دوسری 'مصنوعی قبر کی کھدائی کروایا ہے (جو جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ایک سو پچاس میٹر دکھن اور آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج کی شمالی چہار دیواری سے تقریباً دس میٹر اتر جانب ہے۔) اُسوقت سے ان قبروں سے متعلق بے شمار نام نہاد مستند اور معتبر یا سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات سننے میں آرہی ہیں۔ آج ان قبروں کا تعلق نواب آصف الدولہ

۱۰۳۔ کھدائی کا کام ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء سے صوبائی محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رام چندر سنگھ کی قیادت اور ڈاکٹر راجا رام پال کی نگرانی میں شروع ہوا تھا ——— مولف۔

۱۰۴۔ اگر رانی کٹھی کی جگہ قاسم علیخاں عالیجاہ، ناظم بنگالہ کا نام دیدیا جاتا تو ممکن ہے کہ بت

مرحوم کے اس مدفون خزانہ سے جوڑا جا رہا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسمیں آٹھ
کروڑ سونے کا سکہ دفن ہے۔ اکثر اخبارات اور رسائل میں بھی اس کی تائید میں
مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

اکثر مضامین اور خبروں میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ بائیس کروڑ سونے کے
سکوں کا یہ عظیم الشان خزانہ، نواب شجاع الدولہ مرحوم نے رانی کھیٹی سے حاصل
کیا تھا۔ پہلے یہ خزانہ "خورد محل" میں رکھا ہوا تھا۔ نواب شجاع الدولہ اور انکے
خاندان کے لوگوں نے چودہ کروڑ سونے کا سکہ خرچ کر ڈالا تھا لیکن آٹھ کروڑ سونے کے سکے کا خز
نواب موصوف کی بیوی "بہو بیگم" صاحبہ نے انگریزوں کے ڈر سے "شکار گاہ" میں
دفن کرا دیا تھا۔ یہ قبریں جو پورب پچھم کے رخ پر بنی ہوئی ہیں (جنھیں آئندہ مصنوعی
قبروں کے نام سے ذکر کیا جائے گا) مدفون خزانہ کی جگہ متعین کرنے کے لئے "کلید
راز" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قبروں پر عربی یا فارسی میں "کچھ" لکھا ہوا ہے اور اس قدر
مبہم ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ نواب شجاع الدولہ کا الف لیلوی خزانہ شکار گاہ میں د
ہے۔ جو جنگی شہید کے مزار کا علاقہ ہے۔

سے لوگ یقین کر لیتے کیونکہ نواب شجاع الدولہ نے عالیجاہ کے سارے زر و جواہر اور قیمتی ساز و سامان
جو کثیر مقدار و تعداد میں تھے اور جسے عالیجاہ نے امانتاً نواب موصوف کے پاس رکھ دیا تھا، ضبط کر لیا
اور اسمیں سے ایک تنکا تک نہیں دیا۔ مولف

۱۰۵۔ شاہی خزانے کی تلاش از برج نند سہائے۔

...نہ کا راز کھل گیا

نواب شجاع الدولہ کے اس الف لیلوی خزانے کا افشائے راز، لکھنؤ کے مرزا ...ں بیگ نامی ایک شخص کے ذریعہ ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو انکے پرانے ...غذات میں ۱۹۰۷ء میں ایک ٹوٹی ہوئی تانبہ کی تختی ملی تھی جو نو انچ لمبی اور بیس ...چوڑی تھی۔ جسپر فارسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ مرزا یونس بیگ نے تانبہ کی ...ختی کو اپنے بہت سے دوستوں اور شناسا لوگوں سے پڑھوانے کی کوشش کیا ...کی اس کوشش نے "خزانہ کا راز" بہتوں پر ظاہر کر دیا اسطرح لوگ آٹھ ...وڑ سونے کے سکے کی رقم کی موجودگی سے واقف ہو گئے۔

...۱۹۷۵ کی ایمرجنسی میں

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے پہلے دور اقتدار میں ۱۹۷۵ء ملک میں ...امی حالات کا قانون نافذ ہوا اور ڈی آئی آر و میسا کے قوانین اندھے کے ہاتھ کی ...ی کیطرح استعمال ہونے لگے۔ ہر صاحب اقتدار حاکم، مطلق العنان حکمراں بن بیٹھا ...انہیں دنوں محکمۂ انکم ٹیکس کے اعلیٰ حکام نے، جنکے کانوں میں مرزا یونس بیگ ...تانبے کی تختی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ فوراً متحرک ہو گئے۔ لکھنؤ کے انکم ٹیکس افسر ...سٹر ایس کے لال نے انکم ٹیکس کے آفیسر مسٹر کے پی ٹنڈن کی قیادت میں مرزا یونس ...ب کے مکان پر چھاپا مارا۔ مرزا صاحب نے تانبہ کی اس ٹوٹی ہوئی تختی کو انکم ٹیکس ...سر کے حوالہ کر دیا۔

خزانہ کی سرکاری تلاش

مرزا یونس بیگ سے تانبہ کی مذکرہ بالا تختی مل جانے کے بعد محکمہ جاتی طو
خزانہ برآمد کرنے لئے خط و کتابت ہوتی رہی۔ آخر ۲۵ر فروری ۱۹۷۹ء سے صوبائی مح
آثار قدیمہ نے کھدائی کا کام شروع کیا جو ۲۷ر مارچ ۱۹۷۹ء تک چلتا رہا۔ سرکا
اطلاعات کے بموجب اس مصنوعی قبر سے نہ تو نواب شجاع الدولہ مرحوم کا آٹھ کرو
سونے کے سکے کا خزانہ ملا اور نہ کوئی ایسی رہنمائی حاصل ہو سکی جس سے دفینہ کے محل و
کا پتہ مل سکتا۔ البتہ کھدائی کے دوران کچھ پرانی اینٹیں ضرور ملیں جو دو ہزار سال پرا
بتائی جاتی ہیں۔

نواب شجاع الدولہ کے اس الف لیلوی خزانے کا راز جاننے والے اب
زیادہ لوگ "معتبر جانکار" کی حیثیت سے لیکن آئے ہیں کہ بقول مسٹر سہائے (برج
"افشائے راز کی حقیقت سے شاہی خزانے کا راز اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ محکمہ آ
قدیمہ کے حکام کو خزانہ پا لینے کا یقین ہے پریس اطلاعات کے بموجب سرمایہ کی کمی
وجہ سے مزید کھدائی کا کام فی الحال بند کر دیا گیا ہے۔"

یہ ہے "شکارگاہ" میں واقع جنگی شہدا کے مزاروں کے علاقہ کی موجودہ حیثیت
اس کھدائی میں خزانہ کے برآمد نہ ہونے کی سرکاری اطلاع پر جتنی منہ اتنی بات کی مثا
صادق آتی ہے۔ اجودھیا اور فیض آباد کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد (خصوص
مسلمانوں میں شیعہ حضرات کی) یہ بات تسلیم کرنے کیلئے قطعی تیار نہیں کہ اس کھدا

دفینہ" برآمد نہیں ہوا۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ کھدائی میں دفینہ برآمد ہوا تھا جسے راتوں
ٹرکوں اور جیپوں کے ذریعہ ہٹا دیا گیا۔ اور حکام نے یہ اعلان کر دیا کہ کھدائی میں
زانہ برآمد نہیں ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خزانہ تو نہیں ملا، یہ سچ ہے لیکن خزانہ کا راز اس
ھدائی سے ضرور مل گیا ہے۔ آئندہ کسی وقت حکومت چپکے سے اس خزانہ کو نکلوا لے
ں —— اب کس سر پھرے کو پڑی ہے کہ وہ ہر کسی کا منہ پکڑتا پھرے!

وٹ جو سچ پر بھاری رہا

چونکہ خزانہ نواب شجاع الدولہ سے منسوب ہے، اس لئے عوام تو عوام، خواص
ل علم کی ایک بڑی تعداد بھی بلا تحقیق، حقائق سے آنکھیں پھیر کر، اس سفید
ٹ کو درست تسلیم کر لیا اور نقد و تبصرہ سے بھی گریزاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
کی موجودگی کی تائید میں بہت سی بے سروپا داستانیں وسط ۱۹۷۹ء کے تین مہینوں
ل ۱۹۷۹ء لغایۃ جون ۱۹۷۹ میں اخبارات و رسائل کے صفحات پر "دستاویزی
ت" سے بکھیر دی گئیں اور لوگ اس سفید جھوٹ کی سیاہی سے اس قدر
ب و خائف ہو گئے کہ حقیقت و صداقت کی تلاش کا تصور بھی محال ہو گیا۔

ہم نہیں جانتے کہ مرعوبیت کے اصل اسباب و عوامل کیا ہیں؟ نواب
شجاع الدولہ مرحوم کا بارعب اسم گرامی یا سونے کے سکوں کی کثرت و تعداد؟
اس عوامی خیال سے اتفاق ہے کہ فیض آباد کی زمین کے شکم میں نوابین، امراء
ا و اکثر بیگمات کے زر و جواہر کا کچھ نہ کچھ حصہ یقیناً مدفون ہے لیکن ضرورت
فشائے راز کی ہے کہ کس نواب، امیر، رئیس یا بیگم و محل کی، فیض آباد کے کس

محلہ اور مکان میں رہائش تھی اور اس وقت حالات کے تحت کون سی جگہ اُن کی نگاہ میں "محفوظ جگہ تھی، جہاں پر کہ انہیں اپنی دولت دفن کرنے میں کسی طرح کا کوئی امکانی خطرہ نہیں تھا؟

کمپنی سرکار کا نواب شجاع الدولہ پر روز بروز بڑھتا ہوا دباؤ، امور سلطنت میں بے جا دخل در معقولات اور مملکت اودھ میں کمپنی سرکار کے مفاد کی فوقیت نواب کی متعدد اخلاقی اور کردار کی کمزوریوں سے بیجا فائدہ اٹھاتے رہنے کا معمول، نیز حدود سلطنت میں کمپنی سرکار کی مسلسل ریشہ دوانیوں نے جوابتری کے حالات اودھ میں پیدا کر دیئے تھے، اُن کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ امکان قطعی بعید از قیاس نہیں کہ دوراندیش اصحاب اور بیگمات و محلات نے اپنی فاضل دولت اور زیورات و جواہرات کو لُٹ جانے کے امکانی اندیشہ اور کمپنی سرکار کے محافظ ڈاکوؤں کے چھین لینے کے خوف سے زیر زمین، کسی 'محفوظ جگہ' پر دفن کر دیا ہو۔

صوبہ اودھ اور خصوصاً فیض آباد کے سیاسی و ملکی حالات کے نشیب و فراز اور خود دار الخلافہ کی تبدیلی اور اچانک نقل مکانی سے پیدا شدہ غیر یقینی حالات نے بہت سے لوگوں کو ان کی زیر زمین مدفون دولت کو باہر نکالنے کا موقع ہی نہ دیا ہو، اور وہ دولت آج تک زیر زمین "دفینہ" کی حیثیت سے زمین کے شکم میں محفوظ ہو۔

افواہ سے حقیقت تک

ان محدود صفحات میں، نواب شجاع الدولہ کے اس الف لیلوی خزانہ کی اصل و حقیقت کا تفصیلی جائزہ لینا ناممکن ہے اور ہمارے موضوع سے علی

بھی ہے۔

بات چونکہ جنگی شہید کے مزار کے قبرستان سے متعلق ہے اس لیے اس خزانہ کی اصل و حقیقت کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی، تاریخ کی ناقابل تردید حقائق کی ٹھوس بنیادوں پر، ایک ذمہ دارانہ فرض ہے۔ ہمیں اس بات پر بڑی کوفت ہوئی ہے کہ عوام وخواص نے بلا تحقیق و تصدیق مدفون خزانہ کی افواہ کو درست اور خزانہ کی موجودگی کو حقیقت سمجھ لیا۔

اور سچ کیا ہے

آیئے جانبدارانہ اور متعصبانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے سنجیدگی و متانت کے ساتھ اودھ کی مستند تاریخ کتب سے کم از کم یہ تو معلوم کریں کہ بائیس یا آٹھ کروڑ سونے کے سکے کا خزانہ کبھی نواب شجاع الدولہ یا ان کے پدر بزرگوار نواب ابو المنصور صفدر جنگ کے پاس تھا بھی؟ اگر تھا تو کیا حقیقتاً اس کی حیثیت کسی ایسے محفوظ سرمایہ RESERVED FUND جیسی تھی جو کسی آڑے اور برے وقت میں بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا؟ اور کیا واقعی نواب شجاع الدولہ کی بیوی "بہو بیگم" صاحبہ نے نواب کی وفات کے بعد، انگریزوں کے لوٹ لینے کے خوف سے کسی محفوظ مقام، پر دفن کرا دیا تھا؟

جب ہم نوابین سلطنت اودھ کی مستند تواریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے پاس بائیس یا آٹھ کروڑ سونے کا سکہ ہونا تو بڑی دور کی بات ہے۔ آٹھ لاکھ تانبے کا سکہ بھی شاہی خزانہ میں نہیں تھا۔

بکسر کی جنگ ۱۷۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس میں نواب شجاع الدولہ کو زبردست
شکست ہوئی تھی[106]۔ اس جنگ کے اخراجات نے نواب موصوف کے شاہی خزانہ
کو خالی کردیا تھا کیونکہ پچاس لاکھ روپیہ کے تاوان جنگ کی فراہمی کے لئے نواب
موصوف نے اپنوں اور پرایوں سب سے کہا تھا مگر اس روز سیاہ میں سب ہی منہ موڑ
گئے۔ کسی نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ اس آڑے وقت میں انکی بیاہتا بیوی امتہ الزہرہ
(بہو بیگم صاحبہ) نے اپنا تمام نقد روپیہ، جڑاؤ زیور حتیٰ کہ ناک کی نتھ تک نواب کے
حوالہ کردیا تھا جسے فروخت کرکے نواب نے تاوان جنگ ادا کیا[107]۔
جب نواب شجاع الدولہ کے شاہی خزانہ کی یہ حالت رہی ہو تو پھر بائیس کروڑ سونے
کا سکہ دفن کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ شیخ تصدق حسین نے لکھا ہے
بکسر کی جنگ کے تاوانِ جنگ کی ادائیگی نے "بہو بیگم" صاحبہ کو قلاش بنا دیا تھا۔"اس
صورت حال کے تحت بہو بیگم صاحبہ کا اتنا عظیم الشان خزانہ دفن کرانا بعید از و
وگمان ہے۔ اور اتنا بڑا جھوٹ ہے جو نہ زمین میں سما سکتا ہے اور نہ آسمان میں۔

۱۰۶۔ بکسر کی جنگ میں نواب شجاع الدولہ نے ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ ہجری مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء بروز
شنبہ انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھایا تھا۔ Oriental Biographical Dictionary
Page 259 By T. W. Beale.

۱۰۷۔ تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۳۵۔ انوپ گیر اور امراؤ گیر گوسائیں جو نواب شجاع الدولہ کے بڑے چہیتے
اور معتمد تھے، بکسر کی جنگ کے بعد، جب نواب کا آفتاب اقبال گہنا گیا تھا۔ اس برے وقت میں یہ دونوں
بھائی ان کا ساتھ چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ (تاریخ اودھ ملخص صفحہ ۲۷۹)

بکسر کی جنگ کا اثر

نواب شجاع الدولہ نے اپنے پدر بزرگوار نواب ابو المنصور صفدر جنگ کے مقبرہ کی تعمیر اور فیض آباد میں نئی پختہ و خام عمارات کی تعمیر نیز اپنی جنسی بے راہ روی میں، اپنے باپ نواب صفدر جنگ کا شاہی خزانہ تو پہلے ہی خالی کر چکے تھے۔ رہی سہی کسر بکسر کی جنگ کے تاوانِ جنگ کی ادائیگی نے پوری کر دیا تھا

شجاع الدولہ نواب تھے

اس "الف لیلوی خزانہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے رانی کھٹی سے حاصل کیا تھا۔ یہ بات ۱۷۵۸ء اور ۱۷۶۰ء کے درمیان کی ہے اودھ کی کسی تاریخی کتاب میں اس "حیثیت" کی رانی کھٹی کا ذکر نہیں ملتا۔ چند پرگنا جات پر تصرف رکھنے والی ایک عورت کا اس حیثیت میں پیش کرنا، ناقابل عفو خیانت ہے جس سے بے جا تعصب کی بو آتی ہے۔

اگر فاضل محققین اور معتبر دانندہ اسرار حضرات کی دلجوئی کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ سونے کا یہ عظیم الشان خزانہ نواب شجاع الدولہ نے رانی کھٹی سے حاصل کیا تھا تو ذہن میں ابھرنے والے ان سوالوں کو کس جواب سے مطمئن کیا جا سکے گا کہ اتنا بڑا خزانہ رکھنے کے باوجود نواب شجاع الدولہ نے بکسر کی جنگ کا تاوان جنگ ادا کرنے کے لئے اپنوں اور پرایوں سے قرض مانگ کر اپنی غیرت و حمیت کو مجروح کیوں کیا؟ اپنی پیاری بیوی (بہو بیگم صاحبہ) کی ناک کی نتھ تک فروخت کر دینے کی ذلت کو کیوں برداشت کیا؟ کیا نواب شجاع الدولہ نواب سے

زیادہ "بڑے بنیا" تھے کہ چمڑی چلی جائے مگر دمڑی نہ جانے پائے!

کیوں ہماری صاف گوئی سے قیامت ہو بپا

محفل یاراں سلامت ہم تو اپنے گھر چلے

۶ جون ۱۷۹۶ء کو جب نواب شجاع الدولہ کی والدہ نواب صدر جہان بیگم (نواب بیگم) صاحبہ کا تقریباً اٹھاسی[۹۸] سال کی عمر میں انتقال ہوا تو دس پندرہ لاکھ روپے سے زیادہ کا اثاثہ ان کے یہاں سے برآمد نہیں ہوا[۱۰۸]۔ حالانکہ نواب شجاع الدولہ کے اکلوتے بیٹے نواب آصف الدولہ بھی یہی یقین رکھتے تھے کہ انکی دادی کے پاس قارونی خزانہ موجود ہے[۱۰۹]۔ لیکن نواب بیگم صاحبہ کے مرنے کے بعد جو حقیقت سامنے آئی وہ بالکل برعکس تھی۔ نواب آصف الدولہ کی توقعات اور امید و نکلے بالکل خلاف

چونکہ اودھ اور نوابین و بیگمات اودھ سے متعلق کسی مستند معلومہ کتاب سے نواب شجاع الدولہ کی بیوی (بہو بیگم) صاحبہ کے پاس کوئی عظیم الشان خزانہ ہونا ثابت نہیں ہے[۱۱۰]۔ اس لئے "شکار گاہ" یا اور کسی جگہ پر نواب موصوف کا خزانہ

۱۰۸۔ تاریخ اودھ جلد سوم

۱۰۹۔ تاریخ بیگمات اودھ۔ در بیان "نواب صدر جہاں بیگم"

۱۱۰۔ تاریخ اودھ مولفہ حکیم مولوی نجم الغنی رامپوری ۲۔ تفضیح الغافلین مترجمہ سٹر ولیم ہوئے۔ ۳۔ گزشتہ لکھنؤ، از مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی ۴۔ عماد السعادت از سید غلام علی نقوی ۵۔ قیصر التوار[یخ] از کمال الدین حیدر ۶۔ تاریخ فرح بخش از مولوی محمد فیض بخش کاکوروی ۷۔ افضل التواریخ از منشی رام سہ[ائے] تمنا۔ ۸۔ تاریخ اودھ ملخص مرتبہ ذکی کاکوروی ۹۔ بیگمات اودھ از شیخ تصدق حسین۔ ۱۰۔ وقائع دل[پذیر] از عبدالاحد رابط ۱۱۔ احوال و واقعات از مولوی حکیم فدا حسین قلمی۔ ۱۲۔ فسانۂ عبرت از مرزا رجب

ن ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو لوگ نواب شجاع الدولہ کے پاس خزانہ
ونے اور دفن کرنے کی بات کرتے ہیں یا اس پر یقین رکھتے ہیں وہ مضحکہ خیز ہے —
— البتہ ہوٹلوں اور چائے خانوں میں بیٹھ کر وقت گذاری کرنے کا ایک
بہترین اور دلچسپ موضوع ضرور ہے۔

جستجو بعد میں بھی غیروں کی ہو سکتی ہے
پہلے اس بھیڑ میں اپنے کو تو پاؤ لوگو

راجا گاجا شہید

جنگی شہید کے قبرستان سے پورب جانب یعنی آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج سے پورب
ود کے باغوں میں راجا گاجا شہید کے نام سے دو قبریں مشہور ہیں جو نہایت
یم ہیں اور ایک بلند چبوترہ پر اب تک موجود ہیں۔ زمانہ ماضی میں یہاں آموں کا ایک
ت گھنا باغ تھا جو خودرو جھاڑیوں کی وجہ سے مہیب جنگل بن گیا تھا —

موجودہ چبوترہ کی طرز تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ سات سو سال سے کم پرانا نہیں
ہے۔ ۱۸۵۵ء تک یہ دونوں قبریں ایک بہت بڑے آم کے درخت کے نیچے تھیں لیکن
ب اس جگہ کوئی نیا یا پرانا درخت نہیں ہے۔ باوجودیکہ آج بھی یہ علاقہ جنگل کی طرح ہے لیکن
نا پر ایک عجیب سی خاموشی اور رعب سا طاری محسوس ہوتا ہے۔ اکثر اہل حاجت جمعرات

ب سرور ۱۳۔ حافظ رحمت خاں از مسٹر الطاف بریلوی ۱۴۔ بادشاہ بیگم اودھ محمود احمد عباسی۔
۔ تاریخ آصفی اردو ۱۶۔ دی فرسٹ ٹو نوابس آف اودھ از ڈاکٹر آشیروادی لال شریواستو۔ ۱۷۔ گل رعنا
عبد الحئی ۱۸۔ دبستان لکھنو از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۹۔ سفرنامہ کرنل سلیمن وغیرہ وغیرہ۔

کے دن خصوصی طور پر ان شہیدوں کے مزارات پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور تکمیل مر
کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان شہدا کی برکت سے دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں
راجا گاجا شہیدوں کے متعلق کسی کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یہ کون لوگ
اور کس زمانہ میں تھے؟ ان کا سلسلہ کیا تھا؟ اور کیوں شہید ہوئے؟ کچھ لوگوں کا کہنا
کہ یہ سید سالار مسعود غازی (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ کے شہدا ہیں جنھوں نے آپ کے ج
میں جام شہادت نوش فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سید سالار مسعود غازیؒ کے زمانہ کے شہدا

موجودہ آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج کے اندر اور اس کے ارد گرد چہار طرف جو فیض آبا
اجودھیا روڈ کے دکھن جانب قبرستان ہے اُسے یہاں کے عوام زمانہ دراز سے
سالار مسعود غازی (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ کے ان شہیدوں کے مزارات بتلاتے
جو جہاد میں کام آئے تھے۔

متذکرہ سڑک کے دکھن جانب محمد اسلام انصاری کے مکان سے ملے ہو
ایک چبوترہ پر زمانہ قدیم کی تین قبریں موجود ہیں۔ ان کے متعلق بھی لوگ یہی بتلاتے
حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے زمانہ کے شہدا ہیں۔ مولوی عبد الغفار انصاری
سابق پیش امام جامع مسجد بابری (اجودھیا) نے بھی ان قبور کو سید سالار مسعود غا
کے زمانہ کے جہاد میں شہید ہونے والے مجاہدین کی قبریں بتاتے ہیں۔ مولوی صا
کی عادت ہے کہ وہ معمولی باتوں کو اس قدر اہمیت دیکر بیان کرنے کی کوشش
ہیں کہ "بات" سے زیادہ ان کی اپنی شخصیت کی اہمیت کا گوشہ نمایاں ہو جائے

موصوف نے یہاں بھی سنی سنائی "کتھاؤں" کو دستاویزی حیثیت سے پیش کرنے کی بے سود کوشش کیا ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ یہ بتلاتے کہ ان قبروں کو پختہ کرنے کی ضرورت اس وقت عوام کو کیوں پڑی۔ مجاہدین کے عزیز و اقارب یا احباب تو یہاں پر تھے نہیں، یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ مجاہدین نے فقط اللہ کی تمنا و خوشنودی کے حصول کے لئے اسکی راہ میں جام شہادت نوش کیا تھا اور ان کی تعداد بھی ایک دو میں نہیں ہزاروں میں رہی۔ یقیناً ان کی ایک بڑی تعداد گلِ در گل، گنجِ شہدا کے طور پر دفن کی گئی ہو گی۔ جہاد میں شہید ہونے والے ہر شہید کے لئے ایک قبر، وہ بھی پختہ و بیل بوٹے سے آراستہ و پیراستہ، بنانے کی کس کو فرصت تھی؟

اگر چند قبریں پختہ اور نمایاں ہوں تو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہ مجاہدین کے لشکر میں کسی عہدہ پر رہے ہوں گے اور بعد کے لوگوں نے انکی قبروں کو پختہ کر دا کر اپنے جذبۂ عقیدت کے تحت انکی یادگار باقی رکھنا چاہا ہو گا لیکن اتنی کثیر تعداد میں آج بھی اس علاقہ میں پختہ قبریں موجود ہیں کہ تمام قبروں کو سید سالار مسعود غازیؒ کے مجاہدین کی قبریں تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔

آئی ٹی آئی۔ کالج کے مشرقی پھاٹک کے دکھن جانب ڈھال پر، امرود کے باغوں کے درمیان پتھر کے ایک بورڈ پر "مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ روڈ" اردو اور انگریزی میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ اس راستہ پر آگے دکھن جانب، امرود کے باغوں میں بہت سی قدیم پختہ قبریں بوسیدہ اور شکستہ حالت میں اکثر چبوترں پر اور بہت سی ادھر ادھر کھیتوں اور امرود کے باغوں کے اندر نظر آئیں گی۔ اس راستہ پر تقریباً دو ڈھائی سو میٹر دکھن جانب چلنے کے بعد ریلوے لائن کا پھاٹک نظر آئے گا۔

جو عموماً حادثات سے بچنے کے پیش نظر بند رہا کرتا ہے۔ پھاٹک کے کنارے ریلوے لائن پار کرنے کے بعد "بڑی بوا صاحبہ" کے نام سے منسوب قبرستان کے علاقہ میں آپ آجائیں گے۔

ریلوے لائن پار کرنے کے بعد ایک راستہ کھیتوں سے ہوتا ہوا سید ھا شاہجہاں پور نامی محلہ کو چلا جاتا ہے۔ دوسرا راستہ جو ریلوے لائن سے تقریباً دس بارہ میٹر سیدھا دکھن جانب جانے کے بعد پورب جانب یعنی بائیں ہاتھ کو مڑ جاتا ہے اس راستہ پر تقریباً تیس میٹر چلنے کے بعد "مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ" کی عظیم الشان عمارت ملے گی۔ اس عمارت کا صدر دروازہ پورب کی طرف ہے جس کے سامنے ہی حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی درگاہ ہے۔ مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے صدر دروازہ پر بانیان یتیم خانہ کا نام ایک سنگ مرمر کے پتھر پر کندہ ہے۔

چاہِ صحت

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی عمارت کے شمالی کونے پر یعنی چہار دیواری متصل برج کے قریب ۱۹۴۰ء تک ایک پختہ کنواں موجود تھا جو عوام میں چاہ صحت کے نام سے مشہور تھا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی برکت سے اس کنویں کے پانی میں شفائی تاثیر ہے۔ لوگ اکثر کہنہ امراض کے مریضوں اور آسیب زدہ لوگوں کو پلانے کے لئے اس کنویں کے پانی لے جایا کرتے تھے۔

مسلم یتیم خانہ کے ارباب حل و عقد نے بچوں کی حفاظت اور امکانی خطرات سے حفاظت کے پیش نظر اس کنویں کو پٹوا دیا ہے لیکن کنویں کی پختہ اینٹوں کی

ائی کا نشان ابھی تک موجود ہے۔

جی اقبال خواجہ سرا کا مقبرہ

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ، حاجی اقبال خواجہ سرا کی وسیع و عریض چہار دیواری
ے اندر واقع ہے وسیع و عریض چہار دیواری کے اندر، وسط صحن میں حاجی اقبال خواجہ سرا
کا پر تکلف اور عالی شان مقبرہ بنا ہوا ہے[1]۔ اب مقبرہ کے اندر جانے کا راستہ دکھن جانب
ہے[1]۔ یہ مقبرہ چوبیس محرابوں اور آٹھ گنبدوں کے درمیان ایک بڑے گنبد کے ساتھ
بنا ہوا ہے اور فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مقبرہ کے اندر اسوقت تین قبریں
ہیں جن میں بیچ والی قبر حاجی اقبال خواجہ سرا کی ہے۔ گم گشتہ حالات اجودھیا کے
حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے مزار پر لگے ہوئے سنگی کتبہ پر یہ
عبارت کندہ ہے[2]۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

---

[1] تاریخ گم شدہ حالات اجودھیا صفحہ ۲۔ [2] مولوی عبد الغفار صاحب نے لکھا ہے کہ حاجی اقبال
خواجہ سرا نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے محترم امراء میں سے تھے جو بالکل غلط ہے۔ نواب سعادت
علی خاں کا زمانۂ حکومت ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) لغایۃ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) ہے اگر مولوی صاحب
نے بزرگ کسی اسکول میں پڑھنے والے سے معلوم کرتے تو وہ انہیں بتا دیتا کہ یہ سن نواب شجاع الدولہ کے
دور حکومت کا ہے۔ اس لئے حاجی اقبال خواجہ سرا نواب سعادت علی کے امراء میں ہو ہی نہیں سکتے۔

تاریخ وفات خان مغفرت نشان حاجی اقبال فی شہر ذی قعدہ ۱۱۷۴ ہجری
تقریباً ڈیڑھ سو برس تک یہ مقبرہ بغیر نگہداشت و توجہ اس جنگل میں
پڑا رہا۔ انہیں ایام میں شرارتاً کسی نے کتبہ کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اُسوقت سے اب تک
مزار بے کتبہ ہے۔

مقبرہ کی تعمیر سطح زمین سے تقریباً تین میٹر کی بلندی پر ہے سابقہ چہار دیوا
سے ملا کر اب ہر طرف کمرے اور اس کے سامنے دالان بنا دیے گئے ہیں جو یتیم خانہ
بچوں کے ہاسٹل اور درسگاہوں کے مصرف میں ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں ایک ادارہ

حاجی اقبال خواجہ سرا نواب شجاع الدولہ کے عہد میں معتبر امرا میں سے تھے۔ مولف

۱۱۲۔ زمانہ ماضی میں حاجی اقبال خواجہ سرا کا یہ مقبرہ ہر چہار جانب سے کھلا ہوا تھا جسکے ہر جانب
اور گوشوں سے قبریں نظر آتی تھیں لیکن یتیم خانہ بن جانے کے بعد ہر چہار جانب کی محرابوں اور
گوشوں کو بند کر کے کوٹھریاں بنا دی گئی ہیں اور دکھن جانب کی ایک محراب میں دروازہ لگا
گیا ہے جس سے مقبرہ کے وسطی حصہ میں جہاں پر قبریں ہیں، اس دروازہ سے جایا جاتا ہے۔ مقبرہ
کے اندر صفائی وغیرہ کا اچھا انتظام ہے۔ مولف

۱۱۳۔ اسوقت مقبرہ کے اندر کسی مزار کے سرہانے کوئی کتبہ نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی علامت
نشانی ہی باقی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کتبہ اس قبر کے سرہانے لگا ہوا تھا۔ مقبرہ
اندر کی تینوں قبروں کی ظاہری حالت و حیثیت کو دیکھنے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ بیچ میں
قبر دیگر دو قبروں سے زیادہ نمایاں ہے، اُسی کو حاجی اقبال خواجہ سرا کی قبر ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم
بالصواب ——— مولف

۱۱۴۔ یہ ہنگامہ اجودھیا شہر میں ۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء مطابق ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۵۲ ہجری روز شنبہ کو
——— مولف

س ایک آنہ فنڈ" نے فیض آباد شہر سے چار میل، تقریباً چھ کیلو میٹر پورب
ی اقبال خواجہ سرا کے اس مقبرہ میں ایک اسلامیہ مکتب اور یتیم خانہ قائم کرنے کا
رام مرتب کیا لیکن اس وقت یہاں رہائش اور درسگاہ کا کوئی معقول انتظام
تھا۔

سلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ

اسی سن میں شہر اجودھیا میں ہندو مسلم ہنگامہ ہوا۔ جس میں اکثر
سلمان شہید ہوئے تھے۔ اس ہنگامہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے
رثان کو حکومت برطانیہ کیطرف سے جان کا معاوضہ ملا تھا۔ معاوضہ یا خون بہا
ے والے بعض لوگوں نے معاوضہ کی رقم کو 'مجلس ایک آنہ فنڈ' فیض آباد کو
ید یا اور ۱۹۳۰ء میں اس مسلم یتیم خانہ کی جو پہلی عمارت تعمیر ہوئی تھی وہ اسی حادثہ خوں بہا کی رقم
ے ہوئی تھی۔ یتیم خانہ کی ایک تہائی مغربی اور مکمل جنوبی چہار دیواری کے سہارے جو
عمارت آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ بس اسی خوں بہا کی رقم سے تعمیر
ئی ہے۔ جنوبی درس گاہ پر جو تاریخی قطعات لکھے ہوئے ہیں ان میں سن تعمیر
ے ساتھ اس خوں بہا کی رقم کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اول ہوا جو صرف عمارت پہ روپیہ
وہ تھا اجودھیا کے شہیدوں کا خونبہا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ میں غریب و نادار بچوں کے قیام و طعام اور لباس
علاج معالجہ کے بندوبست کے ساتھ ان کی دینی و دنیوی تعلیم کا بھی مکمل اور باضابطہ

انتظام ہے۔ اٹھارہ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا خرچ یتیم خانہ ہی برداشت
کرتا ہے۔ آج بھی کئی بچے ہائی اسکول، انٹرمیجیٹ اور ڈگری کلاسوں میں زیر تعلیم
ہیں ان کی تعلیمی فیس اور دیگر تمام اخراجات کی کفالت یتیم خانہ ہی کرتا ہے۔

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی مجلس انتظامیہ اور جنرل باڈی میں شہر
فیض آباد کے تقریباً تمام صاحب حیثیت و صاحب علم و نمایاں شخصیتیں ہیں
ان لوگوں کی کوششوں اور تعاون سے یتیم خانہ کی شہرت بیرون ملک تک ہے
کہتے ہیں کہ یتیم خانہ میں پرورش پائے ہوئے بچے آج سعودی عرب، خلیجی ریاستوں
قطر، دوبئی، دوحہ اور ایران و عراق میں اچھے عہدوں پر فائز اور مختلف کاموں
میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

بچوں کی نگہداشت اور ان کی فطرت کے عین مطابق، انکی دلچسپیوں
کا یتیم خانہ کے انچارج عبدالجبار صاحب کو وسیع تجربہ ہے جو انتہائی نظم و ضبط
کے ساتھ بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں

مسلمانوں کے ادبار کے طویل زمانہ کی اس تیرہ و تار رات میں یہ ٹمٹماتی ہوئی مدھم
سی روشنی بھی غنیمت ہے کہ مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ میں داخل بے سہارا
بچوں کو محض مسجد کا موذن اور امام بنانے والی، عام اسلامی مدارس و مکاتب
میں مروجہ تعلیم جیسی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے بلکہ پرانی قدروں کے بوسیدہ
ڈھانچے پر نئی قدروں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے باوقار اور فعال شہری
بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یتیم خانہ میں داخل اور زیر تربیت بچوں کے لئے جو نظام الاوقات اور

ستور العمل اس وقت نافذ العمل ہے وہ جاگیر دارانہ اور برژوائی نظام کے تحت
ج سے سیکڑوں سال پہلے اس وقت بنائے گئے تھے جب سماج پر ان کی
مل گرفت تھی۔ محنت کش عوام کی عزت نفس سے لطف اندوز ہونے کے لئے
اگیر دارانہ نظام نے اتنے منصوبہ بند طریقے اور ذرائع رائج کر رکھے تھے کہ زندگی کا
وئی شعبہ اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جس سے اپنے طبقہ کی امارت کی
ائش کے مواقع نہ ملتے رہے ہوں۔ درس و تدریس کے ادارے تو اس وقت اظہار امارت
ور خود نمائی کے لئے سب سے زیادہ ارزاں اور آسان میڈیا (MEDIA) تھے۔ اس
اگیر دارانہ دور کے غیر سائنٹفک اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محروم اصول و ضابطے
ہد حاضر کے فرد کی ذہنی بیداری اور جوہر نفس کی نشو و نما کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ
ر وکشی کے لئے ان کی مضرت مسلم ہے۔

یتیم خانہ کی مجلس انتظامیہ میں یقیناً کچھ ایسے با صلاحیت دانشور افراد ضرور
وں گے جو جدید علم نفسیات میں فرد کی جوہر ذات کی عظمت اور فرد کی پوشیدہ فطری
لاحیتوں کو بروئے کار لانے کے رموز و اسرار سے واقفیت رکھتے ہوں گے اور انہوں
ے اس اہم گوشہ کے مضمرات پر سنجیدگی و متانت سے غور و فکر بھی کیا ہو گا۔ لیکن
وایات کے خلاف اظہار رائے کے ردِ عمل کی متوقع شورش کی مقابلہ کی جرأت کے
قدان یا مصلحت وقت کے کسی اہم 'تقاضا کے تحت'، "جو کچھ جیسے اور جس طرح بھی
وتا چلا آرہا ہے ٹھیک ہے"۔ کی روائت کو مناسب سمجھ کر شاید خاموش رہنا ہی ٹھیک
مجھا ہو۔

اصلاح حال یقیناً دشوار کام ہے اور دشواریوں سے خوف زدہ ہو جانا، خصوصاً

اسوقت جبکہ ملت کے بے سہارا نونہالوں کے مفاد اور ان کے مستقبل کیلئے
ہو تو زہر قاتل ہے۔ مصلحتِ وقت کے تقاضے تو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات
کے ساتھ لمحہ بلمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت ملت کے
بہی خواہوں پر اصلاح حال کی ذمہ داریاں اور بھی زیادہ اہم اور شدید ہو جاتی ہیں

کچھ اور مقابر

حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کے ساتھ ہی تھوڑے فاصلہ پر اسی
طرزِ تعمیر کے چار مقبرے اور تھے جن میں فی الوقت تین مقبرے انتہائی خستہ اور
منہدم ہو جانے کی حالت میں موجود ہیں۔ ایک مقبرہ تو یتیم خانہ مذکور کی پچھمی دیوار
کے دکھنی کونے پر تقریباً بیس میٹر کے فاصلہ پر کھیتوں میں موجود ہے۔ امید ہے
کہ آنے والے چند سالوں کی بارش اسے زمیں بوس کر دے گی۔ دوسرا مقبرہ
نواب جعفر حسین خاں" وقف باری تعالیٰ" قبرستان در کربلا میں ہے جو نسبتاً بہتر حالت میں ہے کیونکہ
کہ اسکی نگہداشت پر اب توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ مقبرہ فی الوقت امرودوں کے
باغ کے اندر ہے۔ "باغ دار" عموماً مقبرہ کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اس مقبرہ میں
میں دو قبریں ہیں۔ پہلی قبر جو پورب جانب ہے اسپر ایک سرخ پتھر کا کتبہ لگا ہوا ہے اور
عربی خط تحریر کے آخر میں (نیچے)، صاحب قبر کا سن وفات ۱۱۸۳ ہجری کندہ ہے
تیسرا مقبرہ موجودہ آئی ٹی آئی کالج کے پورب، فیض آباد اجودھیا روڈ پر لب سڑک
واقع ہے۔ اور اول الذکر مقبرہ کے مثل خستہ حالت میں ہے۔ لیکن اسے زمیں
بوس ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ کیونکہ یہ مقبرہ یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی انتظامیہ

نگرانی میں ہے۔ اس لئے عام تخریبی سرگرمیوں سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہے وسرے سطح زمین سے بلند مقام پر واقع ہے۔

اس مقبرے میں ایک پختہ قبر اب تک موجود ہے، جسکے سرہانے پر ایک واضح تیر کا ن بنا ہوا ہے، جسکی نوک شمال کیطرف ہے۔ جو مبینہ طور پر ”کوئی اشارہ“ ہے۔

ایسا ہی ”اشارہ“ بنی ایک بوسیدہ اور خستہ قبر گنبد بخشی بابا کے قبرستان میں، اُتر ب کرارہ پر گذشتہ دنوں (جولائی ،،۱۹ء) مولف نے دیکھا تھا جس کے بارے میں ر لوگوں نے تبلایا تھا کہ اب سے تقریباً ساٹھ، ستّر سال کا زمانہ گذرا ہو گا کہ بنجاروں کے ایک قافلہ نے اِس قبر کے نزدیک ہی سے دفینہ نکالا تھا۔ مولف اِس قبر اور مبینہ مقام ینہ کو بغور دیکھنے و سمجھنے کے بعد پیمائش کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ جتنی قبر کی لمبائی تھی ریباً اتنے ہی فاصلہ کے بعد مقام دفینہ تھا۔

اِس تیسرے مقبرے سے چند میٹر کے فاصلہ پورب جانب ایک قدیم مسجد کے قیات اب تک موجود ہیں۔ لوگ اعتماد کے ساتھ تبلاتے ہیں کہ جس وقت صاحب گنج محلہ کے سیٹھ صاحبدین سیتارام جی اپنی اس مقبوضہ اراضی کا احاطہ تعمیر کرا رہے تھے اُس ت مذکورہ بالا مسجد کے صحن کا کچھ مشرقی حصّہ بھی کھدوا دیا تھا۔ اِس کھدائی میں مسجد کے حن کے نیچے اُنہیں سونے اور چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی ایک دیگ ملی تھی (واللہ اعلم صواب) اب بھی مسجد مذکورہ کے صحن تقریباً نصف سے زیادہ باقی بچا ہوا ہے (جو احاطہ باغ سیٹھ صاحبدین سیتارام جی کے اندر اب بھی موجود ہے۔)

اگر مقبرہ سے ملحق مسجد کے صحن سے دفینہ برآمد ہونے کی ”افواہ“ میں کچھ بھی حقیقت ہے تو مقبرہ کے اندر موجود قبر کے اوپر، سرہانے کی طرف مبینہ طور پر تیر کے نشان کو ”بے معنی“

نہیں سمجھا جا سکتا۔ مذکورہ قبر کی لمبائی تقریباً ساڑھے چھ فٹ ہے۔ اس قبر سے سیدھے اُتر جانب، تقریباً اتنے ہی فاصلے کے بعد مقبرہ کی گیلری میں کسی "افشائے راز" کو بعید از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مقبرہ کی پوربی اور دکھنی گیلری کا فرش اُکھڑ چکا ہے۔ اس سے کسی "افشائے راز" کا اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن شمالی گیلری کے فرش میں باوجودیکہ بہت سی دراڑیں پڑ چکی ہیں اور جگہ جگہ سے چٹخ بھی گیا ہے تاہم قدرے بہتر حالت میں ہے۔

شمالی گیلری کا فرش ابتک کیوں خراب نہیں ہوا؟ جبکہ خرابی کے اسباب ہر چہار جانب تقریباً یکساں سے رہے ہیں۔ کیا اس جانب کا فرش کچھ زیادہ مضبوط بنا ہوا تھا؟

مولف کو امید ہے کہ جب کبھی مقبرہ کی شمالی گیلری کا فرش ٹوٹے گا اُس وقت "راز" کی صداقت کھل کر سامنے آجائیگی۔ فی الوقت مولف کے پاس نہ وقت ہے، نہ ذرائع اور وسائل ہیں۔ اور نہ اُس کے تحقیقی مقاصد کا ماحصل "حقیقت" کا اصل فیصلہ مستقبل کے اُن خوش قسمت ہاتھوں کے سپرد ہے جنھیں منشائے قدرت نے اس کیلئے منتخب کیا ہے۔

نوٹ:۔ گذشتہ ۹ ستمبر ۸۳ء کو مولف کے ایک شناسا مسٹر نثار احمد صاحب نے خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ گذشتہ دنوں کچھ لوگوں نے آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج کے پورب جانب لب سڑک واقع مقبرہ کی شمالی گیلری کا فرش توڑ کر کتاب 'شہر اولیاء' میں تحریر صداقت کا راز" معلوم کرنے کی کوشش کیا تھا۔ چونکہ ابھی گڈھا بند نہیں ہے اس لئے آپ بھی آکر دیکھ لیں ـــــ چنانچہ میں نے ۱۱ ستمبر ۸۳ء کو اتوار کے دن نثار احمد، محمد شفیق اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ہمراہ متذکرہ مقبرہ کی شمالی گیلری کے ٹوٹے ہوئے فرش اور گڈھے کو (جو اب مٹی سے بند کر دیا گیا تھا) دیکھا۔ گڈھا قبر سے اتنی دوری پر کھودا گیا تھا جتنی دوری کا اندازہ

ن نے کتاب شہر اولیاء میں کیا تھا۔

چونکہ اسوقت گڑھے کو مٹی سے بند کیا جا چکا تھا۔ اس لئے لوگوں سے اس سے متعلق
تفصیلات معلوم ہوئیں وہ یہ ہے کہ گڑھے کے وسط میں۔ گیلری کے فرش سے تقریباً
ٹ نیچے لوہے کا ایک پائپ لگا ہوا تھا جو تقریباً ایک انچ کی گولائی میں تھا۔ گڑھا کھودنے
ے پائپ کو سنبھال کر گڑھا کھودتے رہے۔ تقریباً ساڑھے چار فٹ کی گہرائی تک کھودنے
بعد پچھم جانب انھیں ایک دروازہ کا اوپری حصّہ نظر آیا۔ کھودنے والے محنت سے
ہٹاتے رہے۔ ابھی ایک ہاتھ سے کم ہی دروازہ معلوم ہونے پایا تھا کہ صبح کے آثار
ار ہوگئے۔ اور سڑک پر لوگوں کی آمدرفت ہوجانے کیوجہ سے لوگ جلدی میں گڑھے
بغیر بند کئے ہوئے ہی وہاں سے ہٹ گئے۔

چونکہ یہ مقبرہ مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی مجلس انتظامیہ کے زیرنگرانی ہے۔ جب
ین کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے آکر گڑھے کو مٹی سے بند کروا دیا۔ اس جگہ کے
بتلاتے ہیں کہ "راز" کی حفاظت کیلئے انتظامیہ نے رات کو رکھوالی کرنے کیلئے ایک شخص
ں کو ملازم رکھ لیا ہے۔ تاکہ کوئی شخص کھدائی نہ کرنے پائے۔

محض لوگوں نے مولف کو یہ بھی بتایا کہ یہ بات اب بہت عام ہوچکی ہے ورنہ
ں منتظمین میں سے کئی لوگوں کے منہ میں پانی آرہا ہے۔

۱۱۸۳ھ ہجری مطابق ۷۰-۱۷۶۹ء۔ یہ مقبرہ بھی نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا
و بھی حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کی طرح یہ بھی نواب وزیر کے کسی امیر یا مقرب کا ہونا چاہیئے۔ بیس
محرابوں اور چار اندرونی محرابوں پر ایک بڑے برج کے ساتھ یہ مقبرہ بنا ہوا ہے اور طرز تعمیر بھی
اجی اقبال کے مقبرہ کے مثل ہے ـــــ مولف

کیا یہ بے معنی ہے

چوتھے مقبرہ کے متعلق اکثر لوگوں نے بتایا کہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ ک
پچھم، اول الذکر مقبرہ کے بالکل سامنے تقریباً تین سو میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔
چوتھے مقبرہ کی جگہ اب کھیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس مقبرہ کے قریب زمانہ
کی جو قدیم مسجد تھی وہ اب خستہ حالت میں موجود ہے۔ کھجوروں اور آموں کے درختو
کے باغ وغیرہ کی موجودگی اور محل وقوع کے اعتبار سے اس کے قریب کہیں "مقب
کا ہونا بے بنیاد بات نہیں معلوم ہوتی۔

آج اس مقام کو کتنا ہی غور وفکر کے ساتھ دیکھا جائے پھر بھی مقبرہ کی جگہ متعی
کرنا قطعی محال ہے کیونکہ جس جگہ یا مقام پر لوگ مقبرہ ہونا بتلاتے ہیں وہ مقام ا
کھیت میں تبدیل ہو گیا ہے اور ارد گرد نہ کہیں ملبہ کا نشان ہے اور نہ ایسے آثار و باقی
ہیں

ان چاروں چھوٹے مقبروں کے بارے میں جو حاجی اقبال خواجہ سرا کے عظیم ال
مقبرہ کے قرب میں ہیں، مولف کو کوئی دستاویزی معلومات نہ حاصل ہو سکیں
تاہم دوسرے مقبرہ کے اندر جو وقف باری تعالیٰ قبرستان کے اندر واقع ہے
کے اندر قبر پر لگے ہوئے سنگی کتبہ کے سن وفات (۱۱۸۳ ھ) کو پیش نظر رکھ
یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ تمام مقبرے حاجی اقبال خواجہ سرا کی موت کے بعد د
امراء نے یا ان کے وارثان نے اپنی دولت و ثروت کے مظاہرہ کے لئے تعمیر کرا

گے کیونکہ حاجی اقبال خواجہ سرا کی وفات کا سن ۴، ۱۱۷۴ھ ماہ ذیقعدہ (یعنی جون
۱۷۶۱ء) ہے۔ اور متذکرہ دوسرے مقبرے میں دفن شخص کا سن وفات ۱۱۸۳ ہجری
دونوں اصحاب کی وفات کے درمیان نو سال کا وقفہ ہے۔

ان مقابر میں کون کون سی شخصیتیں دفن ہیں؟ اس کے متعلق کوئی معلومات
حاصل ہو سکی۔ البتہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے متعلق یہ معلومات ضرور ہو گئی کہ
موصوف نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں ان کے معتمد امرا میں سے تھے
دنیوی جاہ و جلال سے آراستہ و پیراستہ شخصیت تھی۔ سنت والجماعت سے
ہونے کے باوجود مذہب امامیہ کی طرف بظاہر زیادہ رجحان تھا لیکن "کھلے شیعہ"
تھے اور نہ اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

دوسرے چاروں مقابر کے متعلق گمان ہے کہ یہ بھی نواب آصف الدولہ کے
الدولہ کے عہد حکومت کے امرا و رؤسا کے ہی ہوں گے۔ کچھ لوگ عدم واقفیت
انہیں کسی بزرگ دین کے مقابر سمجھتے ہیں لیکن وہ غلطی پر ہیں بہر حال
دوں مقابر کے تعمیر کرانے والوں اور ان کے اندر مدفون لوگوں کے حالات
ں کے اندھیروں میں ضم ہو چکے ہیں۔

حاجی اقبال خواجہ سرا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی عمارت کے اندر، حاجی اقبال خواجہ سرا کے
نے پچھم جانب ایک وسیع و عریض، نہایت عالیشان مسجد ہے۔ اس مسجد

دیکھئے فٹ نوٹ ۱۰۵ — مولف

کا صحن کافی کشادہ ہے۔ مسجد کے باہری حصہ میں، وسطی محراب کے اوپر ایک سنگ
کتبہ لگا ہوا ہے۔ جو کافی بلندی پر ہونے کی وجہ سے مولف پڑھ نہیں سکا۔
مسجد مذکور کے دکھن جانب ایک کنواں ہے جس کا پانی زمانہ ماضی میں مس
کا حوض بھرنے کے لئے نیز دیگر ضرورتوں کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔ یتیم خانہ ب
کے بعد بھی اسی کنویں کا پانی بچوں کے پینے اور دیگر تمام ضرورتوں کے لئے استعمال
رہا ہے لیکن بعد کے دنوں میں ہینڈ پائپ لگ جانے کی وجہ سے اس کنویں
پانی کا استعمال محدود ہو گیا ہے۔ اب کنویں میں بورنگ ہو چکی ہے۔ جلد ہ
پانی کی ایک ٹنکی بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے جو چالیس فیٹ بلند ہوگی۔ جب
یہ واٹر ٹینک تعمیر ہو جائے گا اس وقت تعمیر شدہ فلش پاخانوں کا استعمال شر
ہو جائے گا جو ابھی بند ہے۔ یتیم خانہ کے اندر و باہر پانی کی فراہمی کا مسئلہ حل
ہو جائے گا۔

حوض مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا

زمانہ ماضی میں صحن مسجد سے پورب جانب اور حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقب
کے عین جانب مغرب یعنی مقبرہ اور مسجد کے درمیان تقریباً بارہ مکعب ہاتھ کا ایک
پختہ حوض بنا ہوا تھا جس کے متعلق اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حوض شاید مردو
کے آخری "غسل پاکی" کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا لیکن یہ خیال محض واہمہ
کیونکہ حوض کے چاروں طرف نالیاں بنی ہوئی تھیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ
حوض صرف وضو کے لئے بنایا گیا تھا اور وضو کرنے کے لئے استعمال بھی ہوتا رہا ہو

۱۹۳۴ء میں جب یتیم خانہ کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا، اس وقت یہ حوض خراب ہو چکا تھا اور ایک پختہ گڈھے کی شکل میں موجود تھا۔ ۱۹۷۷ء میں اس پختہ گڈھے کو مٹی سے برابر کر کے اسپر اینٹوں کا فرش لگا دیا گیا ہے۔

اس پرشکوہ مسجد نے مقبرہ کے احاطہ کے اندرونی ماحول میں ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مسجد میں پانچوں وقت پابندی کے ساتھ باجماعت نماز ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کا بھی باقاعدہ اہتمام ہے۔ یتیم خانہ کے بچے اور منتظمین اس مسجد میں روزانہ صبح کے وقت پابندی کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ بچوں کی تلاوت کا یہ منظر بھی بڑا روح پرور ہوتا ہے۔

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا (رحمۃ اللہ علیہا) کے چاروں طرف میلوں کے رقبہ میں زمانہ ماضی میں قبرستان تھا۔ آج بھی مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا کے پیچھے یعنی پچھم جانب ساٹھ میٹر چوڑا قبرستان موجود ہے جس میں پرانے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان بہت سی قدیم پختہ قبریں بوسیدہ حالت میں موجود ہیں۔

یتیم خانہ کے صدر دروازہ کے سامنے ہی پورب جانب جنگل کی شکل میں وہ قدیم قبرستان ہے جس میں حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی درگاہ واقع ہے۔ یہ وسیع عریض قبرستان جالپا نالہ تک چلا گیا ہے جس میں آج بھی ہزارہا پختہ قبریں موجود ہیں۔

درگاہ حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے صدر دروازہ کے سامنے ہی تقریباً پچاس میٹر پورب جانب حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی درگاہ ہے۔ حضرت بڑی بوا صاحبہ

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، خلیفہ و جانشین حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الٰہی
(رحمتہ اللہ علیہ)، کی ہمشیرہ معظمہ ہیں۔ آپ اپنے وقت کی زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔
اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل بیکراں سے آپ کو نوازا تھا اور روحانیت کے عظیم مراتب
عطا فرمائے تھے۔ اسوقت کے بڑے بڑے علماو صلحا آپ کی عظمت و بزرگی کے سبب
احترام کرتے تھے۔ اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات کے معترف تھے۔ آپ عبادت
و ریاضت، خدا ترسی و فیض رسانی اور جود و سخا میں دور دور تک مشہور تھیں۔

آپ کی درگاہ کے چاروں طرف آج بھی ہزارہا پختہ و خام قبریں موجود ہیں۔
جو زمانۂ قدیم کی ہیں۔ ان قبروں میں بہت سی قبریں عام لوگوں کی ہیں جنھوں نے
حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمتہ اللہ علیہا) کی عظمت و بزرگی کی برکت کے خیال سے
آپ کے مزار کا قرب حاصل کرنے کے لئے مدفون ہونے کی وصیت کیا تھا یا اُن کے
وارثان نے اسی عقیدت کے تحت آپ کے قرب میں دفن کرایا۔ یہ تمام علاقہ آج
تک "بڑی بوا" کے نام سے مشہور ہے۔ یوں تو لوگ روز ہی زیارت و فاتحہ خوانی کے لئے
آپ کے آستانہ پر آتے رہتے ہیں لیکن جمعرات کے دن عموماً لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔

مرمت درگاہ بڑی بوا صاحبہ

مولوی عبدالغفار انصاری اودھی نے اپنے دادا مولوی عبدالکریم انصاری اودھی
مرحوم کی یادداشتوں کے سہارے جو کتاب ۲۷-۱۹۲۵ء کے درمیان مرتب کیا تھا''' اس کے
صفحہ ۱۳ پر لکھا ہے کہ بہت عرصہ گذرا کہ واجد علی خاں ناظم سلطانپور نے درگاہ کی مرمت
کرادی تھی کیونکہ ان کے مرشد حافظ محرم علی صاحب نے اسکی ہدایت اور تاکید فرمایا

تھا۔" اس کے بعد فیض آباد شہر کے ایک سوداگر شیخ رمضان علی نے بھی ازسر نو مرمت کرائی تھی۔ اب ۱۹۷۷ء میں گوکل بھون، اجودھیا کے مہنت شری منگل داس جی نے بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کی چہار دیواری اور فرش وغیرہ کے پلاسٹر کو جو کافی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اسکو ازسر نو سیمنٹ سے پلاسٹر کرا دیا ہے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ مہنت جی کو حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) سے بڑی عقیدت ہے اور وہ اکثر فیوض و برکات کے لئے آستانہ پر حاضری دیتے ہیں۔

بڑی بوا صاحبہ کی توجہ کا اثر

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے ذمہ داروں اور اجودھیا و شاہجہانپور و بہادر گنج وغیرہ محلوں کے بہت سے ہندو مسلمانوں نے، جو ابھی بقید حیات ہیں اور صحت و تندرستی اور ہوش و حواس سے درست ہیں۔ بتلاتے ہیں کہ مسلم یتیم خانہ قائم ہونے سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک بڑی بوا صاحبہ کے علاقہ میں بندروں کا راج تھا انکی کثرت نے یتیم خانہ میں رہنے والوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا ان کے لئے نہ کھانا پکانا اور نہ کھانا کھانا ہی دشوار تھا بلکہ یتیم خانہ کی چیزیں اور بچوں کے کپڑے بستر و چادریں وغیرہ بھی اٹھا لیجاتے اور پھاڑ ڈالتے تھے۔ بچے اور منتظمین اس صورت حال سے بیحد زیادہ پریشان تھے۔ کہ اچانک ایک دن رات کے وقت تمام بندروں نے بڑی بوا صاحبہ کا علاقہ کا تخلیہ کر دیا۔ اس دن سے آج تک ایک بھی بندر اب

گم گشتہ، حالات اجودھیا (اودھ) مطبوعہ ادبی پریس لاٹوس روڈ۔ لکھنؤ سن ۱۹۲۷ء۔ مؤلف

اس علاقہ میں نہیں آیا۔ اگر کبھی کوئی بندر بھولے بسرے اتفاقاً ادھر آ گیا تو شام ہونے سے پہلے ہی وہ اس علاقہ کو چھوڑ دیتا ہے

بڑی بوا صاحبہ کا سالانہ عرس

حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کا کوئی سالانہ عرس معمولاً نہیں ہوتا۔ دس پانچ سالوں کے بعد جب لوگوں کو عرس کرنے کا خیال آتا ہے تو چندہ کر کے عرس کے نام سے مراسم عرس ادا کر لیتے ہیں۔ تقریباً دس بارہ سال کا عرصہ ہوا ہوگا جب لوگوں نے چندہ سے ایک نہایت شاندار عرس کیا تھا۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کا مجمع اکٹھا ہوا تھا۔ صبح سے شام تک عرس کے مراسم ادا ہوتے رہے۔ بعد نماز عشاء قوالیوں اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا جو رات بھر چلتا رہا۔ لوگ آج تک اس عرس کی بات کرتے ہیں۔

مزار الٰہی بخش مجذوب

گم گشتہ حالات اجودھیا (صفحہ ۴) میں لکھا ہے کہ الٰہی بخش مجذوب کی قبر حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی قبر کے پاس ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ حضرت الٰہی بخش مجذوب کی قبر حضرت بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کے پورب جانب تقریباً پندرہ میٹر کے فاصلہ پر ایک قدیم قناتی مسجد کے باہر اتر جانب "شاہ جی کی کٹی" کو جانے والی پگڈنڈی سے متصل ایک بوسیدہ چبوترے کی شکل میں موجود ہے۔

بھی کبھی بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کا جاروب کش جمعرات کے دن اس چبوترہ نما قبر
پر چادر چڑھاتا تھا۔

الٰہی بخش مجذوب کے متعلق لوگوں میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی دو
سو سال کا زمانہ بتلاتا ہے کوئی پانچسو سال کا۔ لیکن قبر سے پانچسو سال کی کہنگی
ظاہر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ بعد کے زمانوں میں کسی نے اس کی مرمت کرا دیا
ہو۔

الٰہی بخش مجذوب کے بارے میں علاوہ مولوی عبدالغفار صاحب انصاری کی
کتاب کے کسی کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ پتہ نہیں کہ مولوی صاحب
نے کہاں سے اور کس سے سن سنا کر اپنی کتاب میں ایک مزید نام کا اضافہ
کر لیا۔ نہ الٰہی بخش مجذوب کا زمانہ لکھا نہ حالات لکھے اور سلسلہ کا ذکر کیا
سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات کے بموجب آپ کا زمانہ حضرت بڑی بوا
صاحبہ سے بعد کا زمانہ لوگ بتلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ اسی جنگل میں گھوما
پھرا کرتے تھے۔ اور عموماً ہر وقت آپ پر حالت جذب طاری رہتی تھی جو کچھ

۱۱۸۔ بسم اللہ شاہ صاحب محلہ شاہجہانپور کے رہنے والے اور درگاہ بڑی بوا صاحبہ
کے خادم ہیں انھوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے درگاہ بڑی بوا صاحبہ کے پورب ایک
کوٹھری بنائی ہے جسے لوگ "شاہ جی کی کٹی" کہتے ہیں اسی کٹی میں وہ بیٹھتے ہیں اور حاجتمند
لوگ خصوصاً عورتیں انکے پاس آکر اپنے مقصد کی برآری کے لئے تعویذ اور گنڈے وغیرہ
لیتی ہیں۔ روزانہ دس بیس لوگ آپکے پاس دعا تعویذ کیلئے آتے رہتے ہیں — مؤلف

زبان سے کہہ دیتے تھے وہ عموماً ہوجایا کرتا تھا۔ لوگ اکثر آپ کو تلاش کرتے ہوئے
اسی جنگل میں آپکی خدمت میں حاضر ہوکر دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔
کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی ناپاک عورت کا دامن یا اس کے جسم کا
کوئی کپڑا کسی طرح آپ کے مزار سے چھو جائے تو اس کے کپڑوں میں آگ
لگ جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تین بزرگوں کی قبریں

حضرت بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کے اتر جانب تقریباً دو تین میٹر کے
فاصلہ پر مشرقی گوشہ میں ایک قدیم چبوترہ پر جکی قدامت کا اندازہ سیکڑوں
سال سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ تین بوسیدہ قدیم قبریں ہیں جو تقریباً ایک فٹ
اونچی دیوار سے گھری ہوئی ہیں۔ ان قبروں کے بارے میں بھی لوگوں کی مختلف
روایات ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنتے
چلے آرہے ہیں کہ یہ قبریں تین رفیق بزرگ اصحاب کی ہیں جو ہمیشہ ایک ہی تھا
رہتے تھے۔ اور مرنے کے بعد تینوں بزرگوں نے بموجب وصیت ایک ہی
جگہ دفن ہوئے لیکن دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ عام لوگوں کی قبریں
ہیں جو اپنے زمانہ میں صاحب حیثیت اور با اثر افراد تھے۔ یہ تینوں قبریں
ایک ہی خاندان کے افراد کی قبریں ہیں جو حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا)
کی عظمت و بزرگی کے لئے قرب میں بنوائی گئی تھیں۔

غیر معروف مقبرے

درگاہ مذکور کے اتر جانب مغربی گوشہ میں جو آستانہ بڑی بوا سے تقریبا
دس میٹر کے فاصلہ پر ,, تالاب ,, کے کرارہ پر ایک خستہ حال مقبرہ ہے جس میں
اب قبروں کا نشان بھی معدوم ہو چکا ہے۔ اس مقبرہ سے متصل پچھم جانب ایک
دوسرا مقبرہ بھی ہے جو مذکورالصدر مقبرہ کی طرح انتہائی خستہ حالت میں ہے
اس مقبرہ میں بھی قبروں کے نشان معدوم ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ بتانے
والا نہ مل سکا کہ یہ مقبرے کن لوگوں کے ہیں؟ یا ان میں کون لوگ آرام فرما رہے
ہیں؟۔

ان دونوں مقبروں کے طرز تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکی تعمیر کا زمانہ
تقریبا ایک ہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں مقبرے ایک ہی خاندان
کے ذی اثر افراد کے ہوں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مقابر بزرگوں کے ہیں لیکن مؤلف کو اسکی صحت
میں تأمل ہے۔ ان مقابر کو غور سے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حاجی اقبال
خواجہ سرا کے مقبرہ بننے سے پہلے کے ہیں۔

تالاب حاجی اقبال خواجہ سرا

حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی اتر جانب اتر جانب چند میٹر
کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا تالاب ہے جو زمانہ ماضی میں کافی گہرا رہا ہوگا قیاس

ہے کہ یہ تالاب حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ بنانے کے زمانہ میں مٹی نکلوانے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ فی الوقت یہ ایک وسیع و عریض گڈھے کی شکل میں موجود ہے۔ اب سے سیکڑوں سال پہلے یہ کافی گہرا رہا ہوگا لیکن اب پٹ چکا ہے بارش کے دنوں میں جب اس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ تو واقعی ایک خوب صورت تالاب بن جاتا ہے۔ بارش کے مہینے میں اس تالاب میں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ اور ماہ نومبر تک جب اس تالاب کا پانی خشک ہو جاتا ہے اسوقت اسمیں گیہوں کی کاشت اُگائی جاتی ہے۔

مزار لین والے بابا

اس تالاب کے اتر جانب اور درگاہ حضرت بڑی بوا صاحبہ کے تقریبًا بالکل سرہانے قدرے پورب جانب ایک پختہ اور بلند چبوترہ پر نیم کے درخت کے نیچے تین قبریں ہیں جنھیں آجکل لوگ لین والے بابا (یعنی ریلوے لائن کے پاس والے بابا) کے نام سے پکارتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ تمام قبریں زمانہ سلف سے "گنج شہدا" کے نام سے مشہور چلی آتی ہیں اور یہ شہداد زمانۂ قدیم سے صاحبِ کرامت مشہور رہیں

جس زمانہ میں مولوی مراد اللہ صاحب بہرائچی (خلیفۂ مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی) فیض آباد کی مسجد ٹاٹ شاہ کے حجرہ میں مقیم تھے ہمیشہ جمعرات کے دن فیض آباد سے فاتحہ خوانی کے لئے اس جگہ پر آتے تھے اور فیض حاصل کرتے

ے۔

اب بھی جمعرات کے دن لوگ اس چبوترہ پر مزارات کی زیارت و فاتحہ
خوانی کے لئے آتے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا
کہنا ہے کہ یہ مزارات سید سالار مسعود غازی کے جہاد میں شریک ہونے والے
مجاہدین کے ہیں۔

ان شہداء کی کرامت کے واقعات

(۱) تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ فیض آباد میں کچھ
مخالف لوگوں نے مولوی سید مراد اللہ بہرائچی کو جو مسجد ٹاٹ شاہ کے حجرے میں
رہتے تھے بے عزت کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک ہجوم اکٹھا کرکے مولوی صاحب
کی بے عزتی کے درپے ہوئے اس نازک اور مصیبت کے وقت میں ان شہداء
نے ظاہری صورت اختیار کرکے مولوی صاحب کی مدد کیا اور تمام مخالف
ہجوم کو درہم برہم کرکے منتشر کر دیا۔ مشہور ہے کہ مولوی صاحب خود بھی صاحب
کشف و کرامات تھے۔

معتبر اشخاص کی زبانی سنی ہوئی یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ جس وقت
مخالف ہجوم نے مولوی صاحب کو نرغے میں لے لیا تھا عین اسی وقت دو اجنبی خوبصورت
نوجوان اس ہجوم میں آگئے جو ہتھیاروں سے لیس تھے۔ انھوں نے مجمع کو منتشر کر کے
بھگا دیا۔ لوگ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ ان خوبصورت نوجوانوں کو نہ تو کسی نے آتے
دیکھا اور نہ کسی نے انھیں جاتے دیکھا نہ کبھی کسی نے مسجد میں انھیں نماز پڑھتے

کے لئے آتے دیکھا تھا۔ اور نہ مولوی صاحب کے پاس آنے والے لوگوں ہی
میں سے وہ لوگ تھے۔

ہجوم منتشر ہو جانے کے بعد کسی نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ
یہ نوجوان لوگ کون تھے؟ جنھوں نے مجمع کو درہم برہم کر دیا تھا؟ ہم نے نہ کبھی
انھیں مسجد میں دیکھا تھا۔ اور نہ یہ لوگ آپکے پاس آتے جاتے تھے؟ — اس
مولوی صاحب نے کہا تھا کہ یہ وہ شہدار تھے جن کے مزار پہ میں ہر جمعرات کو
فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ہوں۔

۲۔ اس چبوترہ پر مدفون شہدا کا ایک دوسرا واقعہ، جس کے جاننے او
اور دیکھنے والے اب بھی بقید حیات ہیں، یہ ہے کہ جس وقت اجودھیا ریلوے
لائن بننے والی تھی اور لائن کی پیمائش کا کام ہو رہا تھا اس دوران اس شہدا
کا چبوترہ (جس پران کا مزار ہے) ریلوے لائن کے درمیان آگیا تھا[119]۔ لوگ
بتلاتے ہیں کہ ریلوے لائن بنانے کی جھنڈی جس وقت چبوترے پر گاڑی گئی او
اسے کھودا جانے لگا اس وقت عجب قیامت کا منظر آیا تین چار مزدوروں
کی اسی جگہ فوری موت ہو گئی۔ اور ایک کہرام مچ گیا۔ ریلوے انجینیروں نے
جگہ سے ریلوے لائن لیجانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور لائن کو اتر کی طرف گھما
لیجانا طے کیا اور قبر کے اس چبوترہ کو کافی مضبوط اور خوشنما بنا دیا جو ابتک مو

---

۱۱۹ ۔ ریلوے لائن بچھانے والی سڑک، جو پہلے بنائی گئی تھی، اور جس کی وجہ سے یہ حا
پیش آیا تھا، اس کا نشان ابتک نہایت واضح طور پر موجود ہے جو شہدار کے اس چبوترہ کے
جانب ہے — مؤلف

ہے۔ اکثر لوگ یہاں جمعرات کے دن فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں زمانہ سابق میں یہ علاقہ ،، خطیرہ بیر،، نام سے تھا۔

اس جگہ سے موجودہ ریلوے لائن کو پار کر کے اتر جانب چلئے کسی زمانہ میں یہ علاقہ وسیع وعریض قبرستان و جنگل رہا ہوگا۔ اس علاقہ میں موجودہ اونچے اونچے دیوہیکل پرانے درختوں کو دیکھنے کے بعد یہاں پر خوفناک جنگل ہونے کی قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

وقف باری تعالیٰ قبرستان

اسی جگہ ایک قطعہ زمین ہے جو جدید چہار دیواری سے گھرا ہوا قبرستان وقف باری تعالیٰ،، ہے۔ اس قبرستان سے ہٹ کر پورب جانب ،، گرگل یورویدک کالج اور اوشدھالیہ ہے جو زمانہ ماضی کے وسیع قبرستان کی ایک حصہ میں واقع ہے۔

وقف باری تعالیٰ کی اراضی پر منتظمین نے امرود اور قلمی آموں کا باغ لگوا دیا ہے۔ اب دوسرا مقبرہ ،وقف باری تعالیٰ قبرستان و کربلا کے باغ کے وسط میں ہو گیا ہے۔

(منتظمین وقف باری تعالیٰ نے باغ کی اراضی کی آبپاشی کیلئے ۱۹۸۲ء میں ایک ٹیوب ویل لگوا دیا ہے ـــــ مولف)

مزار مالک شاہ مجذوب

وقف باری تعالیٰ قبرستان میں جس مقام پر اب منتظمین نے ٹیوب ویل لگوایا ہے۔ اُس

خطیرہ یعنی بزرگ دفطیم۔ (از کشف دغبات)

ٹیوب ویل کے کمرے کی پچھلی دیوار سے متصل مالک شاہ مجذوب (جن کے نام سے منسوب
مالک شاہ کی مسجد کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے ــــ مولف) کی کچی قبر اب تک موجود ہے
اور لوگ اُس کا احترام کرتے ہیں۔
۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں رات ڈھلنے کے بعد تیسرے پہر میں مالک شاہ مجذوب کا انتقال
ہوا۔ اور صبح سویرے جب اجو دھیا اور فیض آباد میں لوگوں کو اطلاع ہوئی تو دونوں تو ام شہر
کی دوکانیں سوگ میں بند ہو گئیں۔ شہر اور نزدیک و دور کے ہزاروں لوگ شریک جنازہ ہوئے۔
مالک شاہ مجذوب کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ حسب و نسب کیا تھا؟ کس سلسلہ
سے تعلق تھا؟ باوجود تحقیق اِن سوالوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی نہ تو سینہ بسینہ چلی
آنے والی کسی روایت سے مل سکا اور نہ کسی کتاب میں آپ کے حالات ملے۔ البتہ اِس بات
پر تمام بقیدِ حیات لوگ متفق ہیں کہ مالک شاہ مجذوب نے نہ تو کسی کو اپنا خلیفہ بنایا اور نہ اپنا
جانشین، اور نہ رواج کے مطابق قبر پر جاروب کشی کیلئے کسی کو مقرر کیا اور نہ اس طرح کی
کوئی وصیت کیا تھا۔

سنگی لوح

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ، موجودہ کالرا اسپتال کے پچھلے
حصہ تک چلئے تو اسپتال اور ریلوے لائن کے درمیان قدرے بلند مقام
پر ایک سنگی (پتھر کی) قبر کا لوح مزار ہے۔ جسے لوگ شہید مرد کی قبر بتاتے
ہیں۔ لیکن شہید مرد کے نام اور دیگر حالات سے سب لوگ ناواقف ہیں[۲]
مؤلف کا قیاس یہ ہے کہ یہ قبر کسی صاحب ثروت داثر کی ہونی چا...

کیونکہ یہ پتھر کی قبر اس علاقہ کی تمام قبروں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے جبکہ نمود و نمائش سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے۔

اس قبر کے اتر جانب سڑک کی دوسری طرف جو محلہ آباد ہے اسے کیتھانہ (کایستھوں کی آبادی کا محلہ) کہتے ہیں۔ اس کے سامنے سے فیض آباد اجودھیا روڈ گذرتی ہے۔ اس جگہ پر کھڑے ہونے سے سڑک کے پچھم جانب کامتا پرشاد سندر لال ساکیت ڈگری کالج کی عمارت نظر آتی ہے۔ جسکے پیچھے تک جنگی شہید کے قبرستان کا علاقہ چلا گیا ہے۔ (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آگیا ہے) (مولف)

لعل شاہ باز قلندر کا چلہ

ساکیت پوسٹ گریجویٹ کالج کے پچھم اور اتر تھوڑے فاصلہ پر اجودھیا شہر کی عیدگاہ ہے۔ اس عیدگاہ کے پیچھے زمانہ سابق میں ایک پختہ چبوترہ تھا جسے لوگ لعل شاہ باز قلندر کا تہ خانہ کہتے تھے۔ چبوترہ کے نیچے ایک کشادہ تہ خانہ تھا۔ اب یہ چبوترہ اور اس کے اطراف کی اراضی بیراگیوں کے قبضہ میں ہے مؤلف تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ اس چبوترے کے نیچے حضرت لعل شاہ باز قلندر کا تہ خانہ ہے۔ تہ خانہ کے اندر اس قدر روشنی آتی ہے کہ یہاں بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت بآسانی کیجا سکتی ہے۔ اور اس کے اندر اتنی جگہ ہے کہ

---

(۱) مولوی عبدالغفار نے اس قبر کا نام "خطیرہ بیر کی قبر" لکھا ہے جو انکا اپنا دیا ہوا نام ہے کیونکہ اس علاقہ کا کوئی فرد بھی اس قبر کو "خطیرہ بیر کی قبر" کے نام سے نہیں جانتا۔ مؤلف

ایک امام اور سات مقتدی با جماعت نماز ادا کر سکتے ہیں ۔ مذکورہ کتاب میں یہ بھی
لکھا ہوا ہے کہ تہ خانہ کے اندر مغربی دیوار میں مسجد کی محراب بنی ہوئی ہے ۔
کہتے ہیں کہ حضرت لعل شاہ باز قلندر حضرت بو علی شاہ قلندر کے خلیفہ تھے ۔
تہ خانہ آپکی حیات ہی میں آپکی عبادت و ریاضت اور چلہ کشی کے لئے بنایا گیا
تھا۔ بعد وفات آپکو اسی تہ خانہ میں دفن کیا گیا۔ آپکی وفات کے بعد آپ
خادمین کو بھی آپ کے پہلو میں کیا گیا ۔۹۵-۱۸۹۰ء کے درمیان اس چبوترہ
قدامت کا اندازہ مصنف کی تحریر کے بموجب پانچسو سال تھا اور اس وقت
بھی چبوترہ کے اوپر قبروں کے نشان بنے ہوئے تھے ۔
اس چبوترہ کے پاس پہلے کھرنی اور املی کے بہت پرانے اور بڑے
بڑے درخت تھے ۔ لیکن اس وقت اس جگہ پر نہ کوئی کھرنی کا درخت ہے
نہ املی کا ۔ البتہ خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے یہ جگہ آج بھی جنگل
ہوتی ہے ۔ چونکہ مؤلف کو یہ چبوترہ اور تہ خانہ دیکھنے کا موقع نہیں دیا گیا
اس لئے نہ تو چبوترے کے اوپر بنے ہوئے قبروں کے نشانات ہی کی تصدیق
تکذیب کیجا سکتی ہے اور نہ تہ خانوں کے اندر کی قبروں اور مغربی دیوار میں محراب
وغیرہ کی موجودگی پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے ۔
لعل شاہ باز قلندر کے صحیح اور تفصیلی حالات کسی کتاب میں مؤلف
سے نہیں گذرے لیکن کشمیر میں اس نام کی شخصیت بہت مقبول گذری ہے
کہ کشمیر ہی کے رہنے والے ہوں اور زندگی کے آخری ایام میں شہر اودھ آ
چلے آئے ہوں ۔ کشمیری زبان میں انپر جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ آج بھی بہت م

ہے۔

اب اس جگہ سے واپس ہو کر "کالرا اسپتال" کے پاس آئیے۔ اسپتال سے پورب کی طرف اجودھیا روڈ پر اجودھیا کی طرف تھوڑی دور چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ٹیڑھی بازار ریلوے گمٹی ملے گی۔ اس گمٹی سے ریلوے لائن کو پار کر کے دکھن جانب جانے والی سڑک پر چلیئے۔

بھائی خاں شہید کی درگاہ

ریلوے لائن پار کر کے دکھن جانب جانے والی سڑک پر چلیئے راستہ میں تخمی آموں کا باغ ملے گا۔ یہ باغ اب سے سو برس پہلے بھائی خاں شہید کی درگاہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس باغ کے دکھن اور پچھم جانب جوگیان فقیروں کا محلہ ہے۔ آموں کے اس باغ میں بھائی خاں شہید کی قبر موجود ہے اس قبر کے پورب جانب زمانۂ ماضی میں تخمی آموں کا بہت باغ تھا۔ جس میں ہزارہا پختہ قبریں موجود تھیں۔ بھائی خاں شہید کا قبرستان ریلوے لائن سے ملا ہوا ہے۔ اور لائن کے دکھن جانب ہے۔

جس باغ میں بھائی خاں شہید کی قبر ہے وہ زمانۂ ماضی میں وسیع قبرستان تھا۔ اس میں بیشمار پختہ و خام قبریں موجود تھیں لیکن اب صرف چند ٹوٹی پھوٹی قبروں کے علاوہ اس علاقہ میں کسی قبر کا نام و نشان نہیں رہ گیا ہے۔

بھائی خاں شہید کے متعلق بھی کسی کتاب یا کسی شخص کی زبانی کوئی معلومات

نہ حاصل ہو سکی اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ اور کس کے ساتھ جہاد میں جامِ شہادت نوش کیا؟ یا کسی لڑائی میں قتل ہوئے اور عوام میں شہید کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مرزا لعل خاں شہید

بھائی خاں شہید کی قبر کی اتر جانب لعل خاں شہید کا مزار ہے جو اس وقت خستہ و شکستہ حالت میں ہے آپکے متعلق تحریر ہے کہ صاحب تصرفات بزرگ ہیں۔ لوگوں میں آپکی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ لیکن مؤلف کو تحقیق سے نہ تو سند مل سکی اور نہ زمانہ اور سلسلہ کا پتہ چل سکا۔ اکثر ضعیف العمر لوگوں سے بات چیت کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تین ساڑھے تین سو سال قبل آپ کا زمانہ رہا ہوگا لیکن مزارات کی کہنگی اور علاقہ کی یکسر تبدیلی سے اگر چار پانچ سو سال کا اندازہ کیا جائے تو تردید نہیں کیجا سکتی۔

درگاہ حضرت شیث علیہ السلام

بھائی خاں شہید کی درگاہ کے قبرستان کے دکھن جانب سے وہ پختہ سڑک گذرتی ہے جو فیض آباد سے منی پربت ہوتی ہوئی درشن نگر کو چلی گئی ہے اس پختہ سڑک پر بیس پچیس میٹر چلنے کے بعد تخمی آموں کے باغ کے درمیان ایک راستہ نظر آئے گا اس راستہ پر تھوڑی دور چلنے کے بعد تلسی نالہ کا پل ملے گا پل سے آگے دکھن جانب بڑھئے تو بائیں ہاتھ پر درگاہ حضرت شیث علیہ السلام ملے گی۔ درگاہ کے بر چہار

اب خصوصاً پچھم جانب آج بھی زمانۂ قدیم کی ہزار ہا پختہ قبریں، شکستہ مساجد، اجاڑ بوسیدہ مقابر اور برباد شدہ خانقاہوں اور مدارس کے آثار ملیں گے کے نشان تک موجود ہیں۔ درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے دکھن جانب ٹیلے پر اب بھی ہزار ہا سال کے پرانے درختوں اور دشوار گذار جھاڑیوں کے جنگل ابتک موجود ہیں جن میں لاتعداد شکستہ و بوسیدہ قبریں بمقابر و مساجد موجود ہیں۔ درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے قبرستان کا رقبہ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے اپنی کتاب تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں چالیس بیگہ پختہ (بچیس ایکڑ) تحریر کیا ہے لیکن فی الوقت اس کا رقبہ بہت ہی کم رہ گیا ہے

اس قبرستان کے جنوبی سرحد کے پاس ایک تالاب ہے جسے (شری گنیش کنڈ) کہتے ہیں۔ میلہ کے ایام میں اہل ہنود اس تالاب میں نہاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس تالاب میں نہانے سے لکشمی جی گنیش جی کی بیوی جو دولت کی دیوی ہیں خوش ہوتی ہیں۔

مساجد محمد علی گنگ

اس قبرستان کی جنوبی سرحد پر زمانۂ ماضی میں سات قناطی مسجدیں تھیں اور ایک مسجد میں ایک مزار تھی۔ اب یہ مساجد محمد علی گنگ کے نام سے مشہور ہیں۔ فی الوقت سات مساجد میں پانچ مساجد باقی ہیں لیکن خستہ حالت میں ہیں ان کو دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی کاریگر نے ایک ہی زمانہ میں بنایا ہے۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے ان مساجد کے اندر قبروں میں مدفون

لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اب سے چار سو برس کا زمانہ گذرا ہے کہ سات بھائی
یا شخص جو ایک ہی مرشد کے مرید یا خاندان کے افراد تھے۔ تمام روئے زمین کی سیر
کر کے چپ ہو گئے تھے۔ یہ انھیں ساتوں افراد میں ہر ایک شخص کی مزار ایک ایک
مسجد میں ہے۔[۱۲۲]

ہم مولوی عبدالکریم صاحب کی دیانت اور راست بازی پر تبصرہ
کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتنا بتانے کی جرأت ضرور رکھتے ہیں کہ اب سے پانچ سو
سال کی دنیا بہت ہی محدود تھی اور ایک سیاح کا عجائبات عالم کو دیکھ کر خاموش
ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سیاحت نے دنیا کی بے ثباتی او
ناپائیداری کی حقیقت سے اس درجہ تاثر لیا ہو کہ خاموشی اختیار کر لیا ہو اور لوگوں
میں گنگ مشہور ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب مرحوم نے بھی انھیں سینہ بسینہ چلے
آنے والی روایت کے بموجب ان لوگوں کو گنگ لکھنا مناسب سمجھا ہو
بہر حال ان لوگوں کے متعلق بھی باجود بسیار کوشش کے کوئی معلومات
نہ حاصل نہ ہو سکی۔

مزار حضرت شیث علیہ السلام

حضرت شیث علیہ السلام کے مزار اور اس کے احاطہ کو سلطان سکندر لودی
نے ۱۴۹۲ء میں ازسر نو پختہ کرایا تھا اور درگاہ کے سامنے سے بہنے والے تلی
پر زائرین کی آمد و رفت کی آسانی کے لئے پختہ پل تعمیر کرا کر ایک آراضی برا

۱۲۲۔ صفحہ ۶ ۱۲۳۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء صفحہ

...رف درگاہ عطا فرمایا تھا۔"[۱۲۳]

۸۹۷ ہجری (مطابق ۱۴۹۲ عیسوی) میں مملکت جونپور کے سرکش زمینداروں ...وت کو کچلنے کے لیئے سلطان سکندر لودی اپنی عظیم الشان فوج لیکر دہلی ... جونپور آیا تھا۔ باغیوں کی سرکوبی کرنے کے بعد جب اسے اطمینان حاصل ہوا ... نے ایکماہ کامل شہر اودھ میں گذارا تھا۔"

تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ بادشاہ سکندر لودی کے ہمراہ ...کے مرشد حضرت جلیل الدین ہمشیر زادہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند ...ۃ اللہ علیہ) بھی تھے"۔ چونکہ حضرت موصوف کو کتب تواریخ سے حضرت ...یث علیہ السلام کے مزار کا ذکر ملک ہند کے بلاد اودھ (اجودھیا) میں دریا ...نوں اور شمال کی جانب دریا کا ہونا ملاحظہ فرما چکے تھے۔ لہذا بادشاہ ...ے فرمایا کہ یہ احاطہ معہ قبر کے پختہ کرا دیا جائے۔ بادشاہ سکندر لودی نے آپکے ...کی تعمیل کیا۔ درگاہ موصوف اور قبر پختہ کرا کے معافی بنا بر مصارف درگاہ ... فرمایا۔

حضرت شیث علیہ السلام کا عرس ہر سال ۴ رجب کو لوگ کرتے ہیں۔ لوگ ...ن کرتے ہیں کہ عرس میں ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کا مجمع ہوتا ہے۔ ختم ...مجید میں سیکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ علماء کی تقریریں اور محفل سماع کا خصوصی ...ظام ہوتا ہے۔ اجودھیا اور فیض آباد کے علاوہ قرب و نواح کے ہندو مسلمان کثیر

...۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۰ مطبوعہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ پانچواں ایڈیشن ۱۹۳۳ء

...۔ علاوہ متذکرہ بالا کتاب کے کسی اور کتاب میں حضرت جلال الدین کا ساتھ ہونا مرقوم نہیں۔ مولف۔ ۱۲۳۔ صفحہ ۷

تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

کتاب خلاصۃ الاحادیث تالیف حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جزو اول باب انیسواں[۹] صفحہ دو سو چھہتر[۲۷۶] پر حکایات و حالات شتی[۲۶] کے عنوان سے یہ عبارت درج ہے ـــ

قال علیہ السلام ان فی الہند بلدۃً اسمہا اودھ فیہ بین التلین قبر بین شیث و ایوب علیہ السلام

کتاب سراج الھدایۃ میں مذکور ہے کہ در شہر یست کہ او را اودھ گویند میان دو بلندی قبر دو پیغمبر یعنی شیث و ایوب علیہ السلام۔۔ کتاب نوید جاوید مطبوعہ نصرۃ المطابع دہلی مصنفہ مولوی سید ناصر الدین محمود ابو المنصور کے صفحات ۳۸۹، ۳۹۰ پر تحریر ہے کہ یہ بات کسی نبی کا مزار یروشلم کے باہر نہیں ہے، کچھ عذر نہیں ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں مدفون ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سرزمین موآب میں (استثنا ۳۴ باب ۵)

---

۱۲۶ ایضاً

۲۷ ا۔ شتی بمعنی کثرت و بسیار چیزے مراد میگردد (غیاث اللغات)

۱۲۸ - یہ کتاب مولوی نجف علی مرحوم سہارنپوری کے کتب خانہ میں موجود تھی مولوی صاحب نے مندرجہ بالا عبارت کو کتاب مذکور سے نقل کر کے صاحب تاریخ مدینۃ الاولیا کو بذریعہ خط بھیجا تھا جب صاحب کتاب نے مولوی صاحب کے حوالہ سے اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے مولوی نجف علی مرحوم ادھر میں اکسٹرا کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے اور مصنف تاریخ مدینۃ الاولیاء کے نزدیکی دوستوں میں سے تھے۔

- ترجمہ - فرمایا علیہ السلام نے کہ تحقیق ملک ہند میں ایک شہر ہے کہ جس کا نام اودھ ہے اس میں دو ٹیلوں کے درمیان دو نبیوں حضرت شیث و ایوب علیہم السلام کی قبریں ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام جب عدن سے نکلے تو یروشلم ہنیں گئے تھے اگر کوئی
کہ قریب دو سو برس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں حضرت موسیٰ
سلام مصر لے آئے تھے (دیکھو پیدائش باب ۵۰ اور خروج ۱۳ باب ۱۹)
جواب یہ ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول صرف یروشلم میں انبیاء
وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت خرقیل علیہ السلام نبی بابل میں شہید ہوئے
ے۔ اور سام ابن نوح کی قبر میں مدفون ہوئے حضرت دانیال بابل میں وفات
۔ حضرت برمیاہ مصر میں مقتول و مدفون ہوئے اور عرصہ دراز کے بعد سکندر
نے اسکندریہ لیجاکر دفن کیا تھا۔

صاحب تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ مولینا عنایت علی
ب ایرانی جو ایک متبحر عالم اور مجتہد تھے حضرت شیث علیہ السلام کے مزار
د بمقام اودھ (اجودھیا) کی تصدیق فرما چکے ہیں موصوف ۱۸۸۰ء میں
پر انوار کی زیارت کے لئے ایران سے شہر اودھ تشریف لائے
ے۔

کتاب ترجمہ طاہرہ عجائب القصص جس کو مولوی فخر الدین دہلوی
حسب فرمائش واہتمام احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر
ی نے طبع کرایا تھا۔ اس کتاب میں حضرت شیث علیہ السلام کے تذکرہ
لکھا ہے کہ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ قبر شریف آپکی شہر اودھ (اجودھیا)
میں ہے۔

شاہ انور علی نبیرۂ شاہ تراب علی کاکوروی نے اپنی کتاب۔
انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں لکھا ہے کہ۔ شہر اودھ میں
بنا کردہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور اسی شہر میں قبر حضرت شیث علیہ
السلام کی ہے۔

کتاب نجم البلدان میں مولینا نجم الدین آفندی نے لکھا ہے
کہ۔ شہر اودھ کے بانی حضرت شیث علیہ السلام بن سیدنا حضرت آدم
علیہ السلام ہیں اس کے بعد ہند بن حام بن نوح علیہ السلام نے اودھ کو آباد
کیا۔ اس کے بعد یہ شہر راجگان ہنود کے تحت حکومت میں آیا۔ جس کے
مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہوا۔

منشی سید عابد حسین نے اپنی کتاب تاریخ جائس میں جو ۱۲ھ ہجری
(مطابق ۶۹ - ۱۸۶۸) میں مطبع جلالی الہ آباد میں چھپی تھی، حضرت شیث
علیہ السلام کی قبر شہر اودھ (اجودھیا) میں ہونا لکھا ہے۔

تواریخ انبیا میں منشی سرفراز خاں دہلوی نے بتصحیح علماء اسلام
فضلائے دہلی، لکھا ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کو اولیائے اق
کہتے ہیں حق تعالی نے پچاس صحیفے آپ پر نازل کئے۔ بعض کہتے ہیں
آپکا مولد شام ہے حضرت شیث علیہ السلام کی اولاد اکثر راہ راست پر
رہی اور بعض نے عصیان اختیار کیا قبر آپکی شہر اودھ میں مشہور ہے

تواریخ نادر العصر و جغرافیہ ملک اودھ جو منشی نولکشور پریس لکھنؤ
۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کے صفحہ ص ۴۶ پر لکھا ہے کہ فیض آ

کے قریب، دو بڑی قبریں ہیں۔ طول ان کا سات سات اور آٹھ آٹھ
سے کم نہ ہوگا عوام انکو حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام
سے منسوب کرتے ہیں
شہر اودھ اجودھیا میں حضرت شیث علیہ السلام کے مزار
ہونے کا ذکر نہ صرف مندرجہ بالا کتابوں ہی میں مرقوم ہے بلکہ اکثر بزرگان
دین نے احاطہ درگاہ شریف میں چلہ کشی کرکے اپنے مکاشفہ روحانی کی
بنا پر موجودہ مقام پر حضرت شیث علیہ السلام کی قبر کی صحت کی تصدیق
کیا ہے۔[۱۳۰]

مزار حضرت ایوب علیہ السلام

احاطۂ درگاہ حضرت شیث علیہ السلام میں پورب جانب ایک
اور کافی لمبی قبر ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر کے نام سے مشہور عرصہ
دراز سے ہے۔ عہد عالمگیری کے مشہور عالم اور تاریخ نویس سبحان
رائے بھنڈاری، ملا محمد باقر اثنا عشری، مولینا قاضی شہاب الدین
جونپوری[۱۳۱]، مولینا عبد الحق محدث دہلوی وغیرہ کی کتابوں سے حضرت
شیث علیہ السلام و حضرت ایوب علیہ السلام کے مزارات شہر اودھ میں

۱۳۰۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا صفحہ ۶۳

۱۳۱۔ ملک العلما، قاضی شہاب الدین امیر تیمور کے ہنگامہ کے زمانہ میں قیام دہلی کو
ترک کرکے بادشاہ ابراہیم شرقی کی خواہش پر جونپور تشریف لائے اور قاضی القضاۃ۔ بقیہ[۱۳۲]

ہونا ثابت ہیں

ان کتابوں کے علاوہ تاریخ کاشفی، خلاصۃ الوقائع، ناسخ التوار
بحار الانوار، گلزار ابرار، سید المتاخرین، خلاصۃ التواریخ، جہر نیم روز
میں بھی ان دونوں حضرات کی قبروں کا ذکر موجود ہے۔ کہ یہ قبریں شہر
(اجودھیا) ہی میں ہیں۔

مزار حضرت جلال الدین

حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کے احاطہ کے پچھم جانب جو دو
احاطہ ہے۔ اس احاطہ میں حضرت جلال الدین ہمشیرزادہ حضرت خواجہ
بہاء الدین نقشبند (رحمۃ اللہ علیہ) کی قبر بتائی جاتی ہے۔

کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ جملہ علوم میں حاضر اور جمیع علوم میں ماہر تھے، کئی شرح
کتاب الرشاد، بدیع البیان، بحر مواج، تفسیر قرآن مجید، رسالہ در تقسیم علوم وغیرہ
تصنیفات ہیں۔ آپکا شمار ابراہیم شاہی دور کے زبردست شعراء میں ہوتا تھا۔ با
ابراہیم شرقی کی وفات سے دو سال قبل ۸۴۰ ہجری مطابق ۱۴۳۸ء میں انتق
(تاریخ فرشتہ جلد اول) اور محلہ رضویخان متصل جنوبی دروازہ مسجد اٹالہ مدفون ہو
آپکی قبر سابق مشن اسکول اور موجودہ راجہ کالج کے احاطہ کے اندر آج بھی موجود ہے۔ ا
آپکے مکان اور مدرسہ کا نشان بھی باقی نہ رہا ہے اور نہ اب آپکی کوئی اولاد باقی ہے۔
(تجلی نور دوم صفحات ۳۳ تا ۴۰، بحر زخار، اخبار الاخبار، تاریخ فرشتہ جلد
خزینۃ الاصفیا، کشف الظنون، لطائف اشرفی، سبحۃ المرجان، تاریخ بندجون
وغیرہ) ——— مؤلف

کی قبر بھی حضرت شیث علیہ السلام کی قبر کی طرح گول بنی ہوئی ہے لیکن اس قبر
کی لمبائی حضرت شیث علیہ السلام کی قبر کی لمبائی سے کم ہے اتنی ہی قد و گرد گول،
علاوہ مزار حضرت شیث علیہ السلام کے اس علاقہ میں کوئی دوسری قبر نہیں
مولوی عبدالغفار نے اپنی کتاب گم گشتہ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ آپکا
وصال ۱۹ رجب المرجب ۷۰۲ ہجری قدسی بروز جمعرات ہوا تھا۔

مولوی عبدالغفار صاحب نے اپنے دادا مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم کے
حوالہ سے نقل کیا ہے۔ گم گشتہ حالات اجودھیا میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت
جلال الدین ہمشیر زادہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند (رحمۃ اللہ علیہ) سلطان سکندر
لودی کے مرشد تھے۔ اور بادشاہ کے ہمراہ اجودھیا تشریف لائے تھے۔ نیز آپ
ہی کے حکم سے سلطان نے احاطہ درگاہ اور قبر حضرت شیث علیہ السلام کو پختہ کرا کر
ایک آراضی برائے مصارف درگاہ عطا فرمایا تھا۔[۱۳۲]

تاریخ فرشتہ جلد اول کے مطابق سلطان سکندر لودی کی اودھ میں آمد ورفت ۸۹۷ھ
ہجری میں ہوئی تھی۔ اور ایکماہ کامل اس نے اودھ میں بسر کیا تھا۔ (یہ ماہ اپریل
و مئی ۱۴۹۲ء یا ماہ رجب ۸۹۷ ہجری تھا۔ مؤلف) یہاں تک حقائق تاریخ سے
مطابقت کرتے ہیں۔ لیکن جب آپکی تاریخ وفات ۱۹ رجب ۷۰۲ ہجری یوم پنجشنبہ
پر نظر پڑتی ہے تو مولوی صاحب کی علمیت اور تاریخ دانی کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ اور ان پر
یہ مثل صادق آتی ہے کہ "دروغ گو را یاد داشت نہ دارد" یعنی سلطان سکندر لودی
کے اودھ میں آنے کا زمانہ ۸۹۷ ہجری تھا۔ اس وقت حضرت جلال الدین صاحب

۱۳۲ صفحہ ۱۰

کو انتقال کئے ہوئے سوا دو سو سال گذر چکے تھے۔ دوسری علمی بات
ہے کہ ۱۹ رجب ۷۰۲ ہجری کو پنجشنبہ کا نہیں بلکہ دوشنبہ کا دن تھا اور
۱۲۷۶ کی ۲۹ ویں تاریخ تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی عبد الغفار صاحب کو اس قدر غلط بیانی
سے کیا حاصل رہا؟ آپکی اس غلط بیانی کے منکشف ہو جانے کے بعد حضرت
جلال الدین کی تبلائی جانے والی قبر کی حیثیت کیا رہ جائیگی؟ کیا یہ عقل میں
آنے والی بات ہے کہ آپ کے مرنے کے سوا دو سو برس بعد اپنی کسی کرامت
سلطان سکندر لودی کے ہمراہ اودھ میں تشریف لائے تھے؟ اور احاطہ درگاہ
و قبر حضرت شیث علیہ السلام کو پختہ کرانے کا حکم دیا تھا ۷۰۲ ہجری کا زمانہ
غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت کا آخری زمانہ ہے۔

حضرت جلال الدین کی بتائی جانے والی قبر کے ساتھ چار قبریں اور
جو کافی بوسیدہ اور رختہ ہیں۔ ان چاروں قبروں کے بارے میں یہاں کسی کو
معلومات نہیں کہ یہ کن اصحاب کی قبریں ہیں جنھیں آپ کے قریب میں دفن کیا گیا
تھا؟

سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات کے بموجب جب سلطان سکندر لودی
حضرت شیث علیہ السلام کی قبر اور درگاہ کی مرمت کرا رہا تھا۔ اسی زمانہ
میں اس نے حضرت جلال الدین کی قبر تبلائی جانے والی قبر کو بھی بنوا دیا۔
لیکن سلطان نے کسی شخص کی قبر تسلیم کر کے بنوایا تھا؟ یہ راز فراموشی کے
غار میں دفن ہو چکا ہے۔

...اہ شفا

حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کے احاطہ کے پورب جانب
ایک چھوٹا سا احاطہ ہے محمد ہاشم انصاری صاحب نے مؤلف
...لایا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس چھوٹے سے احاطہ کے
...زمانۂ ماضی میں ایک کنواں تھا جس کا پانی اس قدر ٹھنڈا اور میٹھا تھا کہ
...شریف میں آنے والے زائرین اسکی ٹھنڈک، شیرینی، اور فرحت بخش تاثیر
...عجب ہوتے تھے۔

حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کی قربت سے اس پانی میں شفا تھی
...یماری اور آسیبی شکایات میں اس کنوئیں کا پانی لیجا کر مریض کو پلاتے تھے
...یض کو پلاتے تھے اللہ تعالی شفا دیدیا تھا

اب اس احاطہ کے اندر کوئی کنواں موجود نہیں ہے۔ زمانۂ ماضی میں لوگ
...س کو "چاہ شفا" کے نام سے پکارتے تھے۔

"چاہ شفا" کس زمانہ میں پاٹا گیا یا بند کیا گیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہ
...لبتہ اس چھوٹے احاطہ کے اندر دیوار کے پاس دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے
...جگہ "چاہ شفا" ہوگا۔

...سنگی کتبہ

اس احاطہ کی مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک سرخ پتھر کا کتبہ رکھا ہوا ہے
...با سوا میٹر لمبا اور ایک گز چوڑا ہوگا اس پتھر پر یہ عبارت جلی حرفوں میں
...ہے:-

هوالباقی یامحسن قد جاءَ المسیٔ

جو خان بہادر آیایت نشاں | جلوہ شد فربائے باغ جناں
بجستند تاریخ از نام او | بفرمود ہاتف کہ تمکیں خاں

۶۵۱ + ۵۳۰
۱۱۸۱ ہجری

قطعہ تاریخ وفات کا یہ سنگی کتبہ پہلے کس جگہ نصب تھا؟ باوجود تحقیق کے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ محمد ہاشم انصاری اور بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بچپن سے اس کتبہ کو اسی جگہ رکھا ہوا دیکھ رہے ہیں جو دیوار کے سہارے ٹکا ہوا ہے۔

مادہ تاریخ ,, تمکین خاں ،، سے ۱۱۸۱ ہجری کا سن نکلتا ہے جو نواب شجاع الدولہ کا آخری عہد حکومت کا زمانہ ہے یہ کتبہ نواب شجاع الدولہ کے امیر تمکین خاں کی مزار پر نصب رہا ہوگا۔ جو اسی دیار میں کسی جگہ رہی ہوگی۔ جب مزار کسی طرح حادثات زمانہ کا شکار ہوئی تو کسی نے کتبہ کو اس جگہ سے اٹھا کر یہاں لاکر رکھ دیا ہوگا اور تب سے وہ اسی جگہ پر رکھا ہوا ہے۔

مزار خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء

درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے باہر دکھن جانب ٹیلے کی بلندی پر جہاں آج بھی سیکڑوں سال پرانے املی کے درخت موجود ہیں اور جسکے اردگرد خود رو جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ املی کے ان درختوں کے نیچے ایک انتہائی بوسیدہ چبوترہ ہے اس چبوترہ پر ایک پختہ قبر ہے جو بڑی خستہ حال

میں ہے اس قبر کے متعلق محمد ہاشم انصاری صاحب نے مؤلف کو بتلایا کہ یہ صاحب مزار حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں بھی اس قبر کو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ کی لکھا ہے لیکن نام اور دیگر ضروری تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار اکثر درویش قسم کے لوگ اس مقام پر کچھ وقفہ کیلئے آتے ہوئے اکثر لوگوں نے دیکھا ہے

صاحب مزار کا نام جن ضعیف العمر لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی سب نے لاعلمی ظاہر کیا اور کہا کہ وہ صاحب مزار کا نام تو نہیں جانتے لیکن اپنے آباء واجداد سے یہی سنتے چلے آرہے ہیں کہ یہ مزار حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ کا مزار ہے اور یہ صاحب کرامت بزرگ ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے آپکا ذکر خواجہ ضیاء الدین بخشی کے نام سے کیا ہے جو شاید کتابت کی غلطی ہے یا پھر عدم واقفیت کی بناء پر بخشی کا لفظ اضافہ کر دیا گیا ہے آپکا ذکر مؤلف کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔

مزار اولیاء اللہ

اس جگہ سے دکھن جانب کنکر کے ایک چبوترے پر ایک بہت پرانی قبر ہے جسے لوگ ایک اولیاء اللہ کا مزار کہتے ہیں لیکن کس اولیاء اللہ کا مزار ہے یہ کوئی نہیں جانتا ۱۹۰۲ تک اس چبوترہ پر دو بہت پرانے درخت موجود تھے ایک درخت املی کا تھا اور دوسرا کھرنی کا جسے متعلقہ لوگوں نے فروخت کر ڈالا اور خریدار نے کٹوالیا۔

اولیاء اللہ یا بزرگوں کے مزارات

درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے اتر جانب عام راستے کے کنارے ہی داہنے ہاتھ پر کچھ پختہ قبریں ہیں جو زمانۂ قدیم سے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمام قبریں اولیاء اللہ کی ہیں اور کچھ لوگ باکمال بزرگوں کی قبریں بتلاتے ہیں۔ مؤلف نے اکثر لوگوں کو ان مزارات پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان قبروں کے متعلق نہ تو کسی کتاب میں کوئی ذکر ملتا ہے اور نہ یہاں کے لوگوں کو ہی کچھ معلوم ہے۔

یہاں کے لوگوں نے بتلایا کہ جب بھی حضرت شیث علیہ السلام کی درگاہ کی سفیدی ہوتی ہے اس وقت لازمی طور پر ان قبروں پر بھی سفیدی کی جاتی ہے لیکن اس عمل سے صاحب قبر کی اہمیت نمایاں نہیں ہوتی۔ مزارات کو فی الوقت دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادھر کئی سالوں سے سفیدی نہیں کی گئی ہے فی الوقت اس جگہ پر پانچ قبریں ہیں۔

گدی شاہ کا قبرستان

نالہ تلئی اور پختہ سڑک کے اتر جانب زمانۂ ماضی میں گدی شاہ کا قبرستان نام کا ایک وسیع قبرستان تھا جس میں بیشمار پختہ اور خام قبریں تھیں لیکن فی الوقت اس قبرستان کا رقبہ بہت کم رہ گیا ہے اور اب یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ کسی زمانہ میں اس جگہ کوئی قبرستان تھا۔

سرگذشت دل بیتاب نہ لاؤ لب پر
یہ حکایات نگاہوں سے کہی جاتی ہیں

مسجد پانچی شاہ یا مسجد پانچی ٹولہ

موجودہ فیض آباد اجودھیا روڈ جو ساکیت ڈگری کالج. کالرا اسپتال وغیرہ کے سامنے سے گذرتی ہوئی اجودھیا میں دریائے گھاگھرا کے کنارے تک چلی گئی ہے۔ اسی سڑک پر مومن انصاریوں کا قدیم محلہ ہے ۱۳۰۔ جسے پانچی ٹولہ کہتے ہیں۔ اس محلہ کے پورب جانب قدیم محلہ "دلارے رائے کی کٹیا" ہے جو اب کثرت استعمال سے صرف کٹیا کہا جانے لگا۔ اس محلہ کی مسجد کو جو سڑک اتر جانب ہے مسجد پانچی ٹولہ کہلاتی ہے۔

اسی محلہ کے نور بافاں کے مقابل سڑک کے دوسری جانب پچھمی گوشہ میں محلہ قصیانہ میں ہے۔[۱۳۲]

۱۳۲۔ زمانۂ ماضی میں یہ محلہ بازار شیر جنگ سے ملا ہوا تھا اور اسی کا آخری حصہ تھا۔ لیکن انقلابات زمانہ کے ہاتھوں یہ تمام علاقہ تباہ و برباد ہو چکا ہے مجھے اس محلہ کو دیکھنے کے بعد یہ شبہہ نہیں ہوتا کہ یہ علاقہ کبھی بازار شیر جنگ کا آباد اور بارونق حصہ بھی رہا ہوگا۔ مولوی عبد الغفار کے علاوہ کسی نے بھی اس علاقہ کا "محلہ نور بافاں" کے نام سے ذکر نہیں کیا ہے۔ منشی لچھمی نرائن صدر قانون گو نے بھی اپنی کتاب تاریخ اجودھیا میں اس محلہ کا نام "محلہ نور بافاں" نہیں لکھا ہے مولوی غفار دخت کا اختراعی نام ہو جو انکے ذہنی زاویہ کا مظہر ہو کیونکہ اب مولوی صاحب موصوف انصاری سے سید آل نبی تبدیل ہو رہے ہیں۔ مؤلف

خانقاہ و مزارات پیر رحیم الدین و پیر کریم الدین

محلہ قضیانہ میں فی الوقت محمد یوسف قریشی کے مکان کے سامنے فیض آباد اجودھیا روڈ پر لب سڑک پیر رحیم الدین اور پیر کریم الدین صاحبان کی مشہور خانقاہ تھی۔ لوگ ابتک اس خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری اور مرحوم نے بھی اس خانقاہ کا ذکر کیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری دہائیوں تک اس خانقاہ کو بوسیدہ چہار دیواری موجود تھی لیکن اب اس کے آثار تک معدوم ہو چکے ہیں۔ البتہ ایک بوسیدہ چبوترہ پر چند شکستہ قبریں موجود ہیں جنکے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں ہے کہ یہ کن صحاب کی قبریں ہیں۔

شیخ کریم الدین کے متعلق اتنی معلومات ضرور حاصل ہوئی کہ آپ حضرت جمال الدین اولیا کے خلیفہ تھے۔[۱]

مزار میر جینا

محمد ہاشم انصاری صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے دوسری جانب فیض آباد اجودھیا روڈ پر لب سڑک کمھار مندر کے سامنے اور

---

[۱] حضرت جمال الدین اولیاء حضرت مظفر بلخی کے خلیفہ تھے اور حضرت مظفر بلخی حضرت شاہ شرف الدین یحیٰی منیری کے خلیفہ مجاز تھے مؤلف

مسجد باجنی ٹولہ کے اتر جانب پاکر کے درخت کے نیچے ایک پختہ چبوترہ پر کسی صاحب کی قبر ہے۔ لوگ اس قبر کو میر جینا کی قبر کہتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔

میر جینا کے زمانہ کا تعین تو نہیں جا سکا لیکن عوام میں مشہور روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے وقت کے مشائخ میں سے تھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ انھیں اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ایک مدرسہ اور خانقاہ بھی اسی جگہ تھی۔

مولوی عبدالغفار نے میر جینا کا ذکر میرا جینا کے نام سے کیا ہے لیکن دیگر حالات پر وہ کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔ کاش ایسی ہی احتیاط وہ دوسری جگہوں پر بھی کر سکتے۔!

مزار باجنی شاہ

کہتے ہیں کہ باجنی شاہ درویش کا زمانہ شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ ابتدائی ہے۔ (یعنی ۱۷۸۰-۱۸۰۶ء) یہ اجودھیا کے مشائخ میں محترم شخص تھے اور زہد و تقویٰ میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ بیعت کا سلسلہ باوجود تحقیق و جستجو کے معلوم نہ ہو سکا لیکن آپکے مریدین اور خلفاء کا ہونا ثابت ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نواب شاہ کے آخری عہد میں کسی مقام سے اجودھیا تشریف لائے تھے

مسجد باجنی ٹولہ کے دکھن جانب آپ کا مزار تھا لیکن جب فیض آباد اجودھیا روڈ بننے لگی آپکا مزار سڑک میں آگیا اب ایک عرصۂ دراز گذر جانے کے بعد وہ لوگ

بھی باقی نہیں رہ گئے ۔ جنکو معلوم تھا کہ پانجی شاہ کا مزار جنکے نام سے پانجی ٹولہ کا
آباد ہوا تھا، موجودہ سڑک میں کس جگہ تھا؟

پانجی شاہ کے سلسلہ یا دیگر خاندانی و علمی حالات کے بارے میں کوئی تفصیل
نہ حاصل ہوسکی ماسوا اس کے کہ آپ ایک صاحبِ کمال اور صاحب کشف بزرگ
تھے اور زمانۂ حیات اور بعد وفات لوگ آپکے روحانی فیوض و برکات سے
زمانہ تک مستفیض ہوتے رہے ہیں ۔

مزار بہار شاہ

اسی مسجد پانجی ٹولہ کے پچھم جانب ایک قدیم اور بوسیدہ چبوترہ پر کسی بہار شاہ نامی
بزرگ کی لوگ قبر بتاتے ہیں مؤلف نے اکثر لوگوں کو اس مزار پر فاتحہ خوانی کرتے
پھول چڑھانے اور اگر بتیاں سلگاتے ہوئے دیکھا ہے ۔ اب لوگ بہار شاہ کو
پہاڑ شاہ کہنے لگے ہیں آپکا ذکر مؤلف نے کسی مستند تاریخی کتاب میں نہیں دیکھا

مزار مکی شاہ

انھیں بہار شاہ یا پہاڑ شاہ کی مزار کے دکھن جانب ایک
قدیم چبوترہ پر ایک مزار ہے جسے لوگ مکی شاہ کا مزار بتاتے
ہیں۔ اس محلہ کے ضعیف العمر لوگ بتلاتے ہیں کہ انکے بچپن کے زمانہ تک اس جگہ
پر کئی سایہ دار نیم کے درخت تھے اور یہ جگہ بڑی پُر فضا تھی لیکن فی الوقت اس
جگہ پر نہ کوئی سایہ دار نیم کا درخت ہے اور نہ اس جگہ کی فضا پُر فضا ہے ۔

مکی شاہ کے بارے میں بعض لوگوں نے مؤلف کو بتایا کہ انھوں نے اپنے
بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ عربی تھے اور ملک عرب کے کسی دیار شہر اور د

تشریف لائے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ آپکو بکی شاہ کہنے لگے تھے آپ کے اصل نام سے کسی کو واقفیت نہیں ہے آپ کس زمانہ میں اجودھیا تشریف لائے تھے کب انتقال فرمایا؟ اس کے متعلق کوئی معلومات نہ ہوسکی

مزار قطب شاہ

مسجد باکچی ٹولہ سے تھوڑا آگے فیض آباد اجودھیا روڈ ہی پر شہر اجودھیا کیطرف چلئے تو تکیہ قبرستان میں حضرت قطب شاہ کا مزار ملے گا۔ (یعنی سری رام اسپتال کے پورب جانب کے قبرستان میں) یہ قبر ابتک موجود ہے۔

قطب شاہ حضرت پاتی شاہ کے خلیفہ مجاز تھے انکے خرق عادات کے قصے جو سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں اکثر ضعیف العمر لوگ بڑی عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔ آپ کے بارے میں لوگ بتلاتے ہیں کہ آزاد منش درویش تھے۔

پنجشنبہ کے دن خصوصاً کچھ لوگوں کو مؤلف نے اس مزار پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ تقریباً ڈھائی سو سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ آپکا انتقال ہوا تھا لیکن سن وفات یا زمانہ اقتدار حکومت کوئی نہیں بتلاتا اور نہ ہی آپ کے دوسرے حالات کا کسی کو کوئی علم ہے۔

مزار پاتی شاہ: سری رام اسپتال کے پورب جانب کے قبرستان میں کھر دینا تالاب کے اتر جانب قطب شاہ کے پیر مرشد پاتی شاہ کا مزار ہے۔ آپ بھی آزاد منش درویش تھے۔ آپکی قبر کے پورب جانب کھر دینا نامی تالاب ہے اس تالاب سے متصل پورب جانب

جلوا آن پور نامی محلہ آباد ہوگیا ہے۔ دکھن جانب اب سے تقریباً ایکسو سال قبل اس جگہ پر ایک بہت بڑی خانقاہ کے باقیات موجود تھے۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے اس خانقاہ کے آثار و باقیات اور ایک بلند پھاٹک کے موجود ہونے کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔

جہاں تک کہ مؤلف کے مشاہدہ کا تعلق ہے یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ خانقاہ کہلانے والی عمارت کے آثار و باقیات کسی حویلی کے ہی ہوں

اجودھیا کے معمر بزرگ بتلاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس جگہ پر زمانۂ ماضی میں ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس میں ہزاروں پختہ قبریں زمانۂ قدیم کی موجود تھیں۔ انقلابات زمانہ کے بیدرد ہاتھوں نے اس وسیع قبرستان اور عظیم الشان خانقاہ کو اسطرح تباہ و برباد کیا کہ اب انکا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ البتہ اس وسیع قبرستان میں واقع ایک مسجد کے باقیات ابتک موجود ہیں۔ زمانۂ ماضی کا وسیع قبرستان اور عظیم الشان خانقاہ اب کھیت اور باغوں میں تبدیل ہوچکا ہے۔

روضہ زین العابدین

گر بارنہ ہو خلل الٰہی سے کروں عرض

کچھ دھوم سے ذہنوں میں رنایا کے اٹھے ہیں

موجودہ سری رام اسپتال اور محلہ پانجی تولہ سے جو سڑک اجودھیا ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اس کے دتر ا ہے، پر گنبد بخشی بابا کے طرز پر بنا ہوا تقریباً اتنا ہی بڑا ایک عظیم الشان مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ اور گنبد بخشی بابا کو بغور

ے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقابر کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی ہے اور یہ بھی
ت ہے کہ ان دونوں مقابر کے بنانے والے معمار بھی ایک ہی رہے ہوں
بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ گنبد بخشی بابا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ گنبد بخشی کی
خت پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ روضہ زین العابدین پر محلّہ کے مسلمانوں
وجہ دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روضہ زین العابدین آبادی کے اندر ہے
وقت لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑتی رہتی ہیں اور شکست و ریخت کی شروعات
لوگوں کی نگاہیں پڑتی رہی ہیں۔ اور گنبد بخشی بابا آبادی سے باہر ویران و سنسان
پر ہونیکہ وجہ سے اسکی شکستگی اور موسم کے اثرات کی تباہ کاری پر لوگوں کی نگاہیں
ں پڑتیں۔ جب کوئی حصہ شکستہ ہوکر اس حالت پر پہنچ جاتا ہے کہ ناقابل مرمت
تا ہے اس وقت لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بدیں وجہ روضہ زین العابدین
الت گنبد بخشی بابا سے بہتر ہے۔

یہ مقبرہ جو اس وقت روضہ زین العابدین کے نام سے مشہور ہے زمانہ ماضی میں
اسے "مقبرہ بجلی شہید" کہتے ہیں۔ مولوی عبدالغفار نے گم گشتہ حالات اجودھیا
س مقبرہ کا ذکر "مقبرہ بجلیا شہید" کے نام سے کیا ہے ادھر دس بارہ سال سے
ٹیا کے مسلمان آپس میں چندہ کرکے ہر سال ماہ شعبان کی چوبیس کی تاریخ کو عرس
ہیں۔ تقاریب عرس صبح سے شروع ہوکر رات کو ختم ہوتی ہیں۔ مراسم عرس ادا
نے کے بعد راتوں کو مولویوں کی تقاریر کے بعد محفل سماع منعقد ہوتی ہے جو اکثر صبح
بھی رہتی ہے۔

مسجد حضرت زین العابدین

مقبرہ حضرت زین العابدین (بجلی شہید) کے دروازہ کے سامنے پچھم جا
ساٹھ ستر میٹر کے فاصلہ پر زمانۂ قدیم کی ایک مسجد ہے جس کے صحن میں ایک قبر ہے
کہتے ہیں کہ یہ بھی کسی بزرگ کی قبر ہے

مزار بنی بنا شاہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے اندر جو قبر ہے وہ حضرت بنی بنا شاہ نامی بزرگ کی
حضرت بنی بنا شاہ کے متعلق یہاں کوئی شخص کچھ نہیں جانتا عوام نے جو کچھ
لوگوں سے رٹا رٹایا سنا ہے اس کو دستاویزی حیثیت سے بیان کرنے کی کوشش کر
ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر شخص کچھ گھٹا بڑھا کر بیان کرتے ہیں کسی کتاب میں حضر
بنی بنا شاہ،، کا کوئی ذکر مؤلف کو نہیں ملا۔

پہلے اس جگہ پر تین احاطے تھے۔ مسجد زین العابدین کے صحن میں لوگ حضر
بنی بنا شاہ کی قبر بتاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے احاطے میں جو قبریں تھیں اب ا
نشانات معدوم ہو چکے ہیں۔

مزار سیّد جلال شاہ

تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت
شاہ جلال کی قبر حضرت پائی شاہ کے تکیہ کے اندر ایک احاطہ میں واقع ہے۔ لیک

یہاں کسی احاطہ کے آثار و باقیات کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ صرف مزار
موجودہ برلامندر کے پورب اور دکھن کے کونے پر موجود ہے۔ بہت کم لوگ
جنھیں بائی شاہ کے مزار کے صحیح محل وقوع کا علم ہے۔ عام لوگ تو اس
دوسری مزاروں کیطرح،، کسی شہید مرد،، کی مزار ہونا جانتے ہیں باوجود تحقیق
جلال شاہ کے متعلق بھی کوئی معلومات نہ حاصل ہوسکی اور نہ آپکا زمانہ ہی معلوم

ار شاہ بدیع الدین

اس وقت جس مقام پر برلامندر بنا ہوا ہے زمانہ ماضی میں قبرستان تھا جس
دار محبوب شاہ تھے محبوب شاہ کے مرنے کے بعد انکے لڑکے عظیم اللہ شاہ
ستان کو فروخت کر ڈالا۔ اسی قبرستان کے اتر جانب ہنومان گڑھی محلہ
پہلے دکھن جانب ایک باغ تھا جس میں شاہ بدیع الدین کا مزار تھا۔
نہ جانے کب کا ختم ہو چکا ہے البتہ مزار خستہ حالت میں ابتک موجود ہے
یع الدین کے متعلق گم گشتہ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ آپ دار العلم
کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت اورنگ زیب (رحمۃ اللہ علیہ) کے
مت میں آپکا شمار اس وقت کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔
کی آرام گاہ اسی قبرستان کے اتر جانب محلہ ہنومان گڑھی کے دکھن جانب
باغ میں تھی اور آپکی مزار پر خوشبودار پھولوں کے پودے لگے ہوئے
لیکن اب نہ یہاں کوئی باغ ہے اور نہ قبر پر خوشبودار پودے لگے ہوئے

ہیں۔ بس مزار بوسیدہ حالت میں ابتک موجود ہے

اب فیض آباد اجودھیا روڈ سے اجودھیا شہر کیطرف چلیئے اور اجودھ
شہر کی موجودہ کوتوالی کی عمارت کے پاس آیئے۔

مقبرۂ تین درویش

اجودھیا شہر کی موجودہ کوتوالی کی عمارت سے ملحق پورب جانب سے ایک گلی دکھ
جانب کو گئی ہے۔ کوتوالی کے سامنے والے پوربی کونے سے اس گلی میں دک
جانب دس پندرہ میٹر اندر کی جانب چلیئے تو بائیں ہاتھ پہ ایک میدان ا
ایک عظیم الشان مقبرہ ملتا ہے جو طرز تعمیر میں روضۂ زین العابدین اور گنب
بخشی بابا بجلی شہید) کے مثل ہے اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ان دونوں
کے ساتھ ہی یا اسی زمانہ میں اس مقبرہ کی بھی تعمیر ہوئی ہے یا یہ مقبرہ متن

---

۱۲۵ تاریخ شیراز ہند جونپور مصنفہ سید اقبال احمد مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ طبع اول سن ۱۹۶۳
میں شاہ بدیع الدین نام کے کسی شیخ کا کوئی ذکر نہیں اور نہ عہد عالمگیری کے جن نو
خانقاہوں کا ذکر متذکرہ بالا کتاب میں کیا گیا ہے اس میں بھی آپ کا
کہیں ذکر نہیں آیا ہے پتہ نہیں مولوی عبد الغفار نے کہاں سے
سند لکھ دیا ہے کہ شاہ بدیع الدین جونپور کے رہنے والے
تھے اور آپکا شمار اس وقت کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ مؤلف

دونوں مقابرہ کے قریب ترین زمانہ میں تعمیر کیا گیا ہوگا۔

اس مقبرہ کے اندر تین قبریں ہیں۔ مؤلف کو ان تینوں قبروں کے پاس جلی ہوئی اگربتیوں کے گل جھاڑ دیئے ہوئے فرش کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں حاجتمند اور عقیدتمند برابر آتے رہتے ہیں ان قبروں میں کون بزرگ یا لوگ آرام فرما ہیں؟ اس کا ذکر نہ تو کسی کتاب میں ملتا ہے نہ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم ہو سکا۔

محمد ہاشم انصاری صاحب جو اجودھیا کے عوام کے پرخلوص اور بے لوث سماجی اور ملی کارکن ہیں اور راجودھیا سے متعلق مولوی عبدالغفار انصاری سے بہت زیادہ معتبر اور وسیع معلومات رکھتے ہیں انھیں کی زبانی مؤلف کو معلوم ہوا کہ اس مقبرہ کو لوگ "تین درویش کا مقبرہ" کہتے ہیں اکثر بزرگوں نے بھی بتایا کہ فی زمانہ لوگ اسے تین درویش کا مقبرہ ہی کہتے ہیں۔ البتہ زمانۂ ماضی میں لوگ اس مقبرہ کو کس نام سے پکارتے تھے وہ نہیں جانتے اور نہ انھوں نے اپنے کسی گرو سے ہی اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

اس مقبرہ اور نوگزی قبر کے علاقہ کو مؤلف نے محمد ہاشم انصاری کے ساتھ اور انھیں کی رہنمائی اور رہبری میں ماہ جولائی ۱۹۷۰ء کے تیسرے ہفتہ کی تاریخوں میں دیکھا تھا۔ اس وقت کئی دنوں سے موسم خراب تھا تیز موسلادھار بارش ہو رہی تھی سامنے کا میدان برساتی پانی اور جھکوڑ کے خودرو پودوں سے بھرا ہوا تھا یہ میدان قدرے نشیبی ہونے کی وجہ

ے برساتی پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یا اس کی آبادی کے رہنے والے مردوں عورتوں اور بچوں نے
اس میدان میں اسقدر پاخانہ کر رکھا تھا کہ چند قدم چلنا دشوار تھا۔ بارش کے پانی نے تو سارے میدان
کو غلاظت سے بھر دیا تھا اس میدان میں بھی بہت سی قبروں کے نشانات موجود تھے۔ جو زمانہ قدیم
کی ہیں۔ اس میدان میں متصل آبادی کو اب محلہ نوگزی قبر کہتے ہیں۔

نوگزی قبر

اس مقبرہ کے دکھن جانب تقریباً ایک سو میٹر کے فاصلہ پر وہ مشہور قبر ہے جسے
زمانۂ دراز سے لوگ نوگزی قبر کہتے چلے آ رہے ہیں۔ مذکورہ قبر ایک چہار دیواری
کے اندر ہے۔ جسکی اونچائی تقریباً ایک گز ہے قبر مذکور ایک پختہ چبوترے پر بنی ہوئی
ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ قبر کسی انسان کی نہیں ہے بلکہ حضرت نوح علیہ السلام
کی کشتی کے ٹکڑوں کی قبر ہے[۱۳۶]

ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جس جگہ پر نوگزی قبر بنی ہوئی ہے اسی جگہ زمین
کے نیچے کشتیٔ نوح علیہ السلام کے آٹھ ٹکڑے پائے گئے تھے۔ جسے کسی نوری شاہ
نامی شخص نے دوبارہ دفن کر کے قبر کی شکل بنا دیا لیکن اس بات کا پتہ نہیں چلتا
کہ یہ واقعہ کس زمانہ میں ہوا تھا؟ نوری شاہ کون تھا اور کن سائنٹفک ذرائع سے یہ معلوم
کر کے تصدیق کی گئی کہ لکڑی کے وہ ٹکڑے جو اس جگہ زیر زمین پائے گئے تھے حقیقتاً
حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہی کے ٹکڑے تھے؟

بہرحال عوام میں یہ قبر نوگزی قبر کے نام سے مشہور ہے لیکن پیمائش میں چودہ
گز سے زیادہ ہے

---

۱۳۶ صفحہ ۱۳

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ قبر حضرت ہند علیہ السلام کی ہے کیونکہ یہ قبرستان جس میں نوگزی قبر واقع ہے بنی نوح کا قبرستان کہلاتا ہے۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے بھی یہی روایت کیا ہے کہ یہ کشتی نوح کے ٹکڑوں کی قبر ہے۔

نوگزی قبر کی اصل وحقیقت ہر زمانہ میں پوشیدہ رہی ہے۔ باصلاحیت ذہن کی دوراندیش شخصیتوں کے اتحاد واتفاق کا یہ شاہکار، اپنے منسوب الیہ کی شخصیت کی عظمت واحترام کے تفیل ہمیشہ نقد وتبصرہ سے بالاتر رہا۔

نوگزی قبر وہم واعتقاد کا سنگم سہی، لیکن عقیدت وعقیدہ کی قلمرو میں شکوک و شبہات بھی خلاف ادب اور ممنوع ہیں۔ ہم اظہار خیال بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اس قبر کا کچھ "قریبی رشتہ" کشتی نوح سے جوڑنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ اس لیے آئیے ہم سنجیدگی ومتانت کے ساتھ کچھ امکانات پر بھی غور کرلیں۔

کشتی نوح کی حقیقت اور تلاش

طوفان نوح اور کشتی نوح کا ذکر قرآن مجید، توریت اور دیگر آسمانی کتابوں میں مرقوم ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ابتداءً انھیں ذرائع سے ہمیں طوفان نوح اور کشتی نوح کا علم ہوا تھا۔ لیکن اجودھیا میں کشتی نوح کا موجود ہونا یا اسکی لکڑی کے چند ٹکڑوں کو اجودھیا میں پائے جانے کے امکان کا ہم قدیم وجدید تحقیقات کی روشنی میں ایک سرسری جائزہ لینا ضرور چاہتے ہیں، اور معلومہ حقائق وتحقیقات کی ٹھوس بنیادوں پر ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اجودھیا یا اس کے گرد ونواح کے کسی علاقہ میں کشتی نوح کا پایا جانا ممکن بھی ہے؟ کیا طوفان نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، اجودھیا میں ہی موجود کسی پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہری تھی؟

کشتیٔ نوح اور کوہ ارارط

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے درمیان جب علم و تحقیق کے افق کچھ روشن ہوئے اور تحقیق و جستجو کے جذبہ کو سازگار حالات کا تعاون اور حوصلہ افزائیاں میں تو اہلِ جستجو نے کشتیٔ نوح کو بھی تلاش کرنا شروع کیا۔

سب سے پہلے، انیسویں صدی کی آخری دہائی میں مالا بار کے ایک پادری مسٹر نوری (NORRY) نے جو اُن دنوں ایران اور کردستان کی سیاحت کر رہے تھے۔ کشتیٔ نوح کو تلاش کرنے کا ارادہ کیا۔ قدیم کتابوں میں کشتیٔ نوح کے متعلق جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا۔ اس کے بموجب وہ جگہ بابل کے تباہ شدہ شہر سے آٹھ سو کیلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ مسٹر نوری (NORRY) کی شخصیت باوقار اور قابلِ اعتماد تھی اُسے دنیا کی بارہ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اُس نے چین، برما، آسٹریلیا، افریقہ اور یورپ کی سیاحت کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا، کشتیٔ نوح کے بارے میں تذکرہ ضرور کرتا۔

مسٹر ناری تین مرتبہ کھوج لگانے میں ناکام رہا۔ وہ اپنی ناکامیوں سے پست حوصلہ نہیں ہوا۔ آخر کار وہ چوتھی مرتبہ کامیاب ہوگیا۔ وہ لکھتا ہے۔

"پانچ ہزار برس پرانی کشتی میری نظروں کے سامنے تھی وہ نصف کے قریب جھیل میں تھی اور بقیہ نصف حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسکی پیمائش کی تو اُسے توریت میں دی گئی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کے عین مطابق پایا۔"

کوہِ اراراط کی ایک اور تصدیق

ناروے کے مشہور سیاح ڈاکٹر نان سین نے بھی مسٹر نارک کے بیان کی تصدیق کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "آرمینیاں اور مشرق قریب" کے صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے کہ کشتیٔ نوح کوہ ارارات پر موجود ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں میں نے اسے بار بار دیکھا ہے۔ یہ کشتی پانچ سو پچیس فٹ لمبی، ستاسی فٹ چوڑی اور ساڑھے باون فٹ اونچی ہے، اور اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔

کلاڈیس جیمز نے جو ۱۸۰۰ء میں بغداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب "کردستان میں قیام" جلد دوم میں لکھا ہے کہ حسین آغا نے مجھے بتایا کہ اُس نے کوہ ارارات پر موجود کشتیٔ نوح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ کوہِ اراراط پر واقع عیسائیوں کے ایک گاؤں سے ایک تنگ راستہ پر ایک گھنٹہ چلنے کے بعد کشتیٔ نوح کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اُسکے سامنے ایک بہت بڑا جہاز تھا جو شکستہ ہو چکا تھا۔ اُس میں ایک ایک فٹ لمبے کیل نظر آ رہے تھے۔

حکومت ترکی کے ماہرین کا خیال

حکومت ترکی نے ۱۸۸۳ء میں کوہ ارارات پر ماہرین کی ایک ٹیم روانہ کی تھا جس کا مقصد اُس اچانک آنے والے طوفانوں کے اسباب معلوم کرنا تھا جنکی وجہ سے پہاڑ کے ارد گرد کی آبادی تباہ و برباد ہو جایا کرتی تھی۔ ماہرین کی اس جماعت کو کافی بلندی پر ایک جھیل کے کنارے برف میں دبا ہوا ایک سر نظر آیا تھا۔

اخبار کنگز ہرالڈ کی اطلاع

کشتی نوح کے بارے میں ایک اطلاع دونوں عالمی جنگ کے درمیان امریکہ ایک اخبار کنگز ہرالڈ (KINGS HERALD) میں شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ انقلاب روس سے کچھ عرصہ پیشتر روسی ہوابازوں کا ایک چھوٹا سا دستہ کوہ ارارات سے تقریباً چالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک عارضی ہوائی اڈے پر مقیم تھا۔ یہ اگست کے ایک دن کا واقعہ ہے اس دن گرمی بہت زیادہ تھی۔ کپتان نے بتایا کہ جہاز نمبر سات بلندی پر تجرباتی پرواز کیلئے بالکل تیار ہے۔ کپتان اور سکوونسکی کو جہاز اڑانے کا حکم ملا۔ ان کے ساتھ ایک معاون ہواباز بھی تھا۔ دونوں کافی دیر تک فضا میں چکر لگاتے ہوئے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے اور انھوں نے جہاز کا رخ کوہ ارارات کیطرف کر دیا۔ وہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے رہے کہ انھیں ایک نیلی جھیل دکھائی پڑی، جو شفاف نیلم کیطرح چمک رہی تھی۔ اس کے اطراف میں برف جمی ہوئی تھی۔ جب انکا جہاز جھیل کے اوپر سے گذر رہا تھا تو انکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، انھوں نے جھیل کے کنارے ایک بہت بڑی کشتی دیکھی جس کا بالائی حصہ گول تھا۔ عرشہ پر پانچ فٹ چوڑا ایک پُل بھی بنا ہوا تھا۔ نزدیک پرواز کرنے پر معلوم ہوا کہ کشتی کا تین چوتھائی حصہ زیر آب ہے۔ اور وہ ایک طرف سے شکستہ ہو چکی ہے۔ دوسری جانب ایک دروازہ تھا جو تقریباً بیس مربع فٹ تھا۔

جب روسی ہواباز کپتان اور سکوونسکی ہوائی اڈہ پر واپس پہنچا تو اس نے کپتان سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کپتان جہاز پر سوار ہو کر جھیل کے قریب پہنچا اور واپسی پر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کوہ ارارات پر جو کشتی انھوں نے دیکھی ہے وہ دراصل کشتی نوح ہے۔ جسکا تذکرہ اکثر پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔

شہنشاہ روس کی دلچسپی

روسی مشن نے اس کشتی کی تفصیلی اطلاع حکومت روس کو دیا۔ شہنشاہ روس زار نے حکم دیا کہ مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے بہتر ساز و سامان کے ساتھ مہم روانہ کی جائے۔ اس مہم نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک کشتی نوح کے قریب قیام کیا۔ اس کے نوٹو لئے پیمائش کیا اور خوب اچھی طرح اس کا جائزہ لیا۔ کشتی ایسی لکڑی کی بنی ہوئی تھی جو صرف قبرص (سائپرس) کے جنگلات ہی میں پائی جاتی ہے۔ اس پر جو روغن کیا گیا تھا اسمیں اس قدر چکنائی ملی ہوئی تھی کہ ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی چمک باقی تھی۔ نیچے کے کمرے وسیع و عریض تھے اور ان میں ذرذر نٹ موٹی لکڑی کے جنگلے لگے ہوئے تھے۔ جو شاید ہاتھیوں اور عظیم الجثہ جنگلی جانوروں کیلئے تھے۔ اوپر کا حصہ پرندوں کیلئے مخصوص تھا۔ کشتی کی کاریگری اور نفاست اعلیٰ تہذیب کی مظہر تھی۔

کشتی نوح کی اطلاع۔ آسٹریلیا ریڈیو سے

دوسری جنگ عظیم کے دوران دو آسٹریلوی ہوابازوں نے انگلستان کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کشتی نوح کی تصویریں دکھلایا تھا۔ آسٹریلیا ریڈیو اسٹیشن نے مزید بتلایا تھا کہ جنگ کے دوران نیو ساؤتھ ویلز کے مقام پر بورال کی ایک خاتون نے بتلایا تھا کہ وہ شاہی فضائیہ (ROYAL AIR FORCE) کے ایک ایسے نوجوان ہواباز کو جانتی ہے جس نے کوہ ارارات پر پرواز کی اور کشتی نوح کو قریب سے دیکھا ہے۔ بدقسمتی سے وہ نوجوان جلد ہی ایک حادثہ میں ہلاک ہوگیا، اور اس سے مزید معلومات نہ حاصل کیجا سکی۔

حکومت ترکی کے سروے کا نتیجہ

۱۹۶۰ء میں ترکی کا ایک ہوائی جہاز، جو ہوائی کیمروں سے لیس تھا، حکومت ترکی کے محکمہ دفاع کیلئے نقشہ بنانے کیلئے مشرقی ترکی کے پہاڑی علاقوں کا سروے کیا اور پندرہ ہزار فٹ کی بلندی سے ہزاروں منفیاں (NEGATIVES) لئے۔ دوران میں سے ایک منفی (NEGATIVE) کو دیکھ کر کیپٹن ڈیوریںار جو ترکی آرمی کے جیوڈٹک سروے ڈیپارٹمنٹ (GEODETIC SURVEY DEPARTMENT) کا ایک ماہر علمی انجینئر تھا، دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

کشتی نوح کوہ جودی پر

کوہ جودی کے پہاڑی سلسلہ پر تقریباً چھ ہزار فٹ کی بلندی پر جو نگیٹیوز حاصل کی گئی تھیں، ان میں لاوے سے بھرے ہوئے ایک چشمہ میں ایک گڑی ہوئی چیز نظر آرہی تھی جو ایک بڑے جہاز کے مماثل تھی۔ کیپٹن ڈیوریںار نے اپنے دوسرے اعلیٰ عہدیدار ساتھیوں کو وہ نگیٹیوز دکھلایا۔ سب لوگوں نے اس بات کی تصدیق کیا کہ جودی پہاڑ کے سلسلوں میں ایک بھاری جسامت والا جہاز موجود ہے۔ چنانچہ اس جہاز کی پیمائش کرنے اور اسکی تفصیلات معلوم کرنے کیلئے کارندے تیار کر دیئے گئے۔ نتائج بڑے تعجب خیز اور چونکا دینے والے تھے۔

یہ کشتی نوح کا عرض و طول ہے

کوہ جودی کے پہاڑی سلسلہ کی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر جو جہاز نظر آیا تھا وہ چار سو پچاس فٹ لمبا اور ایک سو پچاس فٹ چوڑا تھا۔ جہاز کی اندرونی پرچھائیوں کے اندازے کے موجب اُس کی اندرونی گہرائی سولہ سے اٹھارہ فٹ ہے۔ حالانکہ یہ جہاز ٹھوس لاوے کی وادی میں تقریباً چودہ فٹ کی گہرائی تک دھنسا ہوا تھا۔ نیز یہ بھی محسوس کیا گیا کہ لاوا جہاز کے اندر داخل نہیں ہوا کیونکہ لاوا اگر اندر جاتا تو اندرونی سطح کی اونچائی وہی ہوتی جو باہری سطح کی تھی۔

ہواسٹ یونیورسٹی کے ڈائرکٹر کا بیان

ہواسٹ یونیورسٹی کے ڈائرکٹر آرتھر براندٹن برگر نے نگیٹیوز کی جانچ کرنے کے بعد بیان دیا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ میں نے اس شئے سے تعلق رکھنے والی نگیٹیوز (NEGATIVES) کی جانچ کرلی ہے بے شک جودی پہاڑ پر ایک جہاز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ یہاں کیسے آیا؟ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہاں ایک کشتی ہے۔ کوئی دوسرا ہی اس بات کا پتہ لگا سکے گا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی!۔

آرمی جیوڈیٹک تجربہ گاہ کے ماہرین

انقرہ کی آرمی جیوڈیٹک تجربہ گاہ (ARMY GEODETIE LABORATORY) کے اسی دار عہدیداروں میں سے ایک اعلیٰ ذمہ دار عہدیدار" جو فوٹوگرافی کا ماہر تھا، جس نے کہا ہے کہ:

ہے ۔ یہ شے لکڑی کی بنی ہوئی نظر آتی ہے، اور تمام ضروری چیزوں کی حامل ہے۔ ہمارے پلانی گراف اسٹوڈیو کے ماہرین ہی ان تمام چیزوں کا تصفیہ کر سکتے ہیں۔ اور وہی جان سکتے ہیں کہ اس وقت جو شے ہم کو بھی کشتی نظر آرہی ہے، وہ فی الحقیقت کیا شے ہے؟۔
بہر حال اس وقت ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے جو چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک کشتی کے مانند نظر آتی ہے۔ اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔"

مشرقی ترکی کا یہ علاقہ نہایت پرخطر ہے۔ خطرناک درندے اور بھیڑیے غول در غول پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ انکی خون خشک کر دینے والی مہیب آوازیں پہاڑی میں چاروں طرف گونجا کرتی ہیں۔

کشتیٔ نوح موجود ہے — مگر کہاں؟

قدیم اور جدید تحقیقات سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کشتیٔ نوح موجود ہے لیکن ابھی قطعی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا کہ کشتیٔ نوح کوہِ ارارات پر ہے یا کوہِ جودی پر!

نوگزی قبر کے پچھم جانب جس تنانی مسجد کا ذکر مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے کیا ہے وہ منہدم ہو چکی ہے البتہ اسکے آثار و باقیات ابتک موجود ہیں اس مسجد کی قدامت کا اندازہ لوگ آٹھ نو سو سال کرتے ہیں جو مبالغہ آمیز ہے اسکی قدامت زیادہ سے زیادہ تین چار سو سال کے درمیان ہونا چاہیئے

نوگزی قبر کے ارد گرد آج سے تقریباً ستر اسی برس پہلے کیوڑے کا بہت گھنا جنگل تھا اب آبادی ہو جانے کی وجہ سے کیوڑے کا باغ ختم ہو چکا ہے۔ بنی نوح کا قبرستان اب محلہ نوگزی قبر کہلاتا ہے اس محلہ کے اندر جگہ جگہ پرانے آموں اور کٹہل وغیرہ کے پرانے درخت ابتک موجود ہیں۔

کیوڑا مسجد

اب نوگزی قبر کے پاس سے بھرائی راستے پر آجایئے جدھر سے آپ نوگزی قبر کے پاس والے میدان میں داخل ہوئے تھے یعنی پچھم جانب والے میدان میں آکر عام راستہ سے پورب کی طرف چلیے تقریباً پچیس تیس میٹر آگے (پورب کی طرف) اسی راستے پر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر بلندی پر ایک مسجد ہے جسے لوگ کیوڑا والی مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کی حالت دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو سو سال پر زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ یہ مسجد ابھی نہایت اچھی حالت میں ہے خستگی کے آثار کہیں سے بھی نظر نہیں آتے البتہ نمازی نہ ہونے کی وجہ سے مسجد میں جگہ جگہ درختوں کی پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس مسجد میں پنج وقتہ نماز با جماعت کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔

محمد ہاشم انصاری نے مؤلف کو بتلایا کہ ادھر گذشتہ چند سالوں سے انھوں نے کوشش کر کے اسمیں نماز جمعہ کا بندوبست کیا ہے۔ نزدیک و دور کے پندرہ بیس نمازی آجاتے ہیں۔ اور نماز جمعہ ہو جاتی ہے۔

شروع شروع میں جب نماز جمعہ کا اہتمام ہوا تھا اس وقت محمد ہاشم انصاری ہی اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن جب برابر

نماز جمعہ ہونے لگی تو امامت کی ذمہ داریاں دوسرے لوگوں کے سپرد کر دیا۔
آجکل منشی احمد علی صاحب نماز جمعہ کی امامت کرتے ہیں۔

کیوڑا مسجد کے نام کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے اس مسجد
میں کیوڑا کے درختوں کا باغ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے لوگ اس مسجد کو کیوڑا
والی مسجد کہنے لگے تھے۔ بعد کو لوگ کیوڑا والی مسجد کے بجائے صرف کیوڑا مسجد
کہنے لگے۔ جو ابتک چلا آرہا ہے اب اس مسجد میں کیوڑا کا کوئی درخت نہیں ہے۔

۱۹۵۰ء سے پہلے تک اس مسجد میں عید بقر عید کی باقاعدہ نماز ہوتی تھی
لیکن بعد کے سالوں میں نہ جانے کن حالات و وجوہات نے اس مسجد کو
ویران کر دیا؟ اب اسے دوبارہ آباد کرنے کی کوشش و جد و جہد کی
جارہی ہے۔

مزار مولانا تقی الدین اودھی

کیوڑا مسجد کی پشت سے ایک راستہ اتر سے پورب کو جاتا ہے
جس پر اینٹوں کا فرش لگا ہوا ہے اس راستہ پر اتر کی جانب تھوڑی دور چلنے
کے بعد آپ سڑک پر آجائیں گے دجورام داس براس مرچنٹ کی دکان سے
شروع ہو کر چھوٹی ڈکیٹا مندر کے سامنے سے ہوتی ہوئی ادم پرکاش پانڈے
کے مکان تک چلی گئی ہے ا بیس بائیس میٹر داہنے ہاتھ یعنی پورب جانب چلنے
کے بعد پھر موین چھوٹی ڈکیٹا نامی مندر ملے گا یہ مندر ایک ایک بڑے اور
بلند پھاٹک کے اندر ہے پھاٹک کے سامنے ہی ایک بہت بڑا میدان ہے

ں اکثر جگہ آم کے پرانے درخت ابتک موجود ہیں

اس مندر کے پھاٹک کے اندر جانے کے بعد ہی جس جگہ سے میدان
روع ہوتا ہے ٹھیک اسی جگہ داہنے ہاتھ پر تقریبًا ایک یا سوا بالشت اونچے
ترہ پر حضرت مولینا تقی الدین اودھی کا مزار ملے گا۔* جو کافی بوسیدہ
لت میں ہے قبر پر چونا کی سفیدی کی ہوئی ہے اور مزار کے آس پاس صفائی
ہے ان دونوں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر میں رہنے والے بیراگی اس مزار کا کچھ
احترام کرتے ہیں جسکی وجہ سے قبر کی سفیدی اور قبر کے آس پاس صفائی ہے۔

محمد ہاشم انصاری اور بہت سے ہندو و مسلمانوں نے مؤلف کو بتلایا
۱۱-۱۹۱۰ء تک اس جگہ بیشمار پختہ و خام قبریں تھیں جن میں بہت سی قبریں
احب کمال اور صاحب تصرفات بزرگوں کی تھیں جن پر لوگ اکثر فاتحہ
نی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لئے آیا کرتے تھے لیکن جب سے یہ
ستان مذکورہ مندر کی حدود میں آگیا لوگوں کا آنا تقریبًا بند ہوگیا ہے
در کے بیراگیوں نے تمام قبروں کو نیست و نابود کر کے اب اس جگہ آموں کا باغ
دیا ہے۔

مولینا تقی الدین اودھی حضرت مولانا محمد داؤد صاحب کے برادر زادہ
ھے آپ صاحب کرامت و صاحب تصرف بزرگ ہیں یہ آپکی روحانی طاقت
ثر ہے۔ کہ بیراگیوں نے ابتک آپکا مزار باقی رکھا ہے بلکہ مزار کی دیکھ بھال بھی

---

* حضرت مولینا تقی الدین اودھی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ مؤلف

بیراگی ہی کرتے ہیں۔ مندر ہی کے رہنے والے لوگوں نے مؤلف کو بتلایا کہ جب
بھی کسی نے اس مزار (مولینا تقی الدین اودھی) کی بیحرمتی کرنے کا ارادہ کیا فوراً
اسکو کوئی سزا ملی۔

اس مندر کے بیراگی انجان زائر کو خود ہی مزار تک پہنچا دیتے ہیں آپکے فیوض
و برکات سے یہ جگہ زمانۂ ماضی میں درگاہ علم بخش کے نام سے مشہور تھی۔ اب سے
تیس بتیس سال پہلے تک ہر پنجشنبہ کو طالب علم آپ کے مزار پر انوار پر ترقی
علم و ذہن کے لیے خصوصیت کے ساتھ حاضری دیا کرتے تھے لیکن اب مندر
کے احاطہ کے اندر ہو جانے کی وجہ سے طالبعلموں اور دوسرے لوگوں کی آمدورفت
برائے نام رہ گئی ہے۔

مولینا تقی الدین اودھیؒ کے فیوض و برکات کے بارے میں اکثر کتابوں میں
لکھا ہے کہ آپ ظاہری و باطنی کمالات میں بےمثل تھے۔[۱۲۵]
لطائف اشرفی میں بھی آپکے مزار کا ذکر موجود ہے جسطرح آپ اپنے زمانۂ حیات میں
خلق اللہ کو فیض پہنچاتے رہے اسی طرح بعد رحلت بھی لوگ آپکے فیوض و برکات سے
مستفیض ہوتے ہیں۔

مزار خواجہ کرٹے شاہ

دسی پرمود بن چھوٹی کٹیا مندر کے باہر داہنے ہاتھ پر (یعنی اتر جانب) مندر

۱۲۰۔ مولینا محمد داؤد کا مزار ردوضہ گاؤں میں ہے جو فیض آباد سے ۲۴ کلو میٹر پچھم جانب ہے
اور شمالی ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ مؤلف ۱۲۵۔ یک تن از رجال الغیب فوت شد و
برائے زمیں حضرت جناب مرشد شاں قدس سرہٗ آں عبدہ کہ رجال الغیب تجویز فرمودند (اخبار الاخ

مذکورہ بالا کے احاطہ کی چہار دیواری کی سایہ میں پورب جانب ایک پختہ قبر ہے جسے لوگ خواجہ کرڑے شاہ نامی کسی بزرگ کی قبر بتاتے ہیں جو صاحب تصرفات ہیں۔

اس جگہ کے لوگوں کا بیان ہے کہ آج بھی جب کوئی بیراگی کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو آپکے مزار پر عطر کا پھاہا رکھ اور اگربتیاں وغیرہ جلا کر اپنی صحت کے لئے درخواست کرتا ہے اور آپکی توجہ و برکات سے اللہ تعالیٰ مریض کو شفائے کلی عطا فرماتا ہے لیکن مؤلف کو لوگوں کے اس بیان سے مبالغہ آرائی کا شک ہوتا ہے۔ کیونکہ جس مزار کو خواجہ کرڑے شاہ کی مزار بتلایا گیا ہے اگر واقعی اس مزار کا بیراگی ادب و احترام کرتے ہیں تو گوبر اور کوڑا کرکٹ کے انبار جو قبر کے پاس ڈھیر سے لگے ہوئے ہیں کے کیا معنیٰ؟ اسے ادب و احترام کی نشانی نہیں کہا جاسکتا!

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مزار جس مقام پر واقع ہے صاحب مزار کی کسی کرامت ہی کی وجہ سے ابتک باقی رہ گیا ہے ورنہ دیگر مزارات کی طرح جو اس قبر کے ارد گرد تھے کھود کر پھینک دیا جاتا اور اس قبر کا نام و نشان بھی باقی نہ رہجاتا۔

خواجہ کرڑے شاہ کا ذکر مؤلف کو کسی کتاب میں نہیں ملا ممکن ہے کسی دوسرے نام سے کہیں کوئی ذکر ہو لیکن عرف عام میں اس وقت خواجہ کرڑے شاہ کے نام سے مشہور ہیں اسی لئے اسی نام کو کتابوں میں تلاش کیا۔ آپ کے حالات و زمانہ سے متعلق بھی کوئی معلومات نہ ہوسکی اور سلسلہ ہی معلوم ہوسکا۔

مزار قاضی طیب صاحب

اسی پرمود بن کٹیا مندر کے پاس ایک مکان کے اندر قاضی ط
نام کے ایک صاحب کرامت بزرگ کا مزار بتایا جاتا ہے۔ جنکی بہت
سی کرامات اور واقعات اب بھی لوگ سناتے ہیں چونکہ آپکا مزار نجی
مکان کے اندرونی حصہ میں ہو گیا ہے۔ اس لیے مؤلف اسے دیکھ نہ س
اب اس کی موجودہ حیثیت کیا ہے؟ واقعی ابتک مزار موجود بھی ہے
قاضی طیب صاحب کون تھے؟ کس زمانہ میں تھے؟ اس
متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں قاضی طیب صاحب کے
کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے ــــ اس وقت قناتی مسجد
صحن میں مزار شریف موجود ہے۔ لیکن شکستہ حالت میں ہے[۱۴۰] اس
بہتر سال کی طویل مدت میں اگر مزار عوام کی بے توجہی کا شکار رہا ہوگا تو یقیناً
وجود مٹ چکا ہوگا

خورد ملکہ کا قبرستان

خورد موجودہ پرمود بن کٹیا مندر کی بھ
سے نکل کر بائیں ہاتھ کیطرف لی
جانب تیس چالیس میٹر سڑک پر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ یعنی پورب جا

۱۴۰۔ گم گشتہ حالاتِ اجودھیا۔

سڑک کو پار کرنے کے بعد گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ملے گا جس میں بیشمار خودرو جنگلی پودے اگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ قبرستان ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا۔ کیونکہ قدیم ترین چہار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ باغ کا یہ احاطہ جس کے اندر خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں خورد مکہ کہلاتا چلا آرہا ہے۔

یہ باغ زمانۂ ماضی سے زمانۂ حال تک کہلاتا چلا آرہا ہے۔

انیسویں صدی کے آخری سالوں تک خورد مکہ کا یہ قبرستان پختہ چہار دیواری کے اندر تھا۔ جس میں ہزاروں پختہ اور خام قبریں موجود تھیں جس زمانہ میں راجہ کشن سنگھ نے نالہ کھدوایا بہت سی قبریں اس نالہ میں آکر تلف ہوگئیں[۱]

مزار علاء الدین خراسانی

اسی خورد مکہ قبرستان میں حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلیفہ اور ترجیع ہند ما مقیماں کے مصنف حضرت علاء الدین خراسانی کے مزار کے علاوہ انکے اجداد اور دیگر افراد اور دیگر متعلقین کے مزارات بھی ہیں۔ خورد مکہ کے قبرستان میں آج بھی بہت سی قدیم پختہ قبریں موجود ہیں لیکن مؤلف کو باوجود تحقیق و تلاش کے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ حضرت علاء الدین خراسانی کا مزار کونسا ہے۔

۱۔ پہلے برساتی نالہ تھا اب گندے نالے کی شکل میں خورد مکہ قبرستان کے پورب جانب سے بہہ رہا ہے ۔۔۔ مؤلف

کتاب سیر الاولیاء۔ (تالیف سید محمد کرمانی، صفحہ ۲۴۵) پر آپ کے متعلق

تحریر ہے کہ :۔

"مولانا علاء الدین اودھی کہ خلیفہ سلطان المشائخ بود ......

در کشف غوامض کشاف و مفتاح مثل نہ داشت ۔۔"

آپ نے ۷۰۲ھ مطابق ۱۲۶۱ء ۱۳۰۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولوی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ حضرت علاء الدین خراسانی کے مزار کے سرہانے ایک سیاہ پتھر نصب تھا جسے ایک دن رات کے وقت چور چرا لے گئے۔ اس چوری کی پولیس کے ذریعہ تفتیش بھی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چلا کہ کون لوگ اس پتھر کو چرا لے گئے۔ اور نہ یہی معلوم ہو سکا کہ اس سیاہ پتھر کے چرانے کا مقصد کیا تھا۔ البتہ اس چوری کے بعد بہت سی پختہ قبریں کھود کر پھینک دی گئیں"[۱۴۲]۔

اجودھیا کے رہنے والے معمر لوگ بتلاتے ہیں کہ جنگی سڑک (فیض آباد گورکھپور روڈ) جس وقت بن رہی تھی خورد مکہ کے قبرستان کی بہت سی قبریں سڑک اور فٹ پاتھ میں آ کر تلف ہو گئیں۔

مزار مسافر شاہ شہید

اسی خورد مکہ قبرستان کے احاطہ کے دکھن اور پورب کے کونے پر لب سڑک مسافر شاہ کی قبر ہے۔ مسافر شاہ شہید کا اصل نام کیا تھا اس کے متعلق نہ

۱۴۲۔ صفحہ ۱۹

تو کسی شخص سے کچھ معلوم ہو سکا اور نہ کسی کتاب میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ روایتاً بھی کوئی کچھ بتانے والا نہیں ملا البتہ آپکے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بہت بڑے کرامت بزرگ تھے۔ اور غالباً عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے پنجاب ریانی پت وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے ماہ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق ماہ صفر ۱۲۹۲ھ ں شہر اجودھیا تشریف لائے تھے۔ اجودھیا کی سیاحت اور یہاں کے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کرنے کے بعد دریائے گھاگھرا کو پار کر کے گونڈہ کی رف جانیکا ارادہ تھا۔

دریائے گھاگھرا کے کنارے بابا رگھوناتھ داس بیراگی کی چھاونی تھی جسمیں اسکے سیکڑوں بیراگی چیلے رہتے تھے ایک دن آپ بھی تفریحاً بابا گھوناتھ داس بیراگی کے یہاں چلے گئے تھوڑی دیر بابا رگھوناتھ داس راگی کے پاس بیٹھنے کے بعد واپس آنے لگے تو باباجی نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ آپکو (مسافر شاہ کو) جنس (راشن) دیدو (جیسا کہ اس کے یہاں کا دستور تھا ہر سادھو فقیر اور درویش وغیرہ کو جو اسکے پاس آتے وہ ان سب کو ایک خوراک یتا تھا۔ مسافر شاہ نے فرمایا کہ میں آپکے پاس راشن لینے نہیں آیا تھا بلکہ آپ کی ری دیکھنے آیا تھا۔ بابا رگھوناتھ داس بیراگی نے آپکا یہ جواب سن کر بدزبانی کی ات زبان سے نکالے جس سے آپکو رنج ہوا جو جنس شاہ صاحب کو بابا رگھوناتھ اس بیراگی کے آدمیوں نے لاکر دیا تھا۔ اسے آپنے اسی جگہ موجود ضرورتمندوں تقسیم کر دیا۔[۱۴۳]

۱۴۳۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۱۸

بابا رگھوناتھ داس بیراگی کی چھاونی سے واپس آکر دریا کے کنارے ہی ایک آم کے درخت کے نیچے کچھ دنوں کیلئے مقیم ہو گئے اور بابا رگھوناتھ داس بیراگی کی طرح روزانہ غریبوں اور محتاجوں کو جنس تقسیم کرنے لگے اس طرح لوگ روز بروز آپکی طرف رجوع ہونے لگے۔

مولوی عبد الکریم انصاری مرحوم نے آپکے حالات میں تحریر فرمایا ہے کہ آپکے مختصر قیام کے زمانہ میں اتفاقاً اجودھیا میں وبائی بیماری پھوٹ پڑی تھی اور لوگ بڑی تعداد میں مرنے لگے تھے۔ اس موقع پر بہت سے لوگ آپکی دعاؤں سے صحتیاب ہوئے جسکی وجہ سے بڑے بڑے لوگ معتقد ہو گئے تھے۔

شاہ مسافر کے حالات میں آپکی اس کرامت کا واقعہ بھی لکھا ہے کہ اس وبائی بیماری میں ایک جوان لڑکا مر گیا لوگ اس لڑکے کو لیکر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے لڑکے کو دیکھتے ہی شاہ صاحب کے منھ سے نکل گیا کہ یہ تو زندہ ہے۔ پھر آپنے دو کنکریاں لیکر اس مردہ کے کان (لو) کے نیچے اوپر رکھکر دبا دیا۔ لڑکا آپکے حکم سے اِلاّ اللہ کا لفظ کہہ کر اٹھ بیٹھا۔ آپکی اس کرامت سے خلق خدا لوٹ پڑی۔ بابا رگھوناتھ داس بیراگی جو درویش کامل ہونے کا دعوی کرتا تھا آپ سے حسد کرنے لگا۔ آخرکار ۹ مئی ۱۸۷۵ء مطابق ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۲ ہجری بروز اتوار رات کے وقت لاٹھیوں سے مار کر آپ کو شہید کر دیا۔ اجودھیا شہر کے مسلمانوں نے آپکو اس خورد مکہ کے قبرستان میں دفن کیا۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ شہادت کے وقت سے لیکر دفن کرنیکے وقت تک آپکے جسم سے برابر تازہ خون نکلنا جاری رہا فی الوقت آپ کے مزار کے پائینتی گوبر اور کوڑے کا انبار ہے اور مزار کے

ار د گرد کافی گندگی ہے مؤلف کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اب لوگ مسافر شاہ شہید کو بھول چکے ہیں۔ اور ان سے متعلق بے سرو پا کرامات ہی انکی یادوں کا سرمایہ رہ گئی ہیں۔

مسافر شاہ کا مزار اب اس قدر گمنامی کی حالت میں ہے کہ شاید ہی کبھی کوئی زائر آتا ہو۔ مسافر شاہ کا اصل نام کیا تھا۔ اس کے متعلق کسی ذریعہ سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ قیاس ہے کہ آپکی شہادت چونکہ مسافرت کے عالم میں ہوئی تھی۔ اور کوئی شخص آپکے نام اور دیگر تفصیلات سے واقف نہ تھا اس لئے آپ مسافر شاہ کے نام سے مشہور ہو گئے

مزار شمس الدین فریاد رس

اب خورد مکہ کے قبرستان سے محلہ چھوٹی دیو کالی سے پچھم جانب والی سڑک سے ہوتے ہوئے بجریا ٹولہ نامی محلہ میں آئیے اور ستیہ ساگر (सत्य सागर) جسے الٹا تالاب بھی کہتے ہیں اس تالاب کی طرف نظر کیجیئے تو توشبراتی صاحب (دلد   ) کے مکان کے پاس ایک بلند قطعہ آراضی پر پورب جانب ایک نہایت شکستہ و خستہ حال چہار دیواری نظر آئیگی۔

اب سے تقریباً اسی پچاسی سال قبل یہ ایک پختہ احاطہ تھا اب اس احاطہ کی پچھم طرف کی دیوار منہدم ہو چکی ہے۔ اتر پورب اور دکھن کی دیواریں بھی باقی رہ گئی ہیں۔ جو نہایت خستہ حالت میں ہیں اور امید ہے کہ آئندہ دو تین سالوں کی برسات میں یہ دیواریں بھی زمین بوس ہو جائیں گی۔

یہ وہ احاطہ ہے کہ جس کے اندر حضرت مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (رحمتہ اللہ علیہ) کے خلیفہ اعظم حضرت شاہ شمس الدین فریاد رس محو خواب

ہیں بالمیں احاطہ کو دیکھنے کے بعد ایسا احساس ہوتا ہے کہ زمانۂ دراز سے یہ جگہ مسلمانوں کی عدم توجہی کا شکار رہی ہے فی الوقت احاطۂ مذکور کے اندر خود رو جھاڑ کے پودوں کا جنگل ہے مزار پر ایک قدیم پاکر کا درخت سایہ کئے ہوئے ہے۔

نظام یمنی مؤلف لطائف اشرفی نے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی جب پہلی مرتبہ کچھوچھہ تشریف لائے وہ اسی وقت سے اپنے اکثر احباب سے کہا کرتے تھے کہ اودھ (اجودھیا) سے ایک دوست کی خوشبو آرہی ہے۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد آپ اجودھیا تشریف لائے اور ایک مسجد میں قیام فرمایا تو اکابر شہر ملاقات کے لئے آئے ان ملاقاتیوں میں ایک نوجوان شمس الدین نامی بھی تھے۔ جو علوم ظاہری کی تکمیل کر چکے تھے۔ اور فضائل صوفیہ کی تلاش میں تھے حضرت مخدوم نے فرمایا کہ شمس الدین! میں تیرے ہی لئے یہاں آیا ہوں۔[۱۴۲]

سیرۃ الاشرف میں مرقوم ہے کہ چند دنوں کے بعد حضرت مخدوم سمنانیؒ نے شمس الدین کو خلوت میں بٹھایا دس دن میں شمس الدین واردات کا نزول ہونے لگا۔ اضطرار ایسا بڑھا کہ ضبط نہ کر سکے اور خلوت سے باہر نکل پڑے خادم انکو کھینچ کر خلوت میں لے گیا۔ اور دروازہ مضبوط بند کر دیا جب خلوت تمام ہوئی خرقہ عطا ہوا۔

لطائف اشرفی کے بموجب حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ فرماتے تھے کہ "اشرف شمس شمس اشرف" یعنی ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

کچھ دنوں بعد اجودھیا میں قیام کے بعد حضرت مخدوم اشرف سمنانی صاحب

۱۴۲۔ سیرۃ الاشرف صفحہ ۳۰

سدھور، لکھنؤ، جائس ہوتے ہوئے کچھوچھ واپس تشریف لے گئے۔ انھیں دنوں اجودھیا کے ایک منصب دار رئیس سیف خاں اپنے ندیموں کیساتھ قدمبوسی کیلئے حاضر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد سیف خاں کو حضرت مخدوم اشرف سمنانی نے مرید کیا انھیں سیف خاں کے اصرار سے حضرت موصوف نے اودھ (اجودھیا) میں اپنے لئے ایک خانقاہ بنوائی جسمیں شیخ شمس الدین رہتے تھے۔[۴۵]

بحر ذخار میں لکھا ہے کہ حضرت شمس الدین "فریادرس" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ انکا مزار اودھ میں حاجت روائے خلق ہے جس شخص کو کوئی مہم پیش آئے وہ شیخ فریادرس کے مزار کیطرف رخ کر کے فاتحہ پڑھے تو اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ سیرۃ الاشرف میں فاتحہ پڑھنے کی ترکیب اسطرح لکھی ہے کہ ایکبار سورۂ فاتحہ تین بار سورۂ اخلاص ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور ایکبار درود پڑھے۔[۴۶]

اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص آدھی رات کے وقت آپکے مزار پر حاضر ہو کر اپنی حاجت بیان کرے تو اللہ تعالیٰ آپکی دعاؤں اور توجہ کی برکت سے حاجتمند کی حاجت کو پوری کر دیتا ہے

سلاطین دہلی نے حضرت شمس الدین فریادرس کی مزار و درگاہ کی مرمت اور اخراجات عرس وغیرہ کے لئے درگاہ کے قریب ہی ستر بیگہ پختہ کی آراضی عطا فرمایا تھا۔[۴۷]

درگاہ مذکور کی ویرانی کے اسباب و وجوہات معلوم کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جس شخص کے نام سند معافی عطا ہوئی تھی اسکی ناخلف

---

(۴۵) سیرۃ الاشرف صفحہ ۳۴ - (۴۶) ایضاً صفحہ ۳۹ (۴۷) تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا صفحہ ۱۹

اولادوں نے نہ صرف درگاہ شریف ہی کو ویران کر ڈالا بلکہ درگاہ کے احاطہ کے اندر واقع درختوں کو بھی بیراگیوں کے ہاتھ بیچ کر کھا گئے آج اس درگاہ کا چپہ چپہ اپنے مسلمان کہلانے والے سپوتوں کے کارناموں پر نوحہ خواں ہے۔

حضرت شاہ شمس الدین فریاد رس نے ۷ محرم الحرام ۷۰۰ھ ہجری قدسی بروز جمعہ مطابق ۲۲ ستمبر ۱۳۰۰ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ مؤلف

قطعۂ تاریخ وفات یہ ہے۔

بہ ہفتم محرم کہ روز جمعہ — رسیدند رضواں مثالِ شمع
زہجرت بود ہفت صد سال — کہ بالک علوی شد ھم مقال

مزار سید شاہ عثمان

حضرت شیخ شمس الدین فریاد رس کی خانقاہ کے پیچھے یعنی پچھم جانب بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک ایک قدیم مسجد اور خانقاہ کے باقیات موجود تھے معتبر وضعیف العمر لوگ آج بھی تبلاتے ہیں کہ اس جگہ پر سید شاہ عثمان اور سید ارتضیٰ اور سید مرتضیٰ وغیرہ نامی بزرگوں کی قبریں تھیں اور لوگ اکثر ان مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ آج اس جگہ پر نہ کسی مسجد و خانقاہ کے باقیات کے آثار موجود ہیں اور نہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں پر کبھی کوئی مسجد و خانقاہ رہی ہوگی۔ ان بزرگوں کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں۔

لوگ اس وقت جس جگہ پر سید شاہ عثمان اور سید ارتضیٰ و سید مرتضیٰ

وغیرہ بزرگوں کی قبروں کی نشاندہی کرتے ہیں وہ سرسبز کھیت کا درمیانی
حصہ ہے۔ اس قبرستان کا تمام علاقہ اب زراعتی آراضی میں تبدیل ہو کر کھیت بن
چکا ہے۔

ان تینوں بزرگوں کے متعلق بھی کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکی کہ یہ کون لوگ
تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کس کے عہد حکومت میں آئے اور انکا سلسلہ
کیا تھا اور کب انتقال کیا؟

مزار جمال اولیاء

اسی بجسریا ٹولہ محلّہ کے پچھم جانب محلہ سیّد واڑہ ہے۔ اس محلہ میں صمد اللہ
صاحب کے مکان کے پچھم جانب اب سے تقریباً پچھتر برس قبل ایک شکستہ
احاطہ موجود تھا۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے
اس احاطہ میں جمال الدین اولیاء نامی ایک بزرگ کا مزار تھا لیکن اب اس
نہ کوئی احاطہ موجود ہے اور نہ اسکے باقیات و آثار باقی ہیں البتہ کچھ شکستہ
مزارات اس جگہ ضرور ہیں جسمیں ایک شکستہ مزار کے بارے میں اکثر لوگوں نے
بتایا کہ یہی حضرت جمال الدین اولیاء کا مزار ہے۔

مزار کی حالت اور اس کے آس پاس کی افتادہ زمین کو بغور دیکھنے
کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اب شاید ہی کبھی کوئی شخص اس جگہ فاتحہ خوانی کیلئے
آتا ہوگا۔

مزار حضرت کمال الدین

آپ کے بارے میں کوئی تفصیلی معلومات نہ حاصل ہو سکی۔

جس زمانہ میں حضرت جمال الدین اولیا کا احاطہ موجود تھا اس وقت اس اح
کے اندر ہی پوربی گوشہ میں حضرت کمال الدین صاحب کا مزار تھا جو آپکے برادر
حقیقی تھے۔

صمد اللہ صاحب کے مکان کے پاس پچھم جانب جو چند شکستہ قبریں ہیں
ممکن ہے کہ انھیں میں کوئی قبر حضرت کمال الدین صاحب کی بھی ہو لیکن مؤلف کو
نشاندہی نہ کرائی جا سکی۔

مسجد فریدی

حضرت شاہ شمس الدین فریاد رس (رحمتہ اللہ علیہ) کی درگاہ سے پچھم جانب
محلہ بیگم پورہ ہے۔ اس محلہ میں لب سڑک ایک بہت پرانی قنائی مسجد تھی جسے
لوگ فریدی مسجد کہتے تھے۔ مولوی عبدالغفار کے بموجب ۱۹۲۰ء میں کے
دربان مرزا احسن علی کے لڑکے احمد مرزا نے سفالہ پوش کرا دیا تھا۔

مسجد مذکورہ کا ذکر جس انداز میں مولوی غفار صاحب نے کیا ہے
ضروری تھا کہ اس مسجد کا اگر کوئی تاریخی پس منظر ہوتا تو اسے ضرور بیان کرنا چا
تھا۔ ورنہ اس کا ذکر کیا ضروری تھا؟ اجودھیا میں بیشمار مساجد ہیں۔ ان میں
ہر ایک مسجد کا کوئی نہ کوئی نام لیکر تاریخی معلومات کا رعب تو ڈالا ہی جا سکتا

ہے۔

مزار فرید الدین قتّال

لوگ بتلاتے ہیں کہ فریدی مسجد کے صحن میں حضرت عبدالرزاق نورالعین کچھوچھوی کے ہمشیر زادہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر صمنانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے پانچ صاحبزادوں میں سے ایک صاحبزادہ حضرت فریدالدین قتال کا مزار ہے[۱۴۸]

کالے پہلوان کا مزار

حضرت شیخ شمس الدین فریاد رس رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے دکھن جانب ٹیلہ پر جہاں فی الوقت ہر یجنوں (چماروں) کی بستی ہے اس بستی میں ایک شکستہ قناتی مسجد ہے جس کے صحن میں دو پختہ قبریں ہیں جو ابتک اچھی حالت میں ہیں۔ ان دو قبروں میں جو قبر پچھم جانب ہے اس کے متعلق لوگ بتلاتے ہیں کہ یہ کالے پہلوان کی قبر ہے۔

مولوی سید عبدالغفار نے لکھا ہے کہ کالے پہلوان کے مزار کے احاطہ میں زمانۂ ماضی میں شاہی کچہری تھی اور اس وقت عدالت شاہی سے کچھ سکہ رائج الوقت ہر جمعرات کے دن برائے فاتحہ و روشنی مزار کے لئے مقرر تھا کچہری کا مکان ایک زمانہ ہوا نیست و نابود ہو چکا ہے اب اس کے آثار بھی نہیں معلوم کئے جا سکتے۔

مؤلف گم گشتہ حالات اجودھیا نے کالے پہلوان کا ذکر اس انداز میں

---

۱۴۸ دیکھئے سیرۃ الاشرف —— مؤلف

کیا ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑے بزرگ یا اولیاء اللہ تھے حالانکہ حقیقت
برعکس ہے۔ کالے پہلوان کے ساتھ عوام کی عقیدت انکے پہلوان کے فن
کیوجہ سے تھی نہ کہ کوئی روحانی عظمت و بزرگی کے سبب

بعض کتابوں میں کالے پہلوان شہید نام کے کسی شہید کا نام مؤلف
کی نگاہ سے گذرا ہے اگر یہ مزار کالے پہلوان شہید کا ہے تو مؤلف گم گشتہ حالات
اجودھیا کو بالتصریح لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن کالے پہلوان شہید کے مزار "د
بیرون حدود شہر اودھ،، کو "اندرون شہر اودھ،، کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے

بند گنبد یا بند مقبرہ

کالے پہلوان یا کالے پہلوان شہید کے مزار
سے چند میٹر دکھن جانب چلنے کے بعد ایک
"تراہا،، ملتا ہے تراہے سے پورب جانب جو پختہ سڑک کو جاتی
ہے اس پر چند میٹر پورب جانب چلنے کے بعد سڑک کے اتر جانب یعنی
بائیں ہاتھ پر مسطح زمین پر بنا ہوا ایک مقبرہ نظر آئیگا جواب سے تقریباً پچاس
ساٹھ سال پہلے ہر چہار جانب سے بند تھا۔ یعنی مقبرے کے اندر قبر تک جانے
کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے لوگ اس مقبرہ کو بند مقبرہ
یا بند گنبد کے نام سے پکارنے لگے۔

چونکہ ایک زمانہ سے عوام و خواص اس گنبد کو اسی طرح ہر چہار
جانب سے بند دیکھتے چلے آرہے تھے اس لئے ہر زمانے میں لوگ اس
کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے۔ زمانہ ماضی میں
یہاں کے عوام میں مشہور تھا کہ یہ کسی بہت بڑے بزرگ دین یا اولیاء

ر کا مقبرہ ہے جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں اس مقبرہ کے اندر بیٹھ کر
ں کو ہر چہار جانب سے بند کروالیا تھا۔ بعد کو انکے معتقدین نے انکی
یت کے مطابق اس پر ہر چہار جانب چونے کا مضبوط پلاسٹر کروا
تھا۔

کچھ لوگ بیان کرتے تھے کہ اس مقبرہ کے اندر ایک باکمال بزرگ
س دم،، کئے ہوئے ہیں۔ اگر مقبرہ کھول دیا جائے تو وہ بزرگ ،،
س دم،، کی ہوئی حالت میں ملیں گے۔

الغرض اسی قسم کی نہ جانے کتنی بے سروپا روایات عوام میں
ہور تھیں لوگ ان بیشمار روایات کی بھول بھلیوں میں گم ہوکر حقائق
اس قدر دور ہو گئے تھے کہ اب صداقت کی تلاش و جستجو کا تصور بھی
ں پر بار ہوتا تھا ـــــ اور کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ کسی مدفون صداقت
موشی کے عمیق غار سے باہر نکالنے کی جد وجہد میں اپنے مصروف
ات کو ضائع کرتا: جنھیں اس بند گنبد یا بند مقبرہ کا راز کا علم تھا کہ یہ
امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے بڑے بھائی نور بیگ خاں بہادر
ی آرام گاہ ہے وہ مصلحتاً خاموش تماشائی تھے۔ انکا خیال تھا
نائے راز سے وقت کے ساتھ ساتھ مندمل ہونے والے زخم
رے ہو جائیں گے اور نور بیگ خاں کے مظالم اور شقاوت کی
ہوئی اور سچی داستانیں جو اس وقت لوگوں میں چنگیز خاں اور ہلاکو
کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے قصوں اور کہانیوں کیطرح بیان

یکجا تی تھیں انتقامی جذبہ کے تحت شورش و فساد کا سبب بنجائیں گ

بعض معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے اپنے

بھائی نور بیگ خاں بہادر کو درپیش سیاسی حالات کے پیش نظر عام قبر

میں ایک گمنام جگہ پر دفن کرایا تھا۔ تجہیز و تکفین عام لوگوں کی طرح ہوئی

جنازہ کے ساتھ اس کے چند اعزاء اور رفقاء کے علاوہ اور دوسرے

لوگ نہ تھے ——— چند سالوں بعد جب جنازہ میں شریک رہنے

والے چند لوگوں کی اکثریت نور بیگ خاں بہادر کی قبر کا جائے وقوع

بھول چکی تو حیدر بیگ خاں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اصل خام

کو، چھپا کر اس سے متصل ہی پورب جانب ایک مصنوعی پختہ قبر بنوا کر ایک مقبرہ تعمیر کر

اسکے راز داں رفقاء اور ہمدردوں نے مختلف بے سروپا روایات

کر لوگوں میں مشہور کر دیا۔ جو ایک زمانہ تک لوگوں میں مشہور رہیں اور

لوگ ان روایات کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے لیکن ستمبر ۱۹۷۲ سنہ

طوفانی بارش میں اس مقبرہ کا دکھنی حصہ دیوار کے اوپر سے گر گیا

اس کے اندر بنی ہوئی، ایک پختہ قبر نظر آنے لگی جو صرف ایک نشان

کی شکل میں باقی ہے۔

اس مقبرہ کے اندر غور سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہو

ہے کہ پختہ قبر مصنوعی یا فرضی ہے کیونکہ موجودہ نشان قبر کے پچھم جانب

مقبرہ کے اندر بارش کا پانی جذب ہوتے رہنے کی وجہ سے قبر کی لمبائی

یا چوڑائی میں تقریباً ایک یا سوا بالشت فرش زمین کے اندر دھنس

ے فرش کا دھنسا ہوا حصہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہی نور
ف خاں بہادر کی اصل قبر ہے جو سیاسی مصالح کی بنا پر فرش زمین کی
رہی بنا دی گئی تھی۔ اور ایک پختہ مصنوعی قبر بنا کر، الور بیگ کی قبر کی
فی کے امکانی خطرات کا دفیہ کر دیا گیا تھا۔

مولوی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ اس جگہ کے قبرستان کی تمام قبریں
ید احمد، بائیسی کے خاندان والوں کی ہیں جو نواب شجاع الدولہ بہادر
ے عہد میں الیسی پلٹن کے افسر تھے۔ جسمیں بائیس سو (دو ہزار دو سو) مولف
اہی تھے۔[۱۴۵] مولوی صاحب کی تاریخ دانی پر سر دھنئے۔ اور گھر کی بات
ے اتنی بیخبری پر آنسو بہائیے ان بیچارے کو کل کی یہ بات بھی معلوم نہیں کہ نواب
جاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار (بائیس سو نہیں ــ مولف) بندوقچیوں
یک پلٹن تھی جس کا ہر سپاہی بائیسی کہلاتا ہے اس پلٹن کے سپہ سالار اعظم
ید احمد بالسنی والا تھے[۱۴۶]۔ نواب مرتضیٰ خاں بریچ، سید احمد بالسنی والا،
بو البرکات (جو کاکوری کے شیخ زادوں میں سے تھے اور بہت تجربہ کار تھے
ریخ آصفی صفحہ ۲۸) شیخ احسان وغیرہ جو نواب شجاع الدولہ مرحوم کے

۱۴۶۔ صفحہ ۲۸

تفضیح الغافلین کے مقدمہ میں مرزا ابو طالب اصفہانی نے لکھا ہے کہ میر احمد نے شریف لوگوں
ا کر کے انھیں فتیلہ والی بندوق دیگر اصلاحات اور حرکات کے قواعد سکھائے تھے اور انگریزی
طرح اسنے بھی فوجی عہدیدار مقرر کئے تھے اس نوج کے سپاہی توپ اور بندوق بڑی
اور ہوشیاری سے چلاتے تھے ــ مؤلف[۱۵۱]۔ گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۵

معتمد فوجی افسران تھے۔ فیض آباد میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اجودھیا اور
فیض آباد کے درمیان خیموں میں رہتے تھے۔[۵۱] ان سب کے خاندان
افراد کی قبریں جنگی شہید اور بڑی بوا صاحبہ کے قبرستانوں میں تھیں۔

حیدر بیگ خاں اور نور بیگ خاں کے قرب میں ان لوگوں میں
کسی ایک شخص کے افراد خاندان کا قبرستان ہونا یوں بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ
لوگوں میں سے کسی ایک شخص کے بھی تعلقات حیدر بیگ خاں سے اچھے نہ
تھے۔

اور نہ ہی حیدر بیگ خاں ان میں سے کسی کا قرابت دار تھا دوسرے یہ کہ
بزرگ دین یا اولیا، اللہ کی قبر کو اس طرح محفوظ کرا دینا کہ لوگ اس کی
نہ کرنے پائیں بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے جسے تسلیم کرنے کے
کوئی سنجیدہ ذہن کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا بڑا بھائی نور بیگ خاں اپنی سخت
گیری خود غرضی، بے مروتی اور نفس پرستی و بد دیانتی وغیرہ میں یگانۂ روزگا
تھا۔ رعایا اسکے ظلم و جبر اور تشدد و ہلاکت خیزی سے نالاں تھی۔ ان دو
بھائیوں نے راجہ ٹیکیت بہادر کے نیابت کے زمانہ میں پرگنوں کی آمدنی میں
خیانت کر کے خوب دولت و شہرت حاصل کیا تھا۔ جب نواب شجاع الد
مرحوم کو ان دونوں بھائیوں کے "کارناموں" کی مفصل اطلاع ہوئی تو انھ
نے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے سخت تقاضا کیا لیکن جب تحصیل وصو
کرنے والا کو کچھ ملنے کی امید نظر نہ آئی تو انھوں نے دونوں بھائیوں کو دھو

میں لیجا کر لاتوں، گھونسوں، اور جوتوں سے دل کھول کر "مرمت" کرنا شروع کر دیا۔ نور بیگ خاں بہادر تو "بھرتا بنکر" وہیں کیفر کردار کو پہنچ گیا حیدر بیگ خاں بھی مرنے کے قریب تھا کہ بہادر علی خاں نے اس پر رحم کھا کر یہ "مرمت" کا حال نواب بیگم (والدۂ شجاع الدولہ) تک پہنچا دیا جب رحم کی درخواست نواب بیگم صاحبہ سے کی گئی تو ان پر رحمدلی طاری ہو گئی جو عورتوں لازمی خاصہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے نواب شجاع الدولہ کو بلا کر کہا، "اب بہت ہو چکا کیوں غریب کی جان کے لالے پڑے ہو! درگذر کر دو" یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اور اس طرح حیدر بیگ خاں اپنی ہلاکت سے بچ گیا۔[۱۵۲]

نور بیگ خاں کی شقی القلبی، ہلاکت خیزی، بے ایمانی دغابازی کی حرکات رعایا کو لوٹنے اور انکی بہو بیٹیوں کو زبردستی آلۂ کار بنانے کی بہت سی طویل لرزہ خیز داستانیں ہیں۔ رعایا میں اس کے خلاف زبردست نفرت و غصہ پایا جاتا ہے۔ انکے علاوہ عتاب الٰہی کے نزول کا بھی خوف تھا۔ اور ان تمام سیاسی اسباب کی بنا پر نور بیگ خاں بہادر کے چھوٹے بھائی امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے اپنے بڑے بھائی نور بیگ خاں بہادر کی قبر کو ایک نوعی پختہ قبر کے ساتھ مقبرہ کے اندر محفوظ کروا دیا تھا۔ اور تقریباً ڈیڑھ صدیوں تک مقبرہ بند رہنے کے بعد قدرت نے بارش کو ایک بہانہ بنا کر نور بیگ خاں کی قبر کو دیدۂ بینا کو عبرت و نصیحت کے لئے کھول دیا۔

مولوی سید عبد الغفار نے بلا علم و بغیر تحقیق دعوائے ہمہ دانی کے اظہار کی

۱۵۲۔ تفضیح الغافلین در بیان وقائع ۱۱۸۹ ہجری

لئے وہ باتیں لکھ ڈالا جو نہ لکھنے سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔
نور بیگ خاں بہادر کے مقبرہ کو کسی بزرگ یا اولیاء اللہ کا مقبرہ باور
کرانا یا خود نور بیگ خاں کی شخصیت کو صالحین کی کسی صف میں کھڑا کرنا اب
شاید مولوی صاحب کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے۔

قبر کمال الدین شہید

گم گشتہ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ محلہ سید واڑہ کے اتر جانب
لب دریا آراضی قلعہ مبارک مشہور ہے یہ قلعہ بادشاہ سکندر لودی نے تعمیر
کرایا تھا اس قلعہ کے دروازہ کے سامنے ہی کمال شہید کا مزار تھا لیکن
اب نہ سلطان سکندر لودی کا تعمیر کرایا ہوا قلعہ باقی ہے نہ قلعہ کا دروازہ اور
نہ دروازہ کے سامنے کمال شہید کا مزار۔

باطن ہر ذرہ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لب ہستی پہ آہ سرد ہے

مسجد قلعہ مبارک

کمال شہید کے مزار کے ساتھ سلطان سکندر لودی کی تعمیر کرائی ہوئی
قلعہ کی مسجد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء تک یہ مسجد شکستہ حالت میں موجود تھی
اب دریا برد ہو چکی ہے۔
لوگ بتلاتے ہیں کہ اس مسجد کے اتر جانب نمازیوں کے وضو کرنے

ے لئے دریا میں پانی تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں مولوی
الکریم انصاری مرحوم نے ان سیڑھیوں کو "رحمن گھاٹ" کے نام
ے ذکر کیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جب ہندوستان آزاد ہوا تو صوبائی
ومت نے رحمن گھاٹ کو از سر نو تعمیر کرایا اس سے متصل لچھمن گھاٹ
ہے۔

مسجد سورگ دواری

سلطان سکندر لودی کے قلعہ کی مسجد کے پورب جانب دریائے
گھرا کے کنارے محلہ سورگ دواری ہے۔ اس محلہ میں شہنشاہ شاہجہاں
وائی ہوئی ایک نہایت خوبصورت مسجد تھی جو سارے ہندوستان میں
د سورگ دواری ( ) کے نام سے مشہور تھی بیسویں
ی کی اول ربع صدی کے بعد تک اسکے دو بلند مینارہ موجود تھے ۱۹۴۸ء
ابو پریہ دت رام نے اپنی چیرمینی کے زمانہ میں سرکار کی اجازت سے اتر
ب کا مینار منہدم کرا دیا تھا کیونکہ وہ مخدوش ہو گیا تھا۔ اب صرف
ھی باقی رہ گیا ہے (جنوبی مینارہ) شہر فیض آباد اور اجودھیا میں شاہی زمانہ
مار مساجد ہیں لیکن کسی ایک بھی مسجد کا مینار اس قدر بلند ہے۔

یہ مسجد اب بھی موجود ہے لیکن انتہائی خستہ حالت میں ہے اس وقت
ب ایک جنوبی مینار اور پچھلی دیوارہ باقی رہ گئی ہے اس مسجد کے دکھن
ب مدرسہ و مکانات کے باقیات کے آثار بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں

کے بعد تک موجود تھے اب ان کے آثار ونشانات بھی مٹ چکے ہیں۔۔
مسجد سورگ دواری کو شہنشاہ شاہجہاں نے بنوایا تھا اسکی نگہدا
اور مرمت کے لیئے ایک فرمان معافی جس کی آراضی ضلع گونڈہ میں تھی ملا
تھا۔[۱۵۳]

زمانۂ ماضی میں اس مسجد کے دکھن جانب درس وتدریس کے لیئے
درسگاہیں اور اساتذہ کی رہائش کیلئے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مولوی
عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ اس درسگاہ میں حضرت ابراہیم شاہ
صاحب درس وتدریس کے علاوہ وعظ و نصیحت بھی دیا کرتے تھے۔
مؤلف گم گشتۂ حالات اجودھیا کے بموجب اس درسگاہ کے تین
کمروں میں شاہ ابراہیم صاحب کا عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں بیشمار قیمتی
اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ کچھ نوادرات اور تبرکات بھی تھے۔ یہ
عظیم الشان کتب خانہ اور نوادرات وتبرکات انکے اخلاف نے اپنی غربت
و جہالت کی بنا پر تباہ و برباد کر ڈالا۔ ساری کتابیں ردی کاغذوں کے
میں بنیوں اور کباڑیوں کے ہاتھوں بیچ دی گئیں۔[۱۵۴]
شاہ ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد انکے پوتوں اور نواسوں کی
نزار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آپکے نواسوں اور پوتوں میں اس
بے علمی تھی کہ وقت تقسیم ترکہ آبائی کتابوں کو ترازو میں تول کر بانٹا گیا۔

۱۵۳۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۲۵

ایک عالیشان مسجد کے باقیات

مسجد سورگ دواری ([illegible]) کے اتر جانب الہ جائی گھاٹ پر نوابین اودھ کی حکومت کے زمانہ میں ایک نہایت عالیشان اومضبوط مسجد تھی جو طلب دریا ایک بلند مقام پر واقع تھی صاحب تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ یہ مسجد الہ جائی گھاٹ پر لب دریا ایک بلند مقام پر واقع تھی۔ مسجد مذکور کے باقیات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد نہایت مضبوط بنی رہی ہوگی۔ اب پچھلی دیوار اور سامنے کے در کھڑے ہوئے ہیں[۱۵۵] یہاں کے معمر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مسجد مسجد سورگ دواری کے بعد کے زمانہ میں تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن کس بادشاہ کے عہد حکومت میں یہ مسجد تعمیر ہوئی؟ اور کس شخص نے بنوایا تھا؟ اس کے بارے میں کوئی معلومات نہ حاصل ہوسکی۔

۱۵۵۔ مولوی عبدالغفار مرحوم نے اپنے والد مولوی عبدالرؤف انصاری مرحوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مدرسہ کے تین چار بڑے کمروں میں نایاب اور قیمتی کتابیں بھری تھیں تبرکات میں حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا موئے مبارک اور ایک "پٹارا" میں خرقۂ مبارک تھا آپ نے تبرکات کی فہرست میں ایک عصا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں تحریر فرمایا کہ یہ عصا کس کا تھا؟ اور نہ موئے مبارک اور خرقہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ یہ تبرکات حضرت شاہ ابراہیم صاحب تک کن واسطوں سے پہنچا تھا؟ — قیاس ہے کہ یہ تمام تبرکات ونوادرات کے بعد کے وارثان کی کم علمی اور بدبختی کے سبب تلف ہوگئے کیونکہ بسیار تلاش وجستجو کے باوجود کسی کے پاس موجود ہونے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ مؤلف

۱۵۵ صفحہ ۲۶

یہ بھی ہوا تھا

اس عالیشان مسجد کے بارے میں انگریزی عملداری کا یہ واقعہ بھی لکھا ہوا ہے کہ :۔

۱۸۶۴ء میں رام شاستری نامی پنڈت نے شمال کیطرف پشتہ سے ملا کر مکان اپنی نشستگاہ کا بنالیا حکام کو اطلاع دی گئی اس وقت ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ اگر اہل اسلام اس کی مرمت نہ کریں گے تو یہ مسجد نیلام کردی جائے گی۔ اہل اسلام نے سید ضامن علی تحصیلدار کی کوشش سے چندہ جمع کر کے پہلے احاطہ اور جنوبی برج جو کہ گر کر راستہ میں پڑا ہوا تھا بنوایا۔ جب تعمیر برج شروع ہوئی تو رام شاستری نے راجہ مان سنگھ کو برانگیختہ کیا۔ راجہ صاحب اس وقت کمشنر صاحب کے ہمراہ تحصیل کمشنر صاحب پور پرگنہ (دولتمنو) میں موجود تھے انھوں نے دو چار چٹھی کمشنر صاحب کے نام سے اس قسم کی چھپوائیں جسکا یہ مضمون تھا کہ مسلمان مسجد الہ جانی گھاٹ کی مرمت جو مندروں کے درمیان ہے، کرانا چاہتے ہیں۔ اہل ہنود بلوہ پر آمادہ ہیں اور اسقدر مجمع ہے کہ اگر روکا نہ گیا تو مثل بلوہ ۱۸۵۵ء کے ہوگا جو عہد واجدعلی شاہ مابین ہندو مسلمان ہوا تھا۔[156]

۱۵۶۔ دیکھئے تفصیل کیلئے "واجد علیشاہ کے زمانہ کا نہ پہلا اور دوسرا معرکۂ جہاد"، آئندہ صفحات میں مرقوم ہے ـــــ مولف

پہلے راجہ صاحب کمشنر صاحب کے پاس جاکر بیٹھے بعد اسکے ان کی
ہرکاروں کو جن کی معرفت یہ چٹھیاں کمشنر صاحب کے پاس بھیجی گئی تھیں
خانگی طور پر کمشنر صاحب کے سامنے پیش کیئے گئے۔ اور وہ چٹھیاں جو
علی التواتر لکھی گئی تھیں وہ بھی راجہ صاحب نے پڑھ کر سنائیں اور رنجیدگی
ظاہر کی۔ چونکہ کمشنر صاحب کو معلوم تھا کہ اس وقت کمیٹی میں تمام راجگان
کی طلبی بمقام کلکتہ ہے اور راجہ صاحب اس وقت رنجیدہ و غمگین معلوم ہوتے
ہیں۔ پوچھا راجہ صاحب خیر تو ہے؟ ان چٹھیوں کے آنے سے آپکی طبیعت
کو پریشانی کیوں ہو؟ عرض کیا کہ ان چٹھیوں میں لکھا ہے کہ جس طرح ۱۸۵۵ء
میں مابین اہل ہنود و اسلام فساد ہوا تھا ویسا ہی ہونے والا ہے تو مصلحت
وقت یہی ہے کہ میں ادھر چلا جاؤں اور اس فساد کو رفع کروں اور فی الحال
کلکتہ نہ جاؤں۔ ادھر راجہ سے طلبی قسط بھی تھی۔ اس فریب سے کلکتہ نہ گئے
اور قسط سے بھی مہلت لے لی۔ کمشنر صاحب نے گھبرا کر وہ چٹھیاں اہالیان
پولیس کے پاس بھیجدیں۔ کہ مسلمان مسجد کی مرمت نہ کرانے پائیں اسی وقت
مسجد کی مرمت بند کرادیجائے اور یہ فریب کی باتیں حکام کے دل پر اثر کر گئیں
کہ اس مسجد کے لئے فساد ہوا ہے حالانکہ اس کی صفائی کے متعلق بہت سی شہادتیں
ہندوؤں کی کہ اس میں کبھی فساد نہیں ہوا ہے مسلمانوں نے مرتب کر کے
پیش کیا تھا مگر راجہ صاحب کے سبب سے حکام نے ان شہادتوں کا
کچھ بھی لحاظ نہیں کیا اور جس حالت میں تھی ویسا ہی رہنے دیا۔[۱۵]

۱۵۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا، صفحہ ۲۷ ۔ ۱۵۸ ۔ صفحہ ۲۶

مسجد امیر الدولہ حیدر بیگ خاں

اس مسجد کے متعلق مولوی عبدالغفار نے اپنی کتاب گم گشتۂ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ یہ مسجد ۱۱۱۵ ہجری قدسی میں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نائب نواب آصف الدولہ یحییٰ خاں جنت مکانی نے تعمیر کرایا تھا۔[۵۹]

مولوی عبد الغفار کی علمی قابلیت اور تاریخ دانی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کے نائب تھے سنہ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳-۰۴ء) میں تو سلطنت نوابین اودھ کے بانی مبانی سید محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک ہی ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ ۱۱۱۵ ہجری محمد شاہ رنگیلے کا عہد حکومت ہے نواب آصف الدولہ نے ۱۱۸۸ ہجری لغایۃ ۱۲۱۲ ہجری یعنی ۱۷۷۵ء مطابق ۱۷۷۵ء لغایۃ ۱۷۹۷ء حکومت کیا ہے اس لئے سنہ ۱۱۱۵ھ میں حیدر بیگ خاں کیونکر مسجد بنوا سکتے ہیں جبکہ اس سن میں حیدر بیگ خاں کی ماں کی بھی ولادت نہیں ہوئی تھی۔

مسجد کے اندر جو کتبۂ تاریخ سن تعمیر کندہ ہے اسکی عبارت یہ ہے

بعہدِ شاہِ عالم والیِ ہند	وزیر مملکت یحییٰ خاں شد
امیر الدولہ اورا چو نائب	در التوفیق صبر بیکراں شد
در آنجا مسجدِ عالی بنا کرد	کہ جائے طاعتِ دیں پروراں شد
خیالِ سالِ تاریخش نمودم	"محلِّ ذکرِ ربّ" تاریخ ایں شد

یہ مسجد نواب آصف الدولہ کے عہدِ حکومت میں تعمیر ۱۲۰۰ھ ہوئی ہے جیسا کہ
قطعۂ تاریخ تعمیر مسجد کے لفظ، محلِ ذکرِ رَبّ، سے سن ۱۲۰۰ ہجری نکلتا ہے۔

مقبرۂ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
ایں حالِ نیست صوفی عالی مقام را

اس مسجد سے ملحق دکھن جانب ابتک پختہ چہار دیواری سے گھرا ہوا وہ
عظیم احاطہ موجود ہے جو کبھی اس مسجد ہی کا حصہ تھا اب یہ احاطہ بیراگیوں کے قبضہ
میں ہے۔ اسکے ایک بڑے رقبہ کو کھیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور تھوڑے
رقبہ پر پھولوں کا باغیچہ لگا ہوا ہے اس احاطہ میں پورب جانب ایک مقبرہ ہے
جس کے متعلق محمد ہاشم انصاری صاحب اور دوسرے لوگوں نے بتلایا کہ
یہ مقبرہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا ہے۔ جنھوں نے سامنے والی مسجد
مسجد امیر الدولہ حیدر بیگ خاں، بنوائی تھی۔

مولوی عبد الغفار نے اپنی کتاب میں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا ذکر تاریخ
اور بزرگانِ دین کے ساتھ بڑے مبہم انداز میں کیا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے
حیدر بیگ خاں کی بارعب شخصیت کو انھوں نے ولایت کے درجہ میں پہنچانے
سے کیوں گریز فرمایا ہے۔ مسجد مذکور کے ذکر کے ساتھ اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا
ہے۔ مسجد کے سامنے ایک وسیع باغ ہے جس کے اندر مقبرہ کے نور بیگ خاں

بہادر انکے بڑے بھائی (حیدر بیگ خاں ۔ مؤلف) کا ہے

حیدر بیگ خاں ایک ارذل خاندان کا فرد تھا۔ اس کا باپ فتح آباد کابل کے گمنام اور بے ادب فلیوانوں میں سے تھا۔[۱۵۹] یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام اعزا، چاہے وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں چاہے فتح آباد (کابل) میں پیدا ہوئے ہوں سب کے سب بالکل بدتمیز، بے مروت اور شقی القلب تھے اور ان سے ایسے کام سرزد ہوتے تھے جن سے جانوروں کو بھی شرم آتی تھی[۱۶۰]

مرزا ابوطالب اصفہانی نے لکھا ہے کہ حیدر بیگ خاں تمیزدار، عقلمند اور نازک مزاج ہونے کے ساتھ خود غرض بے مروت اور دیرانی پھیلانے میں مشہور رہے ۔ بدسلوکی، بے وفائی اور بے حیائی و کمینگی انکی فطری عادات ہیں جس شخص نے بھی اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی کیا اس کے بدلے میں ہمیشہ اس نے برائی کیا ۔

نواب شجاع الدولہ نے حیدر بیگ خاں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا انکی تفصیل تاریخ اودھ (مؤلفہ حکیم نجم الغنی رامپوری) کے صفحات کی زینت ہیں لیکن اس نے اپنی نیابت کے زمانہ ہی سے نواب موصوف کی جانشینوں سے خیر خواہی کے بہانہ سے یہ ارادہ رکھتا تھا کہ انکا نام نشان تک باقی نہ رہے یہ رعایا کو تباہ کرنے اور ملک کی بربادی کے لیئے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ ـــــ مؤلف) کے خیر خواہ کارکنوں اور شرفاء میں سے ہر ایک کو انکی جگہ اور عہدہ سے ہٹا کر گمنام اور

۱۵۹۔ فلیوان ـــ بالفتح بمعنی بیہودگان و احمقان (غیاث اللغات)

۱۶۰ ـ تاریخ آصفی صفحہ ۲۹

کمینہ فطرت وارذل لوگوں کو مقرر کرتا تھا۔ اس نے نواب مرحوم کے رشتہ دار و
نوکروں سے بھی زیادہ تکلیفیں پہنچایئں چنانچہ جو شہزادے لکھنؤ میں رہتے
تھے ان تمام کے لئے ایک ایک ہزار روپئے ماہوار تنخواہ مقرر تھی
لیکن حیدر بیگ خاں انکو تنخواہ دینے میں ہمیشہ وعدہ خلافی کرتا تھا۔ اس
نے کبھی وقت مقررہ پر محض اس وجہ سے انکو تنخواہ نہیں دیا کہ یہ لوگ فاقہ کریں
اور قرض لیکر ذلیل و رسوا ہوں۔ محل کی جو عورتیں فیض آباد میں رہتی تھیں انھیں
بھی اتنی دیر میں تنخواہیں دیتا تھا کہ وہ فاقے سے تنگ آجاتی تھیں اور بعض
وقت وہ بھوک کے غلبہ سے اسقدر مجبور ہو جاتی تھیں کہ انکی سو دو سو لونڈیاں
حرم سرا سے باہر نکل کر بازار سے غلہ اور ضروریات زندگی کی چیزیں
لوٹ کر محل میں لیجاتی تھیں"[۶۱]۔

صاحب تاریخ آصفی کے مطابق نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت
میں الماس خاں اور حیدر بیگ خاں تمام حکام میں امتیاز رکھتے تھے
مرتضیٰ خاں حیدر بیگ خاں کے پسندیدہ لوگوں میں تھا۔ اس نے (حیدر
بیگ خاں نے) اظہار دوستی اور ملازمت پر تقرر کے بہانے بہت سے
لوگوں کو تباہ و برباد کر ڈالا (صفحہ ۹۵) اسکے برے کاموں کے نتیجہ میں جو
یادگار لعنت لکھنؤ میں باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مزدوروں اور
فقیروں نے اس کی جھوٹی بخشش دیکھکر مانگنے کا طریقہ اختیار کر لیا (صفحہ ۹۶)

۶۱۔ تفضیح الغافلین صفحات ۳۹ - ۵۴ - ۵۶ - ۶۰

تفضیح الغافلین میں مرقوم ہے کہ جس زمانہ میں گورنر دارن ہسٹنگز
کا لکھنؤ میں قیام تھا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ میں قحط کی ایسی زبردست مصیبت آئی
کہ سیکڑوں برس سے اس ملک کے لوگوں نے نہ سنی تھی۔ ہزاروں غریب
آدمی روزانہ بھوک سے مرتے تھے۔ اطراف میں لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے
تھے۔ اور ہر طرف فضا میں بدبو پھیلی رہتی تھی۔ اس قحط میں حیدر بیگ خاں
وارن ہسٹنگز کی طرف سے ایک ہزار روپیہ روزانہ غریبوں میں تقسیم کرنے
پر مقرر ہوا تھا۔ اس کے تمام ملازمین اور پلٹن کے کمیدان بھی اسی
کی طرح خودغرض، نفس پرست اور شقی القلب تھے جو آدھے سے زیادہ
روپیہ خود رکھ لیتے تھے۔ قحط کی مصیبت سے پریشاں حال اور بھوک سے
بیتاب جو کم عمر اور خوبصورت عورتیں روپیہ لینے اس کے ملازمین اور کمیدانوں
کے پاس آجاتی تھیں۔ انھیں وہ لوگ زبردستی حیدر بیگ کی محل سرا میں پہنچا
دیتے تھے۔ اس طرح اس کی محل سرا میں بہت سی حسین وجمیل اور کم عمر عورتیں
زبردستی پہنچادی گئی تھیں۔ اور جب اس کی (حیدر بیگ خاں کی) موت ہوئی
تو اس نے اپنے پسماندگاں میں بہت سی عورتوں کے علاوہ بہت سے لڑکے
لڑکیاں چھوڑیں۔ ان اولادوں میں زیادہ تر اولادیں قحط کی ماری ہوئی عورتوں
کی تھیں جو حیدر بیگ خاں کی محل سرا میں زبردستی پہنچادی گئی تھیں۔ ان تمام
اولادوں میں اکبر علی خاں اور حسین علی خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ منکوحہ
بیوی کے پیٹ سے تھے حسین علی خاں تو برے کاموں اور بداعمالی میں مشہور زمانہ

تھے لیکن اکبر علی خاں باوقار، کم گو اور اچھے اطوار کے تھے اور نیک لوگوں میں تھے۔"[۱۶۱]

حیدر بیگ خاں کے متعلق تاریخ السعادت میں مذکور ہے

"۔۔۔ القصہ در وقت نیابت مخاطب سرفراز الدولہ، ناظم الملک مرزا حسن رضا خاں بہادر شد۔ حیدر بیگ خاں کہ بجسب ظاہر نائب او بود، بخطاب امیر الدولہ انتظام الملک کلہ گوشہ بآسماں بود۔"[۱۶۲]

حیدر بیگ خاں نہایت فضول خرچ آدمی تھا۔ ٹکیٹ رائے نے اس کے مرنے کے بعد اسکے خاصہ (طعام) کے اخراجات، پچاس لاکھ روپے سالانہ ظاہر کئے ہیں (تاریخ آصفی صفحہ ۶۲) اس نے اپنے فطری کمینہ پن اور بدعہد خلافیوں سے مرزا ابو طالب اصفہانی جیسی با صلاحیت اور باوقار شخصیت کو اس حد تک تنگ کیا کہ لکھنؤ میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا اور مجبوراً ترک وطن کر کے کلکتہ جانا پڑا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۶۳)

لکھنؤ کے قحط کے زمانہ میں حیدر بیگ خاں نے قحط زدہ کم سن اور خوبصورت عورتوں کو اپنے محل سرا میں جمع کر لیا تھا۔ اور انھیں اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ سارا وقت زنان خانے میں چڈی چڈے کی چہلوں میں گذارتا تھا۔ اس سبب سے اسکی قوت حیوانی کو نقصان پہنچا تھا۔ چونکہ اسکی جنسی حرص جنوں کی حد تک بڑھی ہوئی تھی اسلئے اپنی قوتِ حیوانی کی کمزوری کی بحالی کیلئے

۱۶۱۔ صفحات ۱۱۲، ۱۱۳۔ ۱۶۲۔ عماد السعادات مطبوعہ منشی نولکشور پریس صفحہ ۱۳۶

اس نے حکیم شفائی صاحب کا علاج شروع کیا حکیم صاحب
موصوف کا حکم تھا کہ گھاس کے ایک تنکا کو "دار چینی کے عطر" میں ڈبو کر
پان میں لگا کر ہر روز دو وقت کھائے۔ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے
اس علاج سے کافی فائدہ دیکھ کر بغیر حکیم صاحب موصوف سے مشورہ کئے
اور مطلع کئے ہوئے کثرت سے "دار چینی کے عطر" کا استعمال کیا "دار چینی
کے عطر" کی گرمی اور لطافت نے اس کی اصلی رطوبتوں کو جو پہلے ختم
ہو رہی تھیں۔ خشک کر دیا۔ اور حرارت غریبہ (جو دق سے پہلے اعضا
پر غالب آجاتی ہے)، پیدا کر دی۔ حکیموں نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن
کوئی فائدہ نہ ہوا اور وہ اپنے اعمال کی سزا گاہ میں پہنچ گیا (ایضاً صفحہ ۱۱۱)
اسکی تاریخ وفات درج ذیل قطعہ تاریخ سے نکلتا ہے جو اسی زمانہ میں کسی شاعر نے کہا

آں کو بغرض تخم بد، مردم کاشت — از ہیچ نیافت بہرہ و جملہ گذاشت
خسرواں دو کون حاصل ہیں بود — تاریخ وفات، فرد ایں بگذاشت

۹۱۰ + ۱۰ + ۷۶ + ۱۲۹ + ۶۲ + ۱۲ = ۱۲۰۶ ہجری

امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے اپنے بڑے بھائی نور بیگ خاں
کی موت کے سترہ سال بعد انتقال کیا[۶۲] اس مقبرہ میں حیدر بیگ خاں
کی وہ شکستہ حال قبر اب تک موجود ہے جسکے نیچے امیر الدولہ انتظام الملک حیدر بیگ
خاں بہادر کیساتھ حقیقی انصاف کا معاملہ درپیش ہوگا
جس امیر الدولہ انتظام الملک حیدر بیگ خاں کو مرنے کے بعد بڑے

---

[۶۲] حیدر بیگ خاں کے بڑے بھائی نور بیگ خاں کی موت ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ مزید
تفصیل گذشتہ اوراق میں "بند گنبد یا بند مقبرہ" کے تحت درج ہے۔ مولف

و فرا ور امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا تھا اور جس
دنیوی جاہ جلال سے آراستہ و پیراستہ شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے
کے وارثان اور اعزا نے قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا کہ ایک طویل
مانہ تک لوگ امیر الدولہ انتظام الملک حیدر بیگ خاں کی پر وقار شخصیت کو فراموشی
عمیق و تاریک غار میں دفن نہ کر سکیں۔ لیکن قدرت کے تازیانہ کو کیا کیا
ائے کہ پونے دو سو برس سے کم کے عرصہ میں اندر ہی قدرت نے موسمی
غیرات کے ہاتھوں اس مقبرہ اور صاحب مقبرہ کی قبر کو تباہ و برباد کر کے ہر
دیدۂ بینا کے لئے ایک مقام عبرت بنا دیا ہے۔

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

مزار مقبرہ شاہ ابراہیم صاحب

اب مسجد امیر الدولہ حیدر بیگ سے چند قدم اُتر جانب آگے
چلئے تو بائیں ہاتھ پر (یعنی اتر جانب) بلندی پر شاہ ابراہیم صاحب کا نہایت
شاندار مقبرہ نظر آئے گا۔ اس مقبرہ کی جدید تعمیر اسی صدی کے نصف کے
بعد کے سالوں میں ہوئی ہے۔ اب یہ مقبرہ نہایت خوشنما اور جاذب نظر
ہو گیا ہے۔ اس جگہ کا ماحول بھی اب کافی پر سکون اور فرحت بخش معلوم
ہوتا ہے۔ سنا

شاہ ابراہیم صاحب کی پیدائش شہر بنارس میں شہنشاہ شاہجہاں
کے عہد میں ہوئی تھی۔ انکے دوسرے برادران دربار شاہی میں منصب
مناسب پر ملازم تھے[۱۶۵]

آپ کے متعلق یہاں عام و خاص میں مشہور ہے کہ آپ صاحب کرامت
اور صاحب تصرفات بزرگ ہیں۔ ہندو اور مسلمان سب ہی آپ کے
آستانہ پر حاضری دیتے ہیں اور بہت ہی ادب و احترام سے حاضر ہوتے
ہیں۔ مؤلف نے تقریباً ایک گھنٹہ کے قیام کے دوران کئی لوگوں کو فاتحہ
خوانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لئے آتے ہوئے دیکھا ہے آستانہ
پر موجود لوگوں نے مؤلف کو بتلایا کہ جمعرات کے دن فاتحہ خوانی اور نذر و نیاز
چڑھانے کے لئے زیادہ لوگ آتے ہیں

اجودھیا شہر کے ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر آپکی بہت سی کرامات
بیان کرتے ہیں اور بعض لوگ تو اپنی عقیدت کے اظہار میں اس قدر غلو سے کام
لیتے ہیں کہ آپکی ذات گرامی ایک ما فوق الفطرت ہستی محسوس ہونے لگتی ہے
اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ انکا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر کوئی شخص چالیس
دنوں تک بلاناغہ آپکے آستانے پر حاضری دے اور اپنی جائز حاجت پیش کرتا
رہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آپکی توجہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ حاجتمند کی حاجت پوری
کر دیتا ہے۔

۱۶۵۔ تاریخ اجودھیا مؤلفہ منشی لچھمی نارائن صدر قانون گو مالک لکشمی پریس گونڈہ طبع اول ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۵۴

حضرت شاہ ابراہیم صاحب نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں ۱۱۱۵ ہجری (مطابق ۱۷۰۳ء) میں انتقال فرمایا۔ آپکے مقبرہ پر جو تاریخ وفات لکھی ہوئی ہے اس کا قطعۂ تاریخ یہ ہے۔

ذات مبارک شاہ کو ہندی زماں بود ! شرف خطاب او وہم از نام اوست منطوق
چو خورستم ز ہاتف تاریخ از وفاتش ! گفتا بدہ بشارت ،، عاشق بوصل معشوق
۱۷۱ + ۱۲۸ + ۸۱۶ = ۱۱۱۵ ھ

ایک دوسری تاریخ وفات یہ بھی ہے
ھُوَالخَالِق دُرِیائے فیض
۸۹۰ + ۲۲۵
= ۱۱۱۵ ہجری

حضرت شاہ ابراہیم صاحب کا عرس ہر سال ماہ رجب کی ۲۶، ۲۷ تاریخوں کو عوام کے چندہ سے ہوتا ہے۔ جسمیں نزدیک و دور کے مرد و عورت ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے ہیں۔ اجودھیا شہر کے مندروں کے اکثر مہنت و براگی بھی آپکے فیض جاریہ کے بیحد زیادہ رطب اللسان ہیں اور عرس میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مراسم عرس شام سے شروع ہوتے ہیں۔ تین دنوں تک پروگرام چلتا رہتا ہے۔ عرس کے آخری دن یعنی ۲۷ رجب کی رات میں قوالی اور تقاریر کا بھی پروگرام ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم صاحب حضرت خواجہ یحیٰ صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔ اور سلسلۂ قادریہ چشتیہ میں آپکو خرقۂ خلافت ملا تھا اور اپنے مرشد حضرت خواجہ یحیٰ صاحب کے حکم و اجازت سے آپنے شہر اودھ میں

اجودھیا میں قیام اختیار فرمایا تھا[۱۶۶]۔ آپکے خاص مریدوں میں فدائی خاں صوبیدار بھی تھے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں مسجد سورگ دواری کے تحت آچکا ہے۔

مزار شاہ علی اکبر چشتی مودودی

تعلق ترک کس سے ہو بالآخر کسکو اپنائیں :: یہ مشکل ہے کسی پر کسطرح ایمان لے آئیں

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں :: کوئی بھی راستہ اپنے لیے جب طے نہ کر پائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مقبرۂ شاہ ابراہیم صاحب کے پچھم جانب محلہ شاہ مدار ہے۔ زمانۂ ماضی میں اسی شاہ مدار محلہ میں علی اکبر چشتی مودودی صاحب کا دولتکدہ، خانقاہ اور مسجد تھی بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کے بعد کے سالوں میں انکے وارثان جو لکھنؤ میں رہتے تھے اجودھیا آکر مکان وغیرہ کو کھود کر فروخت کر ڈالا[۱۶۷] اب شاہ صاحب کے دولتکدہ اور خانقاہ کی جگہ کھیت کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں شاہ اکبر علی چشتی مودودی کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ جب کبھی نواب آصف الدولہ مرحوم لکھنؤ سے فیض آباد تشریف لاتے اور قیام کرتے تو شاہ علی اکبر چشتی مودودی سے

۱۶۶۔ تاریخ اجودھیا مولفہ منشی لچھمی نارائن نانون گو صفحہ ۵۴

۱۶۷۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۲۸۔

ت کے لئے اجودھیا تشریف لاتے [۱۶۸] ۔ ہزاروں لوگ آپ سے
ت تھے اور معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آج بھی کچھ لوگ اپنے دلوں
احترام و عقیدت کا جذبہ رکھتے ہیں ـــ ہم کسی کی معصوم عقیدت اور
نی احترام کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے لیکن حقائق کو دانستہ
ویر تسخ کرنا بھی ہمارے بس کا نہیں ہے۔

شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا تعلق اس دور کے علمائے حق سے تھا۔ یا
اس عہد کی "علماء سوء" کی جماعت کے ایک فرد تھے۔؟ اس پر ہم کوئی
ہرہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ اس وقت شاہ صاحب
قبر میں ہیں، یقیناً انکے ساتھ انصاف کا معاملہ ہو رہا ہوگا۔

مولوی فدا حسین مرحوم [۱۶۹] کے بموجب شاہ علی اکبر چشتی مودودی کی دنیوی
ہ جلال سے آراستہ و پیراستہ، پر وقار و معزز شخصیت، دھوپ کی شدت اور
یہ کی فرحت بخش طبعی خاصیت کے اثرات و منفعت سے آشنا ہونے کیوجہ
سے نواب آصف الدولہ اور انکے نائب و معتمد سرفراز الدولہ نواب حسن رضا
ں کو ہمیشہ خوش رکھنے اور انکے مزید قرب و اعتماد کے حصول کیلئے ہمیشہ کوشاں
سرگرداں رہتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے

---

۱۶۸ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۲۸۶

۱۶۹ صاحب احوال و واقعات ۔ مؤلف۔

کہ لہو ولعب میں مشغول رہنے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انھوں نے
دل سے کوشش کی۔ انکے نائب سرفرازالدولہ نواب مرزا حسن رضا خاں بھی
مذہبی آدمی تھے۔ وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے"[۱] چنانچہ ۰ ۸۰
(مطابق ۹۴ ۱۱ ہجری) میں شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض
کی تحریک سے اودھ کے سنی خاندانوں کو مذہب تشیع اختیار کرنے کی مہم چلائی
گئی ہزاروں سنی خاندان شیعہ ہوئے اور انکو انکی حیثیت کے مطابق انکو جاگیریں
دی گئیں۔ جو بدقسمت سنی خاندان اپنی ضد پر قائم رہے انکی جاگیریں جو شاہان مغلیہ سے
چلی آرہی تھیں ضبط کر لی گئیں [۱]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم نزہتہ الخواطر و گل رعنا کے مؤلف
اور سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولینا حکیم عبدالحی صاحب کے بیان کے مطابق
شاہ علی اکبر چشتی مودودی اور ملا محمد علی فیض آبادی کے مشورہ اور تحریک سے سرفراز
الدولہ نواب حسن رضا خاں نے لکھنؤ میں جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی
سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کیا یہی وہ پہلا
دن تھا جب وسط ہند میں شیعوں نے ۔۔اپنا۔ جمعہ وجماعت علیحدہ کر لئے۔[۲]

---

[۱] ۔ القصہ حسن رضا خاں بہادر سوائے سیر و شکار
در رکاب جناب عالی و صوم و صلوٰۃ باہیچ چیز سروکار نداشت و بانی جمعہ و جماعت در اثنا عشریاں
(عماد السعادات صفحہ ۱۳۷) وفٹ نوٹ ۸۹ [۱] ۔ گل رعنا صفحات ۱۵۳ ، ۱۵۴ نیز لکھنؤ
کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ صفحہ ۳۶
[۲] ۔ گل رعنا صفحہ ۱۵۴

تاریخ کے اوراق پر کوئی تفصیل ایسی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہوسکتا
ودھ کے سنیوں کے خلاف شاہ صاحب کے اس رویہ کے پس پشت کونسا
یہ کارفرما تھا؟ انکے بعض معتقدین کا کہنا ہے کہ بظاہر سنیوں کے خلاف مشورہ
ر شاہ صاحب نواب وقت کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب رہے
ن حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنے عظیم نیک مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی
یعنی اسطرح نواب وزیر کا قرب اور خوشنودی حاصل کر لینے کے بعد وہ جس
ر اودھ کے سنیوں کی جاگیریں اور جائیدادیں بچا سکتے تھے بلا ضرر اور شر
لیا۔ یہ شاہ صاحب موصوف کی فراست اور دور بینی اور دور اندیشی کا ثمرہ
ہے کہ اودھ میں بہت سے سنیوں کی جائیدادیں اور جاگیریں ضبط ہونے سے
وظ رہیں

دوسرے زیادہ لوگ اوّل الذکر اصحاب کی رائے سے قطعی اتفاق نہیں کرتے
اسے ذہنی دیوالیہ پن کی تاویل بتلاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ شاہ اکبر علی چشتی مودودی ایک صحیح العقیدہ سنی خاندان
ں پیدا ہوئے اسی ماحول میں تحصیل علم کیا پروان چڑھے اور وقت کے مشائخ
ر میں شمار کئے گئے۔ انکے اجداد کے نام بھی شاہان مغلیہ کی عطا کی ہوئی جاگیر
ھی جو وراثتاً آپکو ملی تھی۔ جس کے تحفظ اور بقا کیلئے شاہ صاحب موصوف
ی خود غرضی، نفس پرستی اور ردا پوش اخلاقی پستی اور ایمانی کمزوریوں نے اودھ
کے سنیوں کو داؤ پر لگا دیا۔

کورانہ عقیدت کا یہ نفرت آفریں خاصہ ہے جو ہر معتقد میں اس کے جذبۂ عقید
کی کمی زیادتی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہر خوش عقیدہ شخص، اپنی مرکز عقیدت شخصیت
کی کسی کھلی یا فاش لغزش کو لغزش یا خطا تسلیم کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے
اور اپنے ذہنی ہیجان و کرب کی نام نہاد تسکین کے لئے لاحاصل تاویلات سے
مداوا کرنا چاہتا ہے۔

شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا مزار ایک مولسری کے درخت کے نیچے چ
پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ شاہ صاحب موصوف کے زمانۂ حیات میں ا
خانقاہ کی نشستگاہ تھی [۱،۲]۔ شاہ صاحب کے کارہائے نمایاں پر اس سے
زیادہ ہم کچھ اور کہنا نہیں چاہتے۔ ؎

ہر چند زباں کھل نہ سکی انکے ستم پر
انصاف بھی کہہ دیں گے ہم ہم سے نہ ہوگا

پیر کشائی کا مزار جس جگہ پر شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا مزار ہے اسی قبرستان
میں ایک بلند مقام پر ایک شکستہ چہار دیواری کے اند
ایک بہت ہی پرانی اور بوسیدہ مزار ہے جو تقریباً دو گز لمبی ہے جو عوام میں پیر
کشائی کی قبر کے نام سے مشہور ہے

مولوی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ عوام میں مشہور ہے کہ آپ حضرت سید
سالار مسعود غازی (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاد تھے [۱،۲]۔ مولوی عبدالکریم صاحب

۱،۲ ۔ گم شدہ حالات اجودھیا صفحہ ۲۸

[بخ]اری مرحوم نے لکھا ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ بہرائچ میں [سید] سالار مسعود غازی کے میلہ میں جاتے ہوئے دفالی پیر کشائی کی مزار پر حاضری [دے ک]ر ہی آگے کیطرف بڑھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ پیر کشائی کے مزار کے سرہانے ایک [ایس]ا پتھر لگا ہوا ہے جس پر کوئی عبارت کندہ ہے لیکن ایک طویل زمانہ تک یہ [پتھ]ر لوگوں کی عدم توجہی کا شکار رہنے کی وجہ سے اسقدر غیر واضح ہو چکا ہے کہ پڑھا [ن]ہیں جاتا۔

اب پیر کشائی کے مزار کے سرہانے کوئی پتھر نہیں ہے اور نہ آپکا ذکر کسی کتاب [میں] مؤلف کی نگاہ سے گذرا ہے جو باتیں عوام میں آپکے متعلق مشہور رہیں وہ قابل [ا]عتبار نہیں ہیں سنی سنائی ہیں۔

[چ]اہ صحت محلہ شاہ مدار اور کوشلیا گھاٹ کے درمیان ایک نہایت قدیم کنواں ہے جو موجودہ محلہ عالم گنج کٹرہ میں واقع ہے جسکے [مت]علق تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس کنواں کو حضرت نصیر الدین [چ]راغ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بنوایا تھا۔ یہ کنواں صحت کنواں کے نام [س]ے مشہور تھا۔ جو مریض صدق دل سے اس کنواں کا پانی پیتا تھا اللہ تعالیٰ

---

[۱]۔ سید سالار مسعود غازی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات و واقعات کی جسقدر بھی کتابیں مؤلف کی نگاہ سے گذری [ہیں ا]ن میں پیر کشائی کے نام کے کسی شخص کا آپکا استاد ہونا نہیں لکھا ہے۔ آئینہ مسعودی کے صفحہ ۳۸ پر لکھا ہے [کہ] سید ابراہیم بارہ ہزاری نے سید سالار مسعود غازی کا بسم اللہ شروع کرایا تھا مگر بتحصیل علم کیلئے [آئ]ینۂ مسعودی بھی بالکل خاموش ہے۔ — مؤلف

شفا عطا فرماتا تھا۔[۱۰۵] آپکی برکت سے ابتک یہ تاثیر باقی ہے کہ جو بیمار صدق دل سے اس کنوئیں کا پانی پیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے صحت کلی عطا فرماتا ہے۔

فی الوقت اس کنوئیں کا پانی کھاری ہے اور نزدیکی کھیتوں کی سینچائی کے کام میں آتا ہے۔ مؤلف نے جب اس کنوئیں کی صحت افزا تاثیر کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو لوگوں نے لاعلمی ظاہر کیا ممکن ہے کہ زمانۂ ماضی میں اس کنوئیں کا پانی شیریں رہا ہو۔ اور اس وقت اسمیں صحت افزا تاثیر رہی ہو۔ فی الوقت تو یہ کنواں ایک خام راستہ (پگڈنڈی) کے کنارے واقع ہے اور گھاس پھوس پڑنے کیوجہ سے پانی کی بو بھی خراب ہو گئی ہے۔ موجودہ حالت میں اس کنوئیں کے پانی کی صحت افزا تاثیر کا تصور بھی محال ہے۔

خانقاہ و مزار شاہ فتح اللہؒ

محلہ آشاہ مدار کے دکھن جانب محلہ چراغ دہلی ہے (جو اس وقت عالم گنج کٹرہ میں تا ہے) جو حضرت نصیرالدین چراغ دہلی (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام پر آباد ہوا تھا۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ صاحب مرحوم علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ پیراستہ اور باکمال بزرگ تھے۔ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کی اجازت سے آپکے مکان خاص میں سکونت اختیار فرمائی تھی۔[۱۰۶]

۱۰۵۔ صفحہ ۲۹
۱۰۶۔ صفحہ ۲۱

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہی مکان آپکی نشستگاہ اور خانقاہ تھا لیکن اکثر
اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ انکا کہنا ہے کہ شاہ فتح اللہ صاحب کی خانقاہ
مسکونہ سے علیحدہ تھی جو پاس تھی
وقت آپ کا مزار ایک پختہ چہار دیواری کے اندر موجود ہے اور بہتر
ت میں ہے۔

مرمت خانقاہ (فتح اللہ صاحب)

گم گشتہ حالات اجودھیا میں مرقوم ہے کہ اس خانقاہ کی پہلی مرمت
علی ناظم نے کرایا تھا چند سالوں بعد جب دیواریں بارش سے شکستہ ہو کر
یں تو فیض آباد کے ایک مشہور تاجر شیخ رمضان علی مرحوم نے جنھوں نے
بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہما) کے آستانہ کی مرمت کرایا تھا۔ اس خانقاہ کی
سر نو مرمت کروایا تھا۔
اب سے تقریبا پینسٹھ سال قبل یعنی ۱۳۳۵ھ ۱۹۱۷ء میں خواجہ برکات اللہ صاحب
ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے اور فیض آباد میں محکمہ آبکاری میں انسپکٹر
تھے۔
مذکور معہ احاطہ از سر نو درست کرایا تھا۔[1] شاہ فتح اللہ صاحب کے اودھ
آنے اور خانقاہ وغیرہ کا مفصل حال اخبار الاخبار میں تحریر ہے۔ آپ بدایوں
کے رہنے والے تھے حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے آپکو بچپن ہی سے

(1) خواجہ صاحب کے اکثر قریبی احباب کا کہنا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی اوپری آمدنی سے
طرح کے اور بہت سے کام کئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مؤلف

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے سپرد فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے استاد حضرت
چراغ دہلی کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے متبحر عالم اور صاحب فیض
کمال بزرگ ہوئے۔ ہزاروں گم کردہ راہ لوگ آپکی توجہ اور فیض سے
راہ راست پر آئے اور کامیاب و کامران ہوئے۔

مزار شاہ قاسم

حضرت شاہ فتح اللہ صاحب کے مزار کے احاطہ کے پورب جانب حضرت
شاہ قاسم صاحب کی قبر بتلائی جاتی ہے مؤلف گم گشتہ حالات اجودھیا نے
روایت کیا ہے۔ کہ انھیں معتبر بزرگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ شاہ محمد قاسم
صاحب شاہ فتح اللہ صاحب کے فرزند تھے اور اپنے والد کے پائینتی مدفون
ہوئے

اس جگہ کئی قبریں ہیں ان میں شاہ محمد قاسم صاحب کی قبر کونسی ہے ہم لوگوں
کو اس کا علم نہ ہو سکا اور نہ کسی اور ذرائع سے نشاندہی ہو سکی۔

درگاہ حضرت مخدوم بندگی نظام

حضرت شاہ فتح اللہ صاحب کی
خانقاہ کے پورب جانب ایک بلند
چبوترہ پر کچھ مزارات ہیں جو حضرت مخدوم بندگی نظام کی درگاہ کے نام سے ا
سے ساٹھ ستر برس پہلے تک کافی مشہور تھی ۱۳-۱۲ ۱۹ء تک اس جگہ ایک
خانقاہ یا مدرسہ کی پختہ چہار دیواری اور ایک قناتی مسجد کی چہار دیواری
موجود تھی لیکن اب نہ تنہیں قناتی مسجد کی چہار دیواری کا نام و نشان باقی رہ
گیا ہے یا خانقاہ و مدرسہ کا آثار!

اس وقت حضرت مخدوم بندگی نظام کا مزار ایک احاطہ کے اندر واقع ہے
ن کے سرہانے پر نیم کا ایک درخت سایہ کئے ہوئے ہے۔ احاطہ کے باہر بھی کئی
تہ قبریں ہیں جن کے متعلق کسی شخص کو کوئی علم نہیں ہے کہ یہ قبریں کن اصحاب کی ہیں
حضرت مخدوم بندگی نظام کا ذکر مولف کو کسی کتاب میں نہیں ملا اور نہ یہ بات
ی معلوم ہو سکی کہ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ دیگر خاندانی حالات، سلسلہ ارادت، صیا میں
نے کے بعد تبلیغ دین وغیرہ کی مساعی کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
مولوی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے کہ ضلع سلطانپور کے کنتوتی موضع کے
یخ زادے خود کو حضرت مخدوم بندگی نظام کی اولاد بتاتے ہیں لیکن اس بات
ر یقینی طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

مزار شاہ درویش

حضرت شاہ محمد قاسم صاحب کے مزار کے پیچھے شاہ درویش یا درویش شاہ
صاحب کا مزار ہے۔ آپ کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ شاہ محمد قاسم
صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ آپ شاہ بڈھن
صاحب بہرائچی کے خلیفہ مجاز تھے۔[۱۷۸] ایک روایت لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ
مولانا عبدالرحمن لکھنوی مرحوم جو شجرہ اپنے خلیفوں کو دیا کرتے تھے، اس میں
"شاہ درویش قاسم اودھی" لکھا ہوا تھا۔[۱۷۹]

۱۷۸۔ آپ حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کے مورث اعلیٰ ہیں جنکا ذکر مسجد ٹاٹ شاہ کے بیان میں کیا جا چکا ہے
۱۷۹۔ آپ مولانا عبدالقدوس صاحب کے خلیفہ تھے۔

مزار چپ شاہ و شاہ علاء الدین

تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا میں تحریر ہے کہ یہ درگاہ پانچ سو سال سے مشہور چلی آرہی ہے۔ تمام بزرگ اس درگاہ کا احترام کرتے تھے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ اس درگاہ میں کسی صاحب حال چپ شاہ نامی بزرگ کا مزار تھا۔ متذکرہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ یہ درگاہ زیارت گاہِ خلقِ خدا ہے۔ لیکن مولف کو چپ شاہ کے مزار کا نشان تک نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ محمد ہاشم انصاری صاحب بھی کوئی رہنمائی علاوہ اس کے نہ کر سکے کہ لوگ یہاں کسی بزرگ باکرامت چپ شاہ کا مزار بتلاتے رہے ہیں۔

چپ شاہ کے مزار کی طرح، اس سے متصل قبرستان جو اب کھیت بن چکا ہے، مولف کو مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے خلیفہ حضرت علاؤ الدین صاحب کی قبر کی بھی لوگ نشاندہی نہ کر سکے اور اس تحقیق میں محمد ہاشم صاحب کی کوششیں بھی ناکام رہیں۔

خانقاہ شاہ مظفر صاحب

خانقاہ شاہ فتح اللہ صاحب دکھنی گوشہ کی طرف شاہ مظفر صاحب کی خانقاہ تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے عہد کے بزرگ تھے۔ جس جگہ آپ کی خانقاہ تھی، اس سے متصل حضرات اورنگ زیب عالمگیر رح کے زمانہ کی تعمیر کی ہوئی مسجد ابتک موجود ہے۔ یہ مسجد اجودھیا کی اُن چند خوش قسمت

ساجد میں سے ایک ہے جو نمازیوں سے آباد ہے اور جس میں پانچوں وقت پابندی
کے ساتھ نماز باجماعت ہوتی ہے۔ محلہ کوٹھی گھاٹ دوراہاں کنواں کے نمازی مسلمان
موصاً اور اس محلہ کے اطراف کے مسلمان، اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے
تے ہیں۔ آج کل اس مسجد میں اخلاق احمد صاحب امامت کے فرائض انجام دیتے
ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت اورنگ زیب
عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانۂ حکومت میں دہلی کے شاہی خزانہ سے چارسو اسی[180]
روپیہ سالانہ برائے مصارف خانقاہ و مسجد مقرر تھا، جو نوابین اودھ کے آخری
دورِ حکومت تک لکھنؤ کے شاہی خزانہ سے برابر ملتا رہا۔[180]

معتبر لوگ بتلاتے ہیں کہ کمپنی سرکار بہادر نے بھی کچھ دنوں تک قدرے
کمی کے ساتھ مصارف خانقاہ و مسجد کے لئے دیا لیکن جب انگریزی سرکار کا
اودھ پر مکمل کنٹرول ہو گیا تو مصارف کی یہ رقم بند کر دی گئی۔ انقلابات زمانہ کے
بےدرد ہاتھوں نے اس خانقاہ کا نشان تک مٹا ڈالا ہے۔

مزار شاہ عبدالحق

شاہ عبدالحق مرحوم شاہ مظفر مرحوم کی دختری اولاد میں سے تھے۔[181] تیرہویں

۱۸۰۔ تاریخ اجودھیا (مولفہ منشی لچھمی نرائن صدر قانون گو گونڈہ) کے صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے۔ چار پانچ
سو روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ مؤلف۔

۱۸۱۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۳۸۔

صدی ہجری میں آپ کا شمار اودھ کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ شاہ مظفر صاحب کی نسبت سے لوگ آپ کا کافی احترام کرتے تھے۔ آپ نے ۵ رمئی ۱۸۵۸ء (مطابق ۲۲ ر رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ) بروز پنجشنبہ انتقال فرمایا اور شاہ مظفر صاحب کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار ابتک موجود ہے اور بہت حالت میں ہے۔

مزار شاہ جمال گوجری

شاہ مظفر کی خانقاہ سے اب مسجد کے پاس آیئے۔ اس جگہ پر آپ کو محلہ عام گنج کٹرہ جانے والی سڑک ملے گی۔ یہاں سے تھوڑی دور پچھم جانب چلنے یہاں داہنے ہاتھ پر آپ کو ایک راستہ نظر آئے گا۔ اس راستہ پر تھوڑی دور سامنے کی طرف چل کر بائیں ہاتھ کو مڑ جائیے۔ یہ راستہ بالکل جنگل جیسا معلوم پڑتا ہے۔ آگے چلنے کے بعد کھیتوں کے درمیان آپ کو حضرت شاہ جمال گوجری کی درگاہ نظر آئے گی۔ ممکن ہے کہ زمانہ ماضی بعید میں اس جگہ کوئی شاندار عمارت یا خانقاہ رہی ہو، لیکن اب صرف ایک چہار دیواری کے اندر حضرت جمال شاہ گوجری کا مزار موجود ہے۔

سید محمد کرمانی نے اپنی کتاب "سیر الاولیاء" (صفحہ ۱۹۰) میں، جو حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات پر سب سے پہلی اور پرانی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ — وہاں (اجودھیا میں) بعض بزرگوں کے مقبرے ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری (المتوفی ۸۵۸ھ مطابق ۱۴۵۴ء) ہے۔

تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ جمال گوجری کا مفصل
اخبار الاخبار، مراۃ الاسرار اور ملفوظات حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی میں
موجود ہے۔ اپنے ملفوظات میں حضرت مخدوم احمد عبدالحق نے لکھا ہے کہ "میں
نے بھکر سے پنڈ دادنخان تک سفر کیا ہے اور مجھے صرف ایک ہی مسلمان بچہ ملا ہے"
(یعنی شاہ جمال گوجری)۔

کہتے ہیں کہ جس مقام پر اس وقت شاہ جمال گوجری صاحب کی قبر بنی ہوئی
ہے۔ اسی جگہ پر حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی نے چھ ماہ تک ایک قبر میں
چلہ کشی کیا تھا۔

اخبار الاخبار میں یہ دلچسپ واقعہ بھی درج ہے کہ قیام شہر اوچ (اوچ)
کے زمانہ میں ایک کتیا نے حضرت مخدوم صاحب کے مسکن میں بچے دیئے۔
حضرت مخدوم نے اس کتیا کے بچوں کی پیدائش پر شہر والوں کی دعوت کی، جسمیں
سارا شہر تک کو طلب فرمایا۔ لیکن حضرت شاہ جمال گوجری کو اس دعوت میں
مدعو نہیں کیا۔

مشہور ہے کہ دوسرے دن علی الصباح حضرت سید جمال گوجری، حضرت
مخدوم احمد عبدالحق ردولوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کل کی
دعوت میں شاید آپ اس عاجز کو بھول گئے۔ حضرت مخدوم قدس سرہٗ نے
جواب دیا کہ یہ تو کتوں کی مہمانی تھی۔ دنیا کے کتوں کو طلب کیا تھا۔ تو تو مسلمان
بچہ ہے۔ تجھے اس دعوت سے کیا واسطہ۔

لفظ گوجری کے لقب کے متعلق مراۃ الاسرار میں تحریر ہے کہ ایک دن سید موسیٰ

عاشقان کے گھر میں فاقہ تھا، حضرت شاہ جمال صاحب کو تصرفات باطنی سے
معلوم ہو گیا کہ حضرت موسیٰ عاشقان کے یہاں آج کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ
آپ کو شیر برنج پکوا کر، ایک مٹی کے برتن میں رکھ کر اور اپنے سر پر لے کر حضرت
موسیٰ عاشقان کے پاس گئے۔ حضرت موسیٰ عاشقان نے آپ کو اس حالت میں
دیکھ کر فرمایا" بابا مثل گوجراں آوردی"۔ اُسی دن سے آپ کا لقب" گوجری" پڑ
گیا۔

اب اس جگہ سے آپ پھر داہنے ہاتھ (یعنی پورب طرف) کو مڑیئے، اور
سڑک پر آجائیے۔ سامنے ہی آپ کو "مالیوں کا پنچایتی مندر" ملے گا۔ یہاں سے
تھوڑی دور پورب کی طرف اور چلئے تو آپ کو" راجہ رام کوٹ" نامی مشہور
محلہ ملے گا۔[۱۸۲] زمانہ ماضی میں، اس کوٹ میں چار برج تھے۔ مغربی برج کے

۱۸۲۔ زمانہ ماضی میں محلہ راجہ رام کوٹ کا نام اکبر پور تھا۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے خود ہی اس کا نام اپنے نام پر اکبر پور رکھا تھا۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء کے بموجب اس کوٹ کے اندر کی آراضی کو شہنشاہ اکبر نے مشائخ کبار کی قبرستان کے لئے عطا فرمایا تھا۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم کی تحریر کے بموجب اکثر شاہی فرامین میں یہ عبارت تحریر ہے کہ اسقدر آراضی تکیہ کے لئے دی گئی چنانچہ اب سے ستر اسی برس پہلے تک اس کوٹ کے اندر کئی قبرستان موجود تھے، جن میں شہزادوں کی قبریں موجود تھیں اور اچھی حالت میں تھیں۔ (تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء صفحہ ۴۰)

ے متعلق روایت ہے کہ اس حصہ میں رام چندر جی پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی
ں ان کا باورچی خانہ (رسوئی گھر) تھا جسے شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر نے منہدم
رواکر ایک عالیشان مسجد تعمیر کروایا جو نہ صرف بلاد ہند بلکہ بیرونِ ہند میں بھی
بری مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ بابری مسجد کے منبر پر جو کتبہ تاریخ کندہ ہے
س کی عبارت یہ ہے:-

ابری مسجد

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش	بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں محبطِ قدسیاں را	امیر سعادت نشاں میر باقی
'بود خیر باقی' چو سالِ بنائش	عیاں شد کہ "محکم" "بود خیر باقی"
۹۳۵	۱۲ + ۱۲ء۱۰ء۸۱+۱۳
	۹۳۵ء

اودھ کی تاریخ میں جامع مسجد بابری یا بابری مسجد اور ہنومان گڑھی سے
کچھ ایسی تلخ اور شیریں یادیں وابستہ ہیں جنکی تیرگی کے بھیانک سائے اور
جالوں کے روشن ہیولے ہمیشہ ذہنِ انسانی کو دعوتِ غور وفکر دیتے رہیں گے
ب وہی اجالے اور اندھیرے اِن مقامات کی تقدیس وعظمت کے مقدر رہیں۔
ہم نے دانستہ طور پر اس جگہ، بابری مسجد کے ذکر کے ساتھ ان حالات
وواقعات کو تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ جس "رہبرانہ" تسلسل کے ساتھ اس
کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے، حالات وواقعات کا اندراج رہبرانہ تسلسل میں رخنہ
اندازی پیدا کرنے کا باعث ہوتا اور قاری اپنے کو "بھٹکتا ہوا" محسوس کرتے۔
اس لئے کتاب کے آخری صفحات پر وہ واقعات بالتفصیل درج کر دیئے

گئے ہیں۔ ـــــ مؤلف۔

تفصیلات متعلقہ صفحہ ۲۷۳ سطر

آئیے اب کچھ آگے کی طرف چلیں۔

زمانۂ ماضی میں بابری مسجد کے پورب جانب قاضی عبدالحفیظ صاحب کے قبرستان کی آراضی تھی۔ جو بعد کے زمانہ میں قاضی صاحب کے اخلاف نے قبرستان کو تمباکو کی کاشت کرنے والے کاشتکاروں کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ ان کرایہ دار کاشتکاروں نے تمام قبروں کو کھود کر ہموار کھیت بنا ڈالا اور قبروں کی اینٹوں کو فروخت کر کے نقد روپیہ کر لیا۔

جب قبرستان کی تمام زمین کھیت کی شکل میں ہموار ہو گئی تو قاضی صاحب کے وارثان نے اس زمین کو کافی مہنگے داموں پر بیراگیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا[۱۸۳]

مولوی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے کہ بابری مسجد سے "رنگ محل" تک جو آراضی بلندی پر واقع ہے، اس پر جسقدر بھی "استھان" اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ سب ان کے سامنے ہی تعمیر ہوئی ہیں۔[۱۸۴] لوگ بتلاتے ہیں کہ پہلے ان "استھانوں" کے پیچھے کچھ پختہ اور مضبوط قبریں باقی تھیں لیکن فی الوقت کسی قبرستان کا نشان ان جگہوں پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

۱۸۳۔ گم گشتہ حالات اجودھیا۔ صفحہ ۸۔

۱۸۴۔ ایضاً۔

مزار پیر نصیر الدین

بابری مسجد کی پشت پر، یعنی پچھم جانب زمانہ دراز سے ایک قبر پیر نصیر الدین کے نام سے مشہور چلی آرہی ہے۔ زمانہ ماضی میں لوگ اس قبر پر فاتحہ خوانی اور نذر ونیاز چڑھانے کے لئے برابر آتے رہتے تھے۔ اُس وقت اس قبر کے آس پاس کافی صفائی رہتی تھی۔ لیکن اب یہ جگہ بالکل ویران ہے۔ مولف کو کسی شخص کے ذریعہ پیر نصیر الدین صاحب کے مزار کی نشاندہی نہ ہوسکی اور نہ آپ کے متعلق کوئی معلومات ہی حاصل ہوسکی کہ آپ کون تھے؟ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ کس سلسلہ سے وابستہ تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پیر نصیر الدین صاحب کے حالات تاریکی میں ہیں۔ محمد ہاشم انصاری نے مولف کو بتلایا کہ انہوں نے اپنے بچپن میں لوگوں سے سنا تھا کہ پیر نصیر الدین صاحب شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں شہر اودھ کے مشائخ کبار میں سے تھے۔

مزار بزرگ نصیر الدین

میر فتح علی کے قبرستان کے احاطہ کے متصل ایک ریٹھا کے درخت کے نیچے بلند و پختہ چبوترہ پر کسی صاحب طریقت بزرگ نصیر الدین کی قبر تھی، لیکن نہ میر فتح علی کی قبرستان باقی ہے، نہ بزرگ نصیر الدین صاحب کی احاطہ سے متصل قبر اور نہ ریٹھ کا وہ درخت ہی باقی ہے جسکے نیچے بزرگ نصیر الدین کی قبر تھی۔

مولوی عبد الغفار صاحب نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے آپ کی قبر کے

پاس مراقبہ کیا ہے اور بہت محظوظ ہوئے ہیں۔[۱۸۵] اس کے علاوہ آپ کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔

مزار قاضی قدوۃ

بابری مسجد کے سامنے، یعنی پورب جانب، میدان میں ایک پختہ چبوترہ پر قاضی قدوۃ کا مزار ہے۔[۱۸۶] زمانہ ماضی میں قاضی قدوۃ صاحب کے مزار کے متعلق چاروں طرف قبریں ہونے کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن اب قبرستان کھیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور تمام قبریں تلف ہو چکی ہیں۔

زمانہ سابق میں، اس جگہ ایک قناتی مسجد تھی جس کے صحن میں قاضی قدوۃ صاحب کا مزار تھا۔ اب اس مسجد کی دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ صحن مسجد ایک چبوترہ کی شکل میں باقی رہ گیا ہے جس پر قاضی قدوۃ صاحب کا مزار ابتک باقی ہے۔

صاحب تاریخ گم گشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ تقریباً نو سو برس کا عرصہ گذرا ہے کہ قاضی قدوۃ صاحب بطور حاکم شہر اودھ (اجودھیا) میں تشریف لائے تھے۔[۱۸۷] آپ کے نام سے زمانہ سابق میں ایک محلہ دریائے گھاگھرا کے کنارے

۱۸۵۔ صفحہ ۴۰

۱۸۶۔ قاضی قدوۃ صاحب کا مزار چونکہ بابری مسجد کے سامنے ہے اور اس جگہ پر پولس کا پہرہ رہتا ہے۔ مسلمانوں کا اس جگہ پر جانا قانوناً ممنوع تو نہیں ہے، لیکن حالات اور سابقہ واقعات کے پیشِ نظر، مسلمان اس جگہ پر احتیاطاً نہیں جاتے۔

ور اسی محلہ میں آپ کی قبر تھی۔[۱۸۸]
کہتے ہیں کہ تقریباً دو سو سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ آپ کے نام کا محلہ دریائے
کے کٹاؤ میں آگیا تھا۔ اجودھیا کے اکثر ضعیف العمر لوگوں کی زبانی سنی ہوئی
وایت بھی متذکرہ بالا کتاب میں تحریر ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ دریائے
میں طغیانی آنے سے قبل قاضی قدوۃ نے ایک بزرگ کو خواب میں
لیا کہ ہماری نعش یہاں سے دوسری جگہ منتقل کردو۔ لوگوں کا بیان ہے کہ
نعش کو منتقل کرنے کے لئے قبر کو کھولا گیا تو وہ بالکل صحیح حالت میں تھی
ں میں سے ایک عجیب قدرتی خوشبو آرہی تھی۔[۱۸۹] نعش کو قبر سے نکال کر

کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوۃ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں بطور حاکم
ضی شہر آنا ثابت نہیں ہے۔ نیز متذکرہ بالا حوالہ میں تقریباً نو سو سال پہلے کا
نہ بتایا گیا ہے جو فرخ سیر یا محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں شہر اودھ
جودھیا) میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت آبادی تھی تو ضرور، لیکن اس شہر کی حیثیت
سلامی اسٹیٹ" جیسی تو تھی نہیں جس میں "قاضی شہر" رہتا تھا جو مسلمانوں کے متنازعہ
ملات کو اسلامی قوانین کے مطابق فیصل کرتا تھا۔ پتہ نہیں مولف کتاب نے بلا
یق وسند کیونکر لکھ دیا کہ آپ بطور حاکم یا قاضی شہر، اجودھیا میں تشریف لائے
ے؟ مولف کو چاہئے تھا کہ وہ تحقیق کے ساتھ یہ تحریر فرماتے کہ فلاں بادشاہ کے وقت
ں فلاں جگہ سے آئے تھے اور فلاں عہدہ پر کام کرتے تھے۔ —— مولف۔

صفحہ ۴۱
صفحہ ۴۲

دوبارہ اس جگہ دفن کی گئی جہاں پر کہ اس وقت ہے۔

متذکرہ بالا کتاب کے صفحہ ۲۷ پر یہ بھی تحریر ہے کہ قاضی قدوۃ صاحب
کی اولادیں لکھنؤ، بارہ بنکی اور فیض آباد کے اضلاع و قریات میں آباد ہیں۔ یہ
شیخ زادے ہیں اور اپنے نام کے بعد "قدوائی" لکھتے ہیں۔

قاضی قدوۃ صاحب کے متعلق کوئی مستند تفصیل یا معلومات موا
کو نہ حاصل ہو سکیں۔ البتہ قاضی صاحب کی تاریخی شخصیت کی حیثیت مبہم
جانے کی وجہ سے، ان سے منسوب اور متعلق دیگر باتیں مشکوک سمجھنے
کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔

مزار ہتی شاہ

راجہ رام کوٹ قلعہ کا دوسرا برج دکھن جانب تھا۔ اس برج کے متعلق
میں یہ روایت مشہور ہے کہ شری رام چندر جی کے زمانہ حکومت میں اس بر
میں ان کا شاہی خزانہ رہتا تھا اور شاید اسی شاہی خزانے کی مناسبت
اہل ہنود اسے کھمیر ٹیلہ کہتے ہیں۔ اس ٹیلہ پر کسی ہتی شاہ نامی بزرگ کا مزار
تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ہتی شاہ، بزرگ موصوف
اصل نام نہیں تھا، بلکہ عرف ہے۔ جسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ تقر
نوسو سال کا زمانہ گذرا ہے کہ جب اودھ پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھ
جس کا دارالسلطنت اجودھیا ہی تھا۔ اس راجہ کے زمانہ حکومت میں ا

بزرگ، اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اجودھیا تشریف لائے۔[۱۹۰] اور اسی
ر قیام کیا۔ راجہ کے آدمیوں نے مزاحمت کی اور درویش کو تکلیفیں پہنچائیں
رویش اسی برج پر قیام کرنے کے لئے بضد رہا۔ آخر کار راجہ کے آدمیوں
رویش واسکے ہمراہیوں میں لڑائی ہوئی جس میں درویش سمیت اس کے
مراہی شہید ہوئے اور ٹیلہ پر ہی سندی (ہٹی) درویش اور ان کے
میوں کا مزار بنا۔ اور یہ جگہ مزار ہٹّی شاہ کے نام سے عوام میں مشہور ہوگئی
آج ہٹی شاہ کے مزار کا کہیں نام و نشان باقی نہیں رہا ہے۔ صرف
شکستہ دیوار باقی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے، نشیب میں خود رو درختوں
ڑیوں کا جنگل ہے۔ اس جگہ پر بھی پولس کا پہرہ لگا ہوا ہے۔
آپ کے متعلق بھی بہت سی بے سروپا روایات لوگوں میں مشہور ہیں
کے متعلق بھی اب کوئی شخص کچھ نہیں جانتا کہ آپ کون تھے؟ کن وجوہات
پر وہ اس ٹیلہ پر قیام کے لئے بضد تھے؟ اور کیا واقعی ان سینہ بسینہ
نے والی روایتوں میں کچھ صداقت بھی ہے؟ آپ کس راجہ کے دورِ حکومت
جودھیا شہر میں تشریف لائے تھے؟

ار یقین شاہ

قلعہ راجہ رام چندر کوٹ کے تیسرے بُرج کو سگریوٹیلہ کہتے ہیں۔ اب
تقریباً ستر اسی برس پہلے تک، اس ٹیلہ پر بہت سی قبروں کے نشانات

---

۱۹۰ صفحہ ۲۴۴۔

ملتے تھے۔ اس برج کے نیچے، پورب جانب یقین شاہ نام کا قبرستان تھا
جو اب کھیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

گم گشتہ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ جب مولوی عبدالکریم انصاری
مرحوم اپنی یادداشتوں سے، اپنی کتاب مدینۃ الاولیاء مرتب کر رہے تھے
اس وقت اس جگہ پر ایک قبر باقی تھی جس پر کتبہ لگا ہوا تھا۔[191] آپ کے
وغیرہ سے بھی لوگ لاعلم ہیں۔

راجہ رام چندر کوٹ قلعہ کا چوتھا برج، جو پورب کی طرف تھا، اب
ہنومان گڑھی کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر ہنومان جی کا مشہور مندر
ہنومان گڑھی بنا ہوا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ راجہ رام چندر جی کے زمانہ
حکومت میں، ان کی فوج کے کمانڈر شری ہنومان جی، قلعہ کے اسی برج پر
رہتے تھے اور یہی برج قلعہ کا پھاٹک یا صدر دروازہ تھا۔[192] شہنشاہ اورنگ
زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے عہد حکومت میں، اس ٹیلہ پر زمانہ ماضیہ
بنی ہوئی ایک مسجد تھی جو ایک زمانہ بعد شکست ہو کر گر پڑی تھی۔ ۱۸۹۴ء
اس مسجد کی پچھمی دیوار باقی تھی، جس پر سنگ موسیٰ کا ایک پتھر لگا ہوا تھا اور جس پر
اللہ کھدا ہوا تھا۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ زمانہ ماضی میں یہ ٹیلہ
قبرستان تھا اور پاتی شاہ، جو ایک آزاد منش درویش تھے، ان کے چیلوں کا

۱۹۱۔ کتبہ کی عبارت کیا تھی؟ اس کے متعلق مذکورہ کتاب کے صفحہ ۴۳ پر کچھ نہیں لکھا ہے۔

۱۹۲۔ تاریخ اجودھیا (مولفہ منشی لچھمی نرائن صدر قانون گو۔ گونڈہ) صفحہ ۷۱

پر قبضہ تھا۔ نواب شجاع الدولہ مرحوم کے ابتدائی عہد حکومت تک اس ٹیلہ پر
پاتی شاہ کے چیلوں کا قبضہ برقرار تھا

راجہ ہمت بہادر، انوپ گیر گوشائیں، جو نواب شجاع الدولہ کے ملازم
ناگوں کے افسر اور نواب موصوف کے منظور نظر مصاحبین خاص سے تھے۔ نواب
صاحب کے مسندِ وزارت پر بیٹھنے کے چند ہی دنوں کے بعد انوپ گیر نے
اپنے ساتھی ناگوں کے ذریعہ ایک "نمایاں کام" انجام دیا تھا جس سے نواب وزیر
بہت زیادہ "محظوظ" ہوئے تھے۔[۱۹۳]

شاہ محمد یار کا قبرستان

زمانہ ماضی میں خواجہ ہٹی شاہ کے ٹیلہ کو (جسے اہل ہنود کھمیر ٹیلہ کہتے ہیں) کے
نیچے ایک مسجد اور شاہ محمد یار صاحب کا وسیع قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں بہت
سی قبروں، کے علاوہ شاہ محمد یار اور ان کے فرزند شاہ سعادت علی وغیرہ کی بھی قبریں
تھیں۔ شاہ محمد یار، نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں تھے۔ نواب موصوف
کی سرکار سے سولہ بیگھہ کی آراضی قبرستان کی غرض سے شاہ صاحب کو عطا ہوئی
تھی۔[۱۹۴]

اب شاہ محمد یار صاحب کا قبرستان ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی ایک قبر کا

۱۹۳۔ اس کتاب کا فٹ نوٹ نمبر ۱۸۱ دیکھئے۔ صفحہ ۲۴۶

۱۹۴۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء، صفحہ ۲۴۶۔

نشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اب اس قبرستان کی آراضی پر امرود، آموں اور بڑہل کے درختوں کا باغ لگا ہوا ہے۔

قبرستان سبحان

خواجہ ہٹی شاہ کے ٹیلہ کے نیچے جس مسجد کا ذکر اوپر، شاہ محمد یار کے قبرستان کے ذکر میں آچکا ہے، اسی مسجد کے پیچھے زمانۂ ماضی میں کسی سبحان شاہ نامی بزرگ کی قبر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ اہلِ جذب میں سے تھے۔ آپ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ البتہ سننے، سنانے والی روایات کا خزانہ ابتک موجود ہے۔

یہ جگہ اب کھیت اور پھلوں کے باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب شاہ سبحان صاحب کی قبر کا کہیں کوئی پتہ و نشان باقی نہیں رہ گیا ہے۔ آپ کے حالات بھی فراموشی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں۔

اب ہم خواجہ ہٹی شاہ کے ٹیلہ کے نیچے سے گذرنے والی سڑک سے جو اجودھیا ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اور جس کے ارد گرد امرود کے باغ اور کھیت ہیں، اس راستے پر چلتے ہیں۔ تھوڑی دور اس راستہ پر چلنے کے بعد سبحان کا احاطہ نامی محلہ میں آتے ہیں جو بششٹ کنڈ نامی مشہور علاقہ کے اندر واقع ہے۔ یہاں آکر گوکل بھون مندر کے پاس آکر رک جائیے۔ سامنے بائیں ہاتھ پر یعنی دکھن جانب کو ایک کچا راستہ گیا ہے جو آگے جاکر فیض آباد اجودھیا روڈ کے سامنے ختم ہو جاتا ہے۔

سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان

اس کچے راستہ پر تھوڑی دور دکھن جانب چلیئے۔ یعنی تقریباً سوا سو
دکھن کیطرف چلنے کے بعد، داہنے ہاتھ پر ایک ایسی قطعہ آراضی نظر آتی
جس پر چکوڑ، بیبیا نامی خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ عام راستہ سے
تقریباً بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر ایک قدرے اونچے چبوترہ پر، چند دوسری
قبروں کے ساتھ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب کا مزار ہے۔
مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباڑ کا انبار لگا ہوا ہے۔ یہ دیکھنے
والے کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب یہاں شاید ہی کبھی کوئی شخص
فاتحہ خوانی یا زیارت کے لیے آتا ہے کیونکہ اگر کچھ ہی افراد کی آمد و رفت اس جگہ
ہوتی تو یقیناً مزار تک پہنچنے کا چند قدم کا 'راستہ' ضرور کسی قدر 'صاف' ہوتا۔
کہتے ہیں کہ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب شاہانِ شرقیہ
کے دورِ حکومت میں شہر اودھ (اجودھیا) میں تشریف لائے تھے، اس وقت
اس شہر کی ولایت حضرت شاہ جلال کے سپرد تھی جنہیں اکثر لوگ سید بڈھی
بھی کہتے تھے۔ چنانچہ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب، حضرت
شاہ جلال عرف سید بڈھی کی اجازت سے ہی یہاں قیام فرمایا تھا۔ مراۃ الاسرار
وغیرہ میں آپ کا ذکر موجود ہے۔[۱۹۵]

۱۹۵۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۴۹۔

حضرت موسیٰ عاشقان نے کس سن میں انتقال فرمایا؟ اس کا یہاں
کو کوئی علم نہیں ہے البتہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا انتقال ۸ر صفر کو ہوا تھا۔
بنا بر زمانہ ماضی میں لوگ ہر سال آپ کا عرس ماہ صفر کی آٹھویں تاریخ کو کرتے
لیکن ادھر گذشتہ بیس پچیس سالوں سے عرس بند ہو چکا ہے۔

اب ہم مزار سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان سے، سامنے دکھن کی
چل کر، فیض آباد، اجودھیا روڈ پر آجاتے ہیں اور اسی جنرل سڑک سے فیض آبا
کی طرف چل کر موجودہ ٹیڑھی بازار کے چوراہا پر آتے ہیں۔

مزار عثمان شہید

ٹیڑھی بازار کے چوراہا سے اتر جانب محلہ کٹرہ کو جانے والی سڑک
تقریباً دو سو میٹر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ یعنی پچھم جانب ایک احاطہ کے اندر
عثمان شہید نامی شخص کا مزار ہے جو کھلے آسمان کے نیچے ہے۔ اس مزار
دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس مزار کی دیکھ بھال میں دلچ
لیتے ہیں کیونکہ مزار کی حالت اور اس کے اردگرد کی جگہ کی حالت بہت اچھ
صفائی وغیرہ کافی ہے۔

محمد عثمان شہید کے مزار کے احاطہ سے متصل محمد عارف صاحب
مکان ہے۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء کے حاشیہ نگار نے نہ جانے آپ کا
کیوں بھونڈے الفاظ میں کرتے ہوئے شہید موصوف کو نور باخوں کی اولاد
سے ہونا بتلاتے ہیں۔[196]

196۔ صفحہ ۵۱۔

محمد عثمان صاحب نے کس زمانہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا؟ اور کس جہاد میں یا کس کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے تھے، ان تمام باتوں کی کوئی معلومات نہ ہو سکی۔

اب پھر واپس ٹیڑھی بازار کے چوراہہ پر آئیے۔ یہاں سے تھوڑی دور اور آگے اتر کی طرف چلئے تو داہنے ہاتھ پر قضیانہ نامی محلہ ملے گا۔ یہ محلہ شاہ محمد یار کے قبرستان اور خواجہ ہٹی شاہ کے مزار کے دکھن جانب پڑتا ہے

مزار حضرت جلال شاہ

محلہ قضیانہ میں قاضی لطیف اللہ انصاری کی مسجد کے دروازہ کے سامنے، زمانہ سابق میں کچھ ایسے آثار و باقیات کے نشانات ملتے تھے جنکی بنا پر مولوی عبد الکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ اس جگہ پر کوئی وسیع و عریض خانقاہ رہی ہوگی لیکن اب اس جگہ پر مکانات بنے ہوئے ہیں اور کوئی ایسے آثار باقی نہیں ہیں جنکی بنیادوں پر آج اس جگہ پر کسی خانقاہ یا مدرسہ ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

شاہ جلال صاحب کے مزار کا نشان تک اب مٹ چکا ہے۔ اب اس جگہ پر لوگوں کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔

قاضی لطف اللہ انصاری کے متعلق مولوی عبد الکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ آپ حضرات اورنگ زیب (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ میں شہر اودھ میں تشریف لائے تھے[۱۹۰] اور صدر الصدور کے عہدہ پر تھے۔ حضرت سید السلطان

۱۹۰۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء صفحہ ۷۴۔

موسیٰ عاشقان صاحب نے آپ ہی کی اجازت سے شہر اودھ میں قیام فرمایا تھا لوگ آپ کو سید بڈھی یا سید بڈھے کے نام سے بھی پکارتے تھے۔

حضرت شاہ جلال صاحب کا ذکر مولف کو کسی کتاب میں نہیں مل سکا۔ اور باوجود تحقیق نہ تو آپ کا سلسلہ معلوم ہو سکا اور نہ وطن اور نہ شہر اودھ (اجودھیا) میں آمد وغیرہ کے متعلق ہی کچھ معلوم ہو سکا۔ صاحبِ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیار نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ جلال اودھی، حضرت محبوب الہی، نظام الدین اولیار، (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلیفہ تھے اور آپ کو لوگ "سید بڈھی" کہتے تھے۔[۱۹۸]

مقبرہ شاہ اویس صاحب

اسی محلہ قضیانہ میں سڑک کے پورب جانب شاہ اویس نامی کسی بزرگ کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ اجودھیا فیض آباد روڈ پر، فیض آباد سے اجودھیا آنے والی سڑک پر بائیں ہاتھ پر فرزند علی صاحب کے مکان کے پچھم، سڑک سے تقریباً پندرہ بیس میٹر اندر، پچھم جانب ایک احاطہ کے اندر واقع ہے۔ شاہ اویس صاحب کا یہ مقبرہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ اسکی صفائی وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے ہیں۔ فی الوقت اس احاطہ میں اتر جانب چند کمرے اور دالان بنا دیئے گئے ہیں جن میں بچوں کا ایک "اسلامیہ مکتب" چل رہا ہے۔ جس کا خرچ شاید اسی محلہ کے لوگ برداشت کرتے ہیں اور کچھ امداد زکوٰۃ، فطرہ وچرم قربانی سے بھی ہو جاتی ہے۔

۱۹۸۔ ایضاً۔

شاہ اویس صاحب سے منسوب بہت سی کرامات لوگ بیان کرتے ہیں
آپ کے متعلق بھی کوئی تفصیلی معلومات نہ حاصل ہو سکی، اور نہ آپ کا سلسلۂ بیعت
وغیرہ ہی معلوم ہو سکا۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے بھی آپ کے متعلق صرف
اتنا ہی تحریر فرمایا ہے کہ شاہ اویس صاحب کا شمار اودھ کے مشائخ کبار میں
ہوتا تھا۔ آپ نے شادی نہیں کیا تھا

مولوی صاحب مرحوم نے آپ کے بارے میں بالتفصیل و بالتصریح
کچھ نہیں لکھا ہے۔ صرف اتنا ہی لکھنا کافی نہیں تھا کہ آپ کا شمار اودھ کے
مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ کم از کم زمانہ یا عہد حکومت ہی آپ نے لکھ دیا ہوتا تو
ممکن ہے کہ آپ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کچھ آسانی ہوتی۔

مزار عاشق شاہ

اسی محلہ قضیانہ میں معماروں کے امام باڑہ کے چبوترہ کے نیچے کسی عاشق شاہ
نامی شخص کا مزار ہے۔ جو آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ مولف گم گشتہ حالات اجودھیا
نے لکھا ہے کہ انہوں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شاہ صاحب ذی استعداد
فاضل تھے اور اہلِ طریقت میں سے تھے اور لوگوں کو درس دیا کرتے تھے۔
آپ کے انتقال کی تاریخ کا مصرع یہ ہے:

آستانہ امام شد جایش
۵۱۷ + ۸۲ + ۳۰۴ + ۳۱۴ = ۱۲۱۷ھ

مصرعۂ تاریخ سے آپ کا سن وفات ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے، جو نواب آصف الدولہ کا عہدِ حکومت ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نواب آصف الدولہ کے عہدِ حکومت میں کسی جگہ سے شہرِ اودھ میں تشریف لائے ہوں اور یہیں پر انتقال فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی شخصیت دنیوی حیثیت سے بااثر رہی ہو اور مرنے کے بعد ایک عالی شان مقبرہ، دستور کے مطابق تعمیر کرایا گیا ہو۔ اور بعد کے آنے والے زمانہ میں دنیوی حیثیت بدل کر دینی حیثیت ہو گئی ہو (واللہ اعلم بالصواب)

بہر حال آپ کا ذکر نہ تو نوابین اودھ کے تعلق سے کسی کتاب میں مولف کی نگاہ سے گذرا اور نہ اجودھیا کے مشائخ کی کسی دستیاب کتاب میں ملا۔ اور نہ ہی کسی مستند روایت ہی سے آپ کے حالات۔ اور سلسلہ وغیرہ پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

مزار سیّد عالم صاحب محلہ قضیانہ سے متصل، ایک آبادی ہے جو کسی زمانہ میں 'مراٹی ٹولہ' کہلاتی تھی[۱۹۹]۔ اس زمانہ میں اِس محلہ میں درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے خادمان کے خاندان رہتے تھے۔ ان خادمان کی رہائش کی نسبت سے کچھ لوگ اس محلہ کو 'مجاور ٹولہ' بھی کہنے لگے تھے۔

اس مراٹی ٹولہ میں سید عالم صاحب کے مزار کا ذکر گم گشتہ حالات اجودھیا کے مولف نے کیا ہے لیکن مولف کتاب ہذا کو یہ مزار باوجود تلاش کے نہ مل سکا اور نہ سید عالم صاحب کے متعلق کوئی معلومات ہی حاصل ہو سکی۔

...ہید نورالدین

محلہ قضیانہ کے اتر جانب دریائے گھاگھرا کے کنارے
...نامی محلہ ہے۔ اب سے تقریباً ڈیڑھ۔دو سو برس پہلے یہاں ایک بلند ٹیلہ
...پر کسی نورالدین شہید صاحب کا مزار تھا۔ مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم
...ہے کہ زمانہ ماضی میں لوگ اِس ٹیلہ کو نورالدین شہید کا ٹیلہ کہتے تھے۔ ایک
...دریائے گھاگھرا، اس ٹیلہ کے نیچے آگیا تھا جس سے بہت سی قبریں برباد ہوگئی
...کی اینٹیں اور چونہ وغیرہ سب کچھ دریا میں بہہ گیا۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ
...کے آثار و باقیات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلہ پر کوئی عمارت یا مقبرہ رہا
...نکہ اس جگہ پر جو کنکر وغیرہ جس ڈھنگ یا طور سے پڑے ہیں، اُس سے اندازہ

...ہے کہ ان سے ٹیلہ پر جانے کا زینہ بنا رہا ہوگا۔

...گزشتہ حالات اجودھیا کے مولف نے لکھا ہے کہ انھوں نے بچشم خود ایک فرمان
...شاہ جہاں بادشاہ کا دیکھا ہے جو دھونتری گوسائیں کی اولادوں کے پاس تھا۔
...ان میں تیس بیگہ زمین گوسائیوں کو آباد ہونے کیلیے دی گئی تھی۔ فرمان مذکورہ میں
...کیلیے دی گئی اُس زمین کی شمالی حد میں "ٹیلہ نورالدین شہید" لکھا ہوا تھا۔
...مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے شہید نورالدین صاحب کا ایک واقعہ اسطرح

...۱۹۹۔ آج بھی کچھ لوگ اس محلہ کو 'مجاوری ٹولہ' کہتے ہیں کیونکہ اس محلہ میں درگاہ حضرت
...علیہ السلام کے خادمان کے خاندان کے لوگ آباد ہیں — مولف

...صفحہ ۵۲

لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں برسات کیوجہ سے آپ کی قبر کھل گئی تھی، اُس وقت لوگوں نے
کہ آپ کا سارا عضو صحیح و سلامت تھا۔ حتیٰ کہ دانت اپنی جگہ قائم تھے۔ لوگوں نے
سے قبر کو بند کر دیا۔

آپ کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۷۸۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفصیل بسلسلہ صفحہ ۲۵۶

متعلقہ بابری مسجد

پاک اِس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں ؟
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں

اگر شہر اودھ (اجودھیا) کے ذکر میں جامع مسجد بابری اور ہنومان گڑھی کا تذکرہ نظر انداز کر دیا جائے، تو اس شہر کی عظمت و تقدس اور اسکی تاریخ ساز حیثیت و اہمیت کا وہ گوشہ، جس کی ضوفشانیاں اس شہر کی تابندگی و پائندگی کا سبب رہی ہیں، یادوں کے دبیز کہرے میں چھپ جائیگا۔

امتدادِ زمانہ کے تاریخ ساز نشیب و فراز نے اتفاقات و حادثات اور حالات و واقعات کے ناموں پر جس تمدن کی بنیاد ڈالی تھی، اس نے نہ صرف تاریخ کو کچھ 'اجنبی موڑ' ہی دیئے بلکہ ایک ایسے تمدن کو جنم دیا جو قدیم آبائی مروجہ روایات کے خلاف ہونے کے باوجود معاشرہ میں امرا و خواص کے طبقہ کے لئے باعثِ افتخار رہا ہے۔

بابری مسجد اور ہنومان گڑھی کی عظمت و تقدیس، عقائد کے بموجب مسلم سہی، لیکن اِنھیں محض تاریخی مقامات سمجھنا انکی تاریخ ساز حیثیت و اہمیت کا مضحکہ اڑانا ہے۔ انھوں نے تاریخ میں کچھ نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ معاشرہ پر کچھ اپنے اثرات چھوڑے ہیں ہماری تہذیب و تمدن پر ان کے کچھ اَمِٹ نقوش مرتسم ہیں۔ اِنھوں نے ہماری صدیوں

کی سپاٹ تاریخ کو ایک شناسا رخ، بھی دیا ہے۔

اِن عمارات کا چپہ چپہ ہمارے کردار کی بلندی و پستی اور ہماری ناعاقبت اندیشی و کوتاہ بینی کے آغاز و انجام کے مضرات کا پرتو ہے۔ یہ ہماری غیرت و حمیت کی قربان گاہ ہے اور بھولی داد و دہش کی روایات کے کھو کھلے انصاف کا نمونہ بھی۔ یہ ہمارے اسلاف کی عزت و ناموس کی مدفن بھی ہیں اور انکی بے حسی و بے ادراکی کا شاہکار بھی۔ یہ ہماری وسیع المشربی و رواداری اور مذاہب کے احترام و آزادی کی زندۂ جاوید حقیقت ہیں یہ ہماری وسیع القلبی اور بالغ النظری کی لازوال مثالیں ہیں۔

یہ عمارات ہمارے اعمال و کردار اور ہمارے خلوص و ایثار کی ایسی کسوٹی ہیں جن پر ہمارے جذبۂ اخوت و تعصب، محبت و نفرت اور یگانگت و بیگانگت کو بآسانی پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ ان عمارات کی تعمیر قومی یک جہتی کے مضبوط گارے ہوئی تھی یہ اُس ہندوستانی کلچر کا لازوال شاہکار ہیں جس کی آبیاری شہر اودھ میں ہوئی تھی اور جو اودھ میں اس طرح پھولا پھلا کہ ابتک ہندوستان کو اس پر فخر و ناز ہے۔

آیئے ــــ آج اُس مفخر ہندوستانی کلچر کے آثار و قیات کی سیر کریں جو حوادثات زمانہ اور اُس کے نشیب و فراز سے تنگ آکر، موت سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

ہے تو گورستاں، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

قلعہ راجہ رام کوٹ کے ذکر میں ہم گذشتہ اوراق میں لکھ چکے ہیں کہ اس کوٹ میں
برج تھے۔ مغربی برج کے متعلق یہ روایت مشہور رہے کہ اس میں رام چندر جی کی پیدائش
تھی، اور بعد میں یہی جگہ سیتا جی کا باورچی خانہ بنی جس میں سیتا جی کھانا بنایا کرتی تھیں
برج میں رام چندر جی کی فوج کے کمانڈر ہنومان جی رہائش گاہ تھی۔ جنوبی برج کے
مشہور ہے کہ اس میں شاہی خزانہ رہتا تھا۔ البتہ شمالی برج کے متعلق کوئی روایت
ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ ہند، محمد ظہیر الدین بابر نے مغربی برج کو منہدم کروا کر ایک
شان مسجد تعمیر کر دیا جو صرف بلادِ ہند بلکہ بیرون ہند میں بھی جامع مسجد بابری یا
مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

بابری مسجد کے منبر پر جو کتبہ تاریخ کندہ ہے۔ اسکی عبارت یہ ہے

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش ⁂ بنایست با کاخِ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں محبطِ قدسیاں را ⁂ امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی چو سالِ بنائش ⁂ عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی
۹۲۸ھ ۱۱۳۴۸۱۴۱۲
=۹۲۵ھ

سبب تعمیر جامع مسجد بابری گم گشتہ حالات اجودھیا میں مولوی سید عبد الغفار
نے لکھا ہے کہ بابر اپنے بچپن کے ایام میں خفیہ

طور پر اور فقیرانہ لباس، کابل سے ہندوستان آیا تھا! اُس زمانہ میں ہندوستان پر سلطان سکندر لودی حکمراں تھا۔ اور شہر اودھ (اجودھیا)، اس وقت ایک صدر مقام تھا۔ بابر نے شہر اودھ میں آکر شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان کی خدمت میں حاضر ہوکر، ہندوستان پر فتح یاب ہونے کیلئے باطنی امداد طلب کیا تھا۔ تاکہ اِن بزرگوں کی دعا سے ہندوستان کی حکومت اُسے حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن بزرگوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ہندوستان فتح کر لینے کے بعد، بابر نے بطور یادگار فتح، شہر اودھ (اجودھیا)، میں ایک عالیشان مسجد، میر باقی کی نگرانی میں تعمیر کروادیا، جو اب تک اپنی شاہانہ عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔ اور بابری مسجد کے نام سے بلادِ ہند و بیرون ہند میں مشہور ہے

ایک دوسری روایت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بابر بادشاہ نے ابتدائی زمانہ شباب میں کابل سے فقیروں کے بھیس میں شہر اودھ میں آیا تھا۔ یہ زمانہ سلطان سکندر لودی کا تھا۔ شہر اودھ میں آنے کے بعد بابر بادشاہ نے حضرت شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوکر باطنی امداد طلب کیا تھا کہ ہندوستان کی سلطنت اس کے ہاتھ آجائے[۲۰۲]

مولوی سید عبد الغفار نے لکھا ہے کہ اِن بزرگوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہماری دعا

---

[۲۰۱] صفحہ ۴۰،

۲۰۲۔ شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر کا ایام شہزادگی میں، کابل سے بھیس بدلکر شہر اودھ میں آنے نہ تو تذکِ بابری میں ملتا ہے نہ گلبدن بیگم مرحومہ کے ہمایوں نامہ میں اور نہ کسی مستند و غیر مستند تاریخی کتاب میں کوئی اشارہ ملتا ہے۔ یہ روایت محض "زیب داستان"، کیلئے مولوی عبد الغفار نے اپنے علمی تبحر کا رتاریخ سے ناواقف عوام پر، رُعب ڈالنے کے لئے "گڑھ دیا ہے۔ حقائق سے اِس کا کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ مولف

قبولیت اس نیت پر ہے کہ اگر تم "مندر جنم استھان وزسوئی گھر سیتا" پر مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کرو تو ہم تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں[۲۰۳]۔ بابر نے صدق دل سے نیت کیا اور وعدہ کیا کہ اگر ہندوستان کی حکومت اس کے ہاتھ آجائیگی تو وہ متذکرہ بالا مقام پر مسجد تعمیر کرائے گا۔ چنانچہ دونوں بزرگوں اور حاضرین نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھایا۔ کچھ دیر بابر ان بزرگوں کی خدمت میں رہا، پھر واپس کابل چلا گیا[۲۰۴]۔

کچھ دنوں بعد بابر بادشاہ نے جدید آلات حرب سے آراستہ وپیراستہ، تھوڑی سی مغل فوج لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اور پانی پت کے مشہور میدان میں سلطان سکندر لودی اور بابر بادشاہ کی فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی، جس کی تفصیل تمام تاریخ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اس لڑائی میں سلطان سکندر لودی کو شکست فاش ہوئی اور بابر ہندوستان کی سلطنت پر قابض ہوگیا۔

---

[۲۰۳] یہ مولوی عبدالغفار کا "من گھڑت" قصہ ہے۔ اور داستان سرائی ہے، جس سے آپ نے شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان کی ایک کرامت اور محبوب بارگاہ خداوندی ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ مولانا صاحب شاید یہ بھول گئے کہ کوئی بھی بزرگ دین شریعت مطہرہ کی ادنیٰ سی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر حضرت شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان جیسے بزرگوں میں یہ جرأت کہاں سے آگئی کہ انھوں نے ایک پرانے بتکدے کو مسمار کرنے کا وعدہ لیا؟ اسلام تو پرانے بتکدوں کو ویران ومسمار کرنے سے منع کرتا ہے" اور یہ حضرات جنھیں بزرگ دین کہا جاتا ہے۔ مسمار کرنے کی شرط واجب کرتے ہیں۔

کسی بزرگ دین یا ولی اللہ کی طرف یہ منسوب کرنا کہ وہ پرانے بتکدوں کو ویران ومسمار کرنے کیلئے بضد تھے قطعی غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔ ان عظیم المرتبہ بزرگوں پر سید عبدالغفار نے جھوٹی تہمت لگا کر عام جذباتی مسلمانوں میں اپنی مقبولیت بڑھانے کی مکروہ کوشش کیا ہے اور ہندو مسلم منافرت کا ایسا بیج بودیا ہے جسکا پودا شاید ایک زمانہ دراز تک خشک نہ ہوسکے گا۔ مولف

[۲۰۴] گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۴

اِس فتحِ عظیم کے موقع پر پوربی زبان میں کسی شاعر نے فتحِ بابر کی تاریخ ایک چ
یں اس طرح بیان کیا ہے :

نوّے اوپر تھا تیّسا ⁛ پانی پت بھارت دیسا
بارہواں رجب بار شکروار ⁛ بابر جیت ، برآہم ہارا

نوٹ :- بابری مسجد ۱۹۴۹ء میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ
۱۴۵ کے تحت قرق ہو گئی - ۲۲ ، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹
کی درمیانی شب میں ڈیوٹی پر موجود پولس پار
کی موجودگی دکسی طرح شر پسندوں کے ذریعہ بت
رکھ دیا گیا ہے . اور دن رات پولس پارٹی کا پہ
لگا ہوا ہے .

(ہفت روزہ نئی دنیا . دہلی شمارہ ۱۱ جلد ۹ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۸۱

رام چندر جی کے قلعہ ' رام کوٹ ' کے مشرقی برج کے متعلق . جو قلعہ کا صدر
دروازہ تھا . یہ روایت مشہور ہے کہ اِس میں رام چندر جی کی افواج کے کمانڈر ہنومان
رہتے تھے - اِس برج پر زمانہ ماضیہ کی ایک مسجد تھی جس کی پچھمی دیوار ۱۸۹۴ء تک
باقی تھی . نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت میں اِس جگہ ایک کوٹھری بنا کر ، آثار کے

ٹھور پر، جس میں ہنومان جی کی مورتی رکھی گئی۔ جو آنے والے بعد کے زمانہ میں تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے، آج ایک عظیم الشان مندر کی شکل میں، ہنومان گڑھی کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ روزانہ ہزاروں عقیدت مند یہاں آکر درشن کرتے ہیں اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہنومان گڑھی کی تعمیر کا حال

راجہ ہمت بہادر انوپ گیر اور اس کے بھائی امراؤ گیر، جو لازم ناگوں کے افسر تھے۔ انھوں نے نواب شجاع الدولہ کے لیے جو "کارہائے نمایاں" انجام دیئے تھے، اس سے نواب وزیر اِن لوگوں کے بہت زیادہ ممنون احسان تھے۔ اور ہمیشہ اِن کی دلجوئی اور خاطر کو مقدم سمجھتے تھے۔ چنانچہ اِن دونوں بھائیوں کی سفارش سے گوسائیوں نے مشرقی برج پر ایک کوٹھری کی جگہ حاصل کیا۔ جب کوٹھری کی جگہ مل گئی تو ایک کوٹھری ڈگر، بنا کر اس میں ہنومان جی کی مورتی رکھدیا ہے۔[۲]

۱۰۵۔ تاریخ اجودھیا (صفحہ ۱۰) میں منشی لچھمی نرائن، صدر قانون گو صاحب اودھ دور کی کوڑی لائے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نواب صفدر جنگ کے دورِ حکومت میں ابھئے رام نام کا ایک ہندو فقیر اس جگہ پر رہتا تھا۔ اتفاقاً نواب موصوف سخت بیمار ہوئے تو آبھئے رام سے رجوع کیا۔ اس نے دعا کیا اسکی دعا کی برکت سے نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کو صحت ہوئی اور وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ ابھئے رام نے ہنومان جی کے مندر بنانے کی صفدر جنگ سے، اجازت مانگی اور ہنومان جی کا مندر بنوایا۔ جو اس وقت "ہنومان گڑھی" کے نام سے مشہور ہے۔ کاش منشی جی یہ لغو اور لچر" واقعہ" تحریر کرنے سے پہلے اودھ کی کسی تاریخ کی کتاب کو ایک نگاہ دیکھ لیتے۔ مولف

ایک عرصہ تک اِس 'کوٹھری نما' مندر پر اجودھیا کے گوشائیوں کا قبضہ رہا۔[۲۰۶] اس کے بعد اس 'کوٹھری' پر ناگوں نے قبضہ کرلیا۔

صاحب گم گشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ اِس کوٹھری یا مندر پر قبضہ کرنے کے لئے ناگوں اور گوشائیوں میں زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں بہت سے ناگے اور گوسائیں کام آئے تھے۔ اِس جنگ میں گوشائیں کو شکست ہوئی اور ناگے اس مندر پر قابض ہوگئے۔

اس مندر پر قبضہ کرنے کے بعد، ناگوں نے رفتہ رفتہ عمارتیں بنوانا شروع کیا۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے اپنی یادداشتوں کے سہارے لکھا ہے کہ جہاں تک انھیں یاد پڑتا ہے، پہلے اس ٹیلہ پر اتر کی طرف دو برج بنائے گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد دکھن جانب بھی دو برج بنائے گئے تھے۔ جب چاروں برج بن کر تیار ہوگئے تو پھر تھوڑے عرصہ کے بعد ان چاروں برجوں کو ملاکر ایک بڑا احاطہ کھینچ دیا گیا۔

زمانہ قدیم میں یہ ٹیلے سُگریو ٹیلہ، ہنومان ٹیلہ، کھمیر ٹیلہ اور کوبیر ٹیلہ کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن برج اور احاطہ بن جانے کے بعد اس کا نام ہنومان گڑھی پڑگیا۔ اُس زمانہ میں بھی، اس ٹیلہ پر بنی ہوئی زمانہ قدیم کی اس پرانی مسجد کی پچھمی دیوار باقی تھی جسکے طاق میں سنگ موسیٰ پر لفظ اللہ کھدا ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد نہ صرف اس طاق کے سیاہ پتھر ہی کو نابید کردیا گیا بلکہ مسجد کی باقی ماندہ دیوار کو اندر کرکے، اس کے

۲۰۶۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۴۴

...ٹھری ایک اور دیوار چسپاں کر کے بنادی گئی تھی۔۷۰

مسجد مذکور کی متذکرہ دیوار سے پچھم کیطرف، چند قدم کے فاصلہ پر ہنومان جی
...وہ مندر تھا جس کی زمین راجہ ہمت بہادر، انوپ گیر اور امراؤ گیر کی سفارش سے
...ب شجاع الدولہ نے گوشائیوں کو عطا فرمایا تھا۔ اِس مسجد کی بازیابی کیلئے اودھ کے
...ری تاجدار نواب واجد علی شاہ بادشاہ کے عہدِ حکومت میں غلام حسین شاہ نے نشان محمدی
...ر کیا تھا، اور معرکہ جہاد ہوا تھا۔

جو لوگ انسانی فطرت کے رمز شناس ہیں، اِس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہیں کہ
...قوں کی ذہنی و اخلاق اصلاح کے سلسلہ میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب قلب و
...ح کو خطاب کرنے سے پہلے جسم و جان کو خطاب کرنا پڑتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل (FACTORS) انسان کے اخلاق و تمدن پر
...نداز ہوتے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ قوی اور موثر عامل حکومت ہے۔ حکومت
...نظام اگر غلط ہو، اور اسکی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو
...لاح اور خدمت الناس کے بجائے فساد اور خدمت نفس کیلئے استعمال کرتے ہوں
...یسی حالت میں کسی نیکی کا سرسبز ہونا، کسی اصلاحی کوشش کا بار آور ہونا، اور کسی قسم
...ے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھولنا مشکل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت
...ی سرپرست ہوتی ہے اور نہ صرف خود بدکار ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت تمام اخلاق
...فاسد کی آبیاری کرتی ہے۔

۷۰۔ گم گشتہ حالات اجودھیا صفحہ ۴۴

عملی، اخلاق، جس کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا ہے، کیلئے لازم ہو
کہ جب اعمال حکومت کی شرارت و بد باطنی اُس حد سے گذر چکی ہو کہ اسے
تیقن سے راہِ راست پر لایا جا سکے، اور جب اس کو دوسروں پر دست درازی کر
سے، دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے، دوسروں کی عزت و شرافت پر حملے
سے، اور دوسروں کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی پر تاخت کرنے سے
رکھنے کی کوئی صورت جنگ کے سوا باقی ہی نہ رہے، تو پھر ہر سچے بھی خواہ انسا
کا (دین) فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔ انھیں ناگزیر حالات
تحت غلام حسین شاہ اور مولوی امیر علی صاحبان نے واجد علی شاہ بادشاہ کے عہد
میں منظم جدوجہد (جہاد) کا علم بلند کیا۔ جس میں سیکڑوں مسلمانوں نے جام شہا
نوش کیا۔

جو لوگ اسلام میں شہادت کے عظیم کردار سے واقف ہیں وہ اس با
کو آسانی سے سمجھتے ہیں کہ وہ جذبہ جس کے تحت انسان موت کو گلے لگانے کو
تیار ہو جاتا ہے، قاتل کے ارادوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ کا پہلا معرکہ جہاد

واجد علی شاہ بادشاہ اود
کے عہدِ حکومت میں پہلا معر
غلام حسین شاہ سے ہوا تھا۔ اسکی تفصیل مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے تار
پارینہ مدینۃ الاولیاء میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:۔

— چنانچہ اس مسجد کے واسطے غلام حسین شاہ نے واجد علیشاہ
بادشاہ اودھ کے زمانہ میں "نشان محمدی" کھڑا کیا۔ پہلے پہل

مولوی محمد صالح صاحب و حافظ لقمان صاحب سندھی کہ نہایت
ذی استعداد اور اہل تقویٰ سے تھے مع قاضی نور الدین صاحب
جوار جونپور و فقیر اللہ دریابادی و عبدالقادر طالب علم. و حاجی مدار بخش
و جہانگیر بخش ساکنان موٗ ناتھ وغیرہ، علاقہ اعظم گڈھ و رستم علی خاں
و احمد علی خاں برادران عیسیٰ خاں خلف حسین علی خاں سالدار
مشہور دکھنی ساکنان محلہ حیدر آباد، لکھنؤ۔ ۱۰ شوال ۱۲۷۱ ہجری
(مطابق ۲ جولائی ۱۸۵۵ء بروز دوشنبہ ــــ مولف) مع سترہ اشخاص
کے اودھ میں بھیجے گئے۔ چنانچہ یہ لوگ اُس مسجد بابری میں جس کا
ذکر اوپر ہو چکا ہے، ٹھہرے۔ کیفیت اِس حال کی حدیقۃ الشہدا
میں من و عن مندرج ہے۔ اس کے بعد خود غلام حسین شاہ، رستم علی
خاں صاحب موصوف کے ساتھ ان لوگوں کو مسجد میں بٹھلا کر
درویش مذکور کے پاس گئے اور ۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۱ ہجری (مطابق
۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء ــــ مولف) یوم پنجشنبہ کو مسجد موصوفہ میں مع
اپنے ہمراہیوں کے پہنچے اور بارہویں تاریخ (۲۷ جولائی ۱۸۵۵ء)
بروز جمعہ بہادر خاں صاحب جو اپنے صاحبزادوں کے ساتھ نصیر آباد
میں، وہاں کے مولوی صاحبان کے پاس اسی مہم کی شرکت کیلئے
گئے تھے، واپس آ گئے اور غلام حسین شاہ کے شریک ہوئے
تقریباً بارہ طالب علم وغیرہ بستی کے علاقہ سے جمعہ کے دن مسجد
میں داخل ہوئے۔ تیرہویں تاریخ ذیقعدہ (مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۵۵ء)

کو سنیچر کے دن جب حکام کیطرف سے بہت قتل و قتال ہو چکی تو
دوپہر سے جنگ شروع ہو گئی۔ اور اسی درمیان بارش ہونے
پر جنگ موقوف ہو گئی۔ حکام کیطرف سے شام کو گارد مسجد کے
دروازہ پر پہنچا اور اوس نے طرفین کو جنگ کرنے سے ممانعت
کی اس وقت فقط چھ آدمیوں نے مع رستم علی خاں اور شیخ الگو
نور باف باشندہ مقبرہ جنکے ساتھ انکی قوم کے دس، بارہ آدمی اور
شریک تھے، شربت شہادت چکھا۔ جن کو بندوق کی گولی وغیرہ
کا صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے بعد شام کو نماز مغرب کے قریب شہر
کے باشندے جو شریک تھے، ممانعت جنگ کا حکم پاکر اپنے اپنے
مکان کو چلے گئے۔ صرف مسافرین اور شیخ الگو اور حسین علی خاں
صاحب وغیرہ جو بھر ار بلٹن کے ملازمین سے تھے مسجد کے اندر
باقی رہے۔

یکایک بیراگیوں نے دیہاتیوں کی مدد سے جنکو تعلقداران
نے بھیجا تھا، یورش کر کے مسجد کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔
اس جماعت میں سے فقط غلام حسین شاہ تھے جو مسجد کی دیوار
کود کر باہر نکل گئے۔ اس کے بعد، جن لوگوں کا نام اوپر درج ہے
انھوں نے جنگ کی اور صد ہا اشخاص کو تہ تیغ کر کے شربت
شہادت پیا۔ علی الصباح کوتوال وغیرہ اور اہل شہر حاضر ہوئے
اور مسجد کے دروازہ پر گنج شہدار کے مع مولوی محمد صالح کی

نعش کے مدفون کیا۔ صرف رستم علی خاں اور احمد علی خاں صاحب کی دو قبریں احاطے سے علحدہ بنائی گئیں۔ جملہ انہتر [۶۹] اشخاص شہید ہوئے[۲۰۹] ان اشخاص میں شہر اودھ کے شجاعان میں سے مرزا افضل بیگ اور شیخ اتواری صاحب شہر اودھ کے بھی تھے جنھوں نے معرکہ کے وقت لکڑی لے کر مسلمانوں کیطرف سے شرکت کی اور شربت شہادت پیا۔[۲۱۰]

منشی رام سہائے تمنا[۲۱۱] نے جو شاہی ملازمت سے وابستہ تھے، اپنی کتاب "افضل التواریخ" میں غلام حسین شاہ کے جہاد کی تفصیل اس طرح قلمبند کی ہے:-

غلام حسین نامی فقیر جو ایک مدت سے مثل دیگر فقرا ار بظلِ عنایت۔ مہنتان ہنومان گڑھی، واقع اجودھیا جی، آسودہ حال تھا، منحرف ہوا۔ اور فتنہ انگیزی شروع کیا۔ یہ امر ظاہر کیا کہ اس

۲۰۸- مولوی فدا حسین نے "احوال و واقعات" میں یہ تعداد ایک سو پینسٹھ [۱۶۵] ایک سو ستر کے درمیان لکھا ہے — مولف

۲۰۹- منشی رام سہائے تمنا نے اپنی کتاب "افضل التواریخ" میں لکھا ہے کہ اس ہنگامہ میں حسین شاہ کے ایک سو تیس ہمراہی قتل ہوئے تھے۔ اور مولوی نجم الغنی خاں نے تاریخ اودھ جلد چہارم میں یہ تعداد دو سو انہتر [۲۶۹] بتلایا ہے — مولف

۲۱۰- صفحات ۴۴ و ۴۵

۲۱۱- منشی رام سہائے تمنا، منشی پورن چند ذرہ لکھنوی (ابن منشی لالہ ایشوری پرشاد

معبد شترگ[۲] لکھنو میں ایک مسجد اسلام بعہد سلطان عالمگیر شاہ دہلی
تعمیر ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے حکومت راجہ درشن سنگھ ناظم میں منہدم

شعاعی ابن منشی اودے راج مطبع لکھنوی) مالک مطبع تمنائی رئیس آبائی ساکن محلہ نوبستہ کے
بڑے لڑکے تھے۔ منجھلے بھائی منشی لالہ ماتا پرشاد نیساں، متوفی ۱۹۳۰ء اور چھوٹے بھائی منشی
لالہ دوارکا پرشاد افق متوفی ۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء ــــ تذکرہ محاصرین از مالک رام صفحہ ۲۰۸) محلہ
نوبستہ کے سکسینہ کایستھوں کے اس خانوادے میں جسمیں ریاست اور علم دونوں جمع تھے،
۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے (اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ ــــ مصنف گنپت سہائے
سریواستو باصفحہ ۴۰۹)۔ دس سال کی عمر میں آٹھ سالہ کشن پیاری سے شادی ہوئی۔ سولہ سال
کی عمر میں انسپکٹر سررشتہ تعلیم اودھ کے دفتر میں کلرک ہوئے۔ اسی دفتر سے انھیں وہ "انگریز
بھگتی" ملی جس نے اودھ کی تاریخ کو "انگریز پسند" بنادیا۔

منشی رام سہائے تمنا ایک زود نویس نثار، شاعر اور صحافی تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جبکہ انکی عمر
صرف تینتیس ۳۳ سال تھی بیالیس ۴۲ شعری اور نثری تخلیقات کر چکے تھے (اعلام افکار صفحہ ۵۲) ۱۸۵۷ء
کے غدر کے بعد انکے وسائل تباہی کے شکار ہو گئے تھے پوری کنبہ کا بوجھ منشی تمنا کی کمائی پر آپڑا تھا
(انتخاب کلام تمنا مصنفہ ڈاکٹر گوری سہائے صفحہ ۵) اسلئے اہل نعم اور اہل اقتدار کیطرف جھکنے اور وابستہ ہونیکیلئے
مجبور ہو گئے تھے انکی نگاہ میں علمی روایت سے زیادہ ریاست آبائی کی اہمیت اور وقعت تھی۔
اپنے محکمہ میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں
ضلع اناؤ میں تعینات تھے۔ اور وہیں سے مئی ۱۹۱۰ء میں پنشن لیا۔ اور ۱۹۳۲ء میں اٹھہتر
سال کی عمر میں اس دار فانی سے منہ موڑا ــــ مولف

۲۱۲۔ شترگن بمعنی بڑا۔

کی۔ پھر نو احداث ہونا چاہیے۔ قریب دو ہزار کس مجتمع ہوئے۔ نفرائے ہنود نے بھی واسطے حفظ کے ٹھاکران راجکمار کو مقیم گڑھی کیا۔

غرضیکہ سیز دہم ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ باجمعیت موجودہ وقت شام گڑھی پر حملہ آور ہوئے اور نوبت جنگ و جدال پہنچی۔ کچھ دیر تو بدولت شجاعت و تہوّر افغانان ملیح آباد سے مقابلہ و مجادلہ رہا جب آب شمشیر کے گھاٹ اترنے کر قتل ہوئے اور باقی ماندگان نے مسجد جنم استھان میں پناہ لی۔ ایک پہر کامل نوبت زد و ضرب رہی۔ فریقین سے جانیں گئیں۔ غلام حسین شاہ فرار ہوا۔ اور ایک صد و سی تن ہمراہیان غلام حسین مقتول ہوئے ۲۱۵

اودھ سے متعلق "اودھ کی مشہور تاریخی کتاب "تاریخ اودھ" میں حکیم مولوی ...ی خاں رام پوری ۲۱۶ غلام حسین شاہ کے معرکہ جہاد کو ان الفاظ میں

۲۱۵۔ افضل التواریخ در مطبع تمنائی۔ لکھنؤ۔ سن اشاعت ۱۸۷۹ء

۲۱۶۔ نام نجم الغنی خاں۔ تاریخی نام "محمد نجم الغنی" ہے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۷۶ ہجری (مطابق ۱۸۵۹ء بروز جمعہ — مؤلف) کو شہر رام پور (یو۔پی) کے محلہ مدرسہ کہنہ میں پیدا ہوئے ...مولوی عبد الغنی تھا۔ سلسلہ نسب حاجی محمد سعید خاں محدّث سے ملتا ہے۔ جو حضرت ...شاہ صاحب محدّث دہلوی کے شاگرد تھے۔

...۱۸۸ء میں مدرسہ عالیہ رام پور سے درجہ اعلیٰ کے امتحان کامیاب ہوئے۔ حکیم محمد اعظم ...کا علم حاصل کیا۔ ۱۹۲۴ء تک مختلف جگہوں پر ملازم رہے۔ آخری عمر میں یعنی ...ار ...رضا لائبریری کے مہتمم کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور چند ماہ بعد یکم جولائی

بیان کیا ہے جو۲۱۵

اگلے زمانہ میں، اجودھیا کی بلندی پر جس کا نام ہنود نے ہنومانگڑھی رکھا ہے۔ ایک مسجد شاہانِ ماضیہ کی بنائی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان فقیر اسکی جاروب کشی کرتا تھا۔ اور اس مسجد کے پہلو میں ایک چبوترہ تھا۔ اوس پر عشرہ محرم میں تعزیہ رکھتا تھا۔ بعد ایک مدت ایک ہندو فقیر بھی املی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑ کر رہا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری بنائی اوس میں بت رکھ کر ہنومان کا مقام قرار دیا۔ برہان الملک کے عہد میں بعض ہندوؤں نے مسجد کو جو اوس بلندی پر اسکو گرا دیا فوج سرکار پہنچی، ان کو سزا دیکر، بتخانے کو توڑ کر، بدستور مسجد بنادی ایک عرصہ گذرنے کے بعد بیراگیوں نے پھر بتخانہ بنایا۔ مسجد کے کچھ

۱۹۲۲ء مطابق ۲۵ صفر ۱۳۵۱ ہجری قدسی بروز جمعرات انتقال کیا۔ مولف

نوٹ:۔ مولوی نجم الغنی صاحب کے انتقال کے بعد، ناظم کتب خانہ کی حیثیت۔ امتیاز علی عرشی مرحوم کا تقرر ہوا تھا۔

۲۱۵ - تاریخ اودھ جلد چہارم صفحات ۹۰ تا ۹۸، مرتبہ مولانا حکیم محمد نجم الغنی خانصاحب رامپوری سال طباعت اپریل ۱۹۱۲ء مطبوعہ نامی مطبع مطلع العلوم مراد آباد میں ایس۔ ابن علی پروپرائیٹر نے چھاپا اور شا

معترض نہ ہوئے۔ جب علاقہ بچھم راٹھ وغیرہ کی حکومت راجہ درشن سنگھ کے حوالہ ہوئی، اوس علاقہ کے ہندوؤں کی قوت زیادہ ہو گئی۔ اوس مسجد کو گرا کر مکان گڑھی میں ملا لیا۔ اور مسجد واقع راہ گھاٹ دریا کو خراب کر کے اوسکی صحن میں اپنے مسکن بنائے۔ اور مسجد کے اندر کوڑا ڈالے مسلمانوں کی سیکڑوں قبریں توڑ کر اینٹوں اور پتھروں سے بڑی شان و شوکت کے تہخانے بنائے۔ یہاں تک کہ مسجدیں پست اور تہخانے بلند ہو گئے۔ غلام حسین شاہ حرارت حمیت اسلامی سے کئی شخص ہمراہ لیکر بعنوان گڑھی میں مسجد بنانے کیلئے روناہی تک پہنچا مرزا اعلیٰ علی منصرم بچھم راٹھ سرراہ ہوا۔ وہیں سے اوسے پھیر دیا اور اوسکے دو چار ہمراہیوں کو جو فیض آباد سے پہنچے تھے نائب کوتوال اور کپتان الکزنڈر آر بیٹر کی رنے باہر نکال دیا جب یہ ماجرا پرچہ اخبار کے ذریعہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا، آغا علیخاں ناظم اور مرزا منعم بیگ کوتوال کے نام مسجد کی تحقیقات کا حکم ہوا پھر غلام حسین شاہ لکھنؤ سے کچھ لوگ اپنے ساتھ لیکر وہاں پہنچا اور جامع مسجد میں جو سیتا کی رسوئی میں ہے، مقیم ہوا۔ اور کسی کے کہنے سے وہاں سے نہ نکلا اوس کے پاس جماعت کم تھی اور کچھ سامان بھی نہ تھا۔ مگر کمر ہمت بیراگیوں کے ہاتھ سے نکالنے کی باندھی۔ کپتان آر صاحب اور مرزا منعم بیگ کوتوال اور مرزا اعلیٰ علی نے مسلمانوں کو اوسکی شرکت سے روکا

بیراگیوں کی مدد کو راجہ مان سنگھ اور گرد و پیش کے زمیندار جوق در جوق پہنچ گئے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار ہندو جمع ہو گئے اور دریا کا گھاٹ بند کر دیا۔

غلام حسین کے پاس سوائے چند غربا کے اور کوئی نہ تھا۔ جمعہ کے دن ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۱ ہجری (مطابق ۲۷ جولائی ۱۸۵۵ء ۔ مولف) کو تقریباً دو سو مسلمان نماز کے واسطے مسجد میں جمع ہوئے۔ بیراگی ان کا مجمع سنکر بلوہ کر کے انکے سر پر پہنچے۔ غلام حسین کے ہمراہیوں نے نکلنے کا قصد کیا۔ کوتوال کے سپاہی اور آر صاحب کے سوار جو رفعِ شر پر متعین تھے، درمیان میں آئے اور فساد کرنے سے روکا آر صاحب بھی بلوہ کی خبر سنکر وہاں پہنچے۔ رفع شر کر دیا۔ لیکن اس ہنگامہ کی وجہ سے مسلمان جمعہ کی نماز نہ ادا کر سکے۔ دوسرے دن شنبے کو جان ہرسی صاحب کپتان آر صاحب کی شرکت کے واسطے لکھنؤ سے پہنچے۔ اور مسجد کو آکر دیکھا۔ اوس میں دروازہ نہ تھا۔ کہا یہاں کا دروازہ لگانا مناسب ہے جس سے حفاظت ہو جائے اور غلام حسین کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو سمجھانے کیلئے بلایا۔ اس عرصے میں غلام حسین کے ساتھیوں میں سے دو تین آدمی محلہ بیگم پورہ میں جاکر کواڑ کی جوڑی اوٹھا لائے۔ راہ میں ہنومانگڑھی کے ہندوؤں نے اون کو گولیوں سے زخمی کر دیا۔ مسلمانوں نے کواڑ چھوڑ کر ہندوؤں پر حملہ کر کے پسپا کر دیا۔ اس عرصہ میں مینہ برسنے لگا

ایک گھڑی تک ہنگامہ فساد موقوف رہا۔ اسوقت ایک کٹیریا غلام حسین کے ہمراہیوں کے لئے۔ جو دو دن سے بھوکے تھے، کھانا لایا۔ کپتان آر صاحب اور جان ہرسی نے اپنے سپاہیوں کو مسلمانوں کے پاس بھیجکر کہلایا کہ کمریں کھول کر بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو۔ باہر نہ نکلو۔ کوئی تم سے فساد نہ کر سکے گا۔ وہ کمریں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ اب مرزا اسمٰعیل علی اور دونوں انگریز اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ کے وہاں سے ہٹ کر دور ایک کھرنی کے تلے کھڑے ہوئے۔ ایک گھڑی نہ گذری تھی کہ ہزاروں بیراگی نعرہ مارتے ہوئے آئے اور مسجد کو گھیر لیا رجب علیشاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں سا[؟] شروع کر دیں۔ اور مسجد میں آکر دو سو انہتر[۲۶۹]، آدمیوں کو ذبح کیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور مسجد میں لہو بہنے لگا۔ اکثر مسلمانوں کے گلوں میں قرآن شریف حمائل تھے۔ انکو پھاڑ پھاڑ کر کے پاؤں سے روندا اور جلایا۔ اور جو جنگلہ سرکاری حکم سے جامع مسجد کے چبوترے پر تیار ہوا تھا توڑ ڈالا۔ اور مسجد کی دیوار کو جزائروں سے چھلنی کر دیا[۱۴۱]۔ مقتولین کی لاشیں بے گور و کفن پڑی رہ گئیں۔

---

[۱۴۱]۔ جزائر ولایتی بندوق کو کہتے تھے کیونکہ وہ جزائر انگلستان سے آتی تھی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "سفرنامہ انند رام مخلص" مطبوعہ ہندوستانی پریس۔ رامپور (یو۔ پی)

دوسرے دن مرزا نثار حسین نے درِ مسجد پر ایک بڑا غار کھدوا کر گل در گل دفن کرادیا۔ دفن کے بعد بیراگی مسجد میں جوتیاں پہنے آئے ہوم (ہون ـــ مولف) کیا سنکھ بجایا۔ بہت بے ادبیاں کیں۔ اس کے قریب شہدائے سید سالار میں سے خواجہ میٹھے کی قبر تھی، اسے توڑ ڈالا۔ بیراگیوں کی جمعیت زیادہ نہ تھی لیکن راجہ مان سنگھ اور پانڈے راجہ کرشن دت رام کے سیکڑوں ہندو نوکر اور گرد و پیش کے ہندو زمیندار مدد کو پہنچے تھے۔ اس لیے دس۔ بارہ ہزار کی کثرت ہو گئی تھی۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیگم پورہ کے رہنے والوں پر جو غلام حسین کے رشتہ دار تھے۔ بیراگیوں اور "گوہار" کے لوگوں نے جاکر حملہ کیا۔ ان بیچاروں نے جس طرح ہو سکا حفظ ناموس کیا۔ آخر کار مجبور ہو کر گھروں میں اسباب چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔"

مرزا رجب علی بیگ سرور[۲۸۷] جو شاہانِ اودھ کے پرانے نمک خوار اور ملاز

۲۸۷۔ رجب علی نام۔ سرور تخلص۔ مرزا اصغر بیگ کے لڑکے تھے۔ غالباً ۱۲۰۲ ہجری (مطابق ۱۷۸۷ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء ہجری میں ترک وطن کر کے کانپور چلے گئے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ واپس آئے۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانہ میں دربار میں ملازمت ملی۔ جانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ کی معزولی کے بعد مہاراجہ بنارس کی دعوت پر بنارس گئے اور بعد غدر ۱۸۵۷ء پھر بنارس سے لکھنؤ چلے آئے۔

انھوں نے غلام حسین شاہ کے جہاد کا واقعہ اپنے مخصوص اندازِ نگارش میں اسطرح رقم فرمایا ہے:

اودھ کہ وہ سیتا کی رسوئی مرقد ہے۔ وہاں عہدِ دولت بابر بادشاہ میں مسجد رفیع الشان ہمسر آسمان بنائی۔ بابری تھی۔ اس زمانہ میں ہنود کو کہاں مجال ہمسری تھی۔ سن نو سو تیئیس میں باہتمام سیّد میر عاشقان بنی تھی۔[۲۹۸] اس کی تاریخ 'بود خیر باقی' تھی۔ اور رام دربار میں مسجد فدائی خاں صوبیدار نے بنائی تھی۔ اسلام کی بنیاد جمائی تھی۔ اور اس سے متصل ایک ٹیلہ تھا۔ راجہ رام چندر نے وہ مقام ہنُمان (ہنومان — مولف) اپنے رفیق کو بصلہ فتح لنکا دیا تھا اب اُس کا نام "ہنومان گڑھی" ہے۔ وہاں اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ جب نواب شجاع الدولہ بہادر بکسر کو گیے اور لڑائی میں شکست ہوئی۔ انتظام ملک میں فتور پڑے تو چند فقیر اتیت وہاں آرہے۔ چبوترہ بنایا۔ چھپر ڈال کے

کچھ دنوں بعد ایشوری پرشاد نرائن سنگھ مہاراجہ بنارس نے پھر بکویاد کیا اور ۱۸ رجون ۱۸۵۹ء کو بنارس گئے۔ آخری عمر میں آنکھوں سے بالکل معذور ہو گئے تھے۔ ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ بنارس میں انتقال ہوا، اور وہیں دفن ہوئے (رجب علی بیگ سرور۔ مولفہ نیر مسعود صفحہ ۱۲۱ نیز فسانۂ عبرت صفحہ ۱۳)

۲۹۸۔ جامع مسجد بابری ۹۲۵ ہجری میں میر باقی کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی یا مکمل ہوئی جیسا کہ قطعہ تاریخ کے لفظ 'بود خیر باقی' سے ظاہر ہے۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ شاید ۹۲۳ھ کے بجائے ۹۲۳ھ لکھ دیا گیا ہے۔ مولف

ہنومان کی مورت رکھ کے پوجنے لگے۔ بعد چند بیراگیوں نے وہاں دخل کیا اتیتوں کو نکال دیا۔ اس کی کیفیت تواریخ کتب میں لکھی ہے۔ اور صحیفہ بہادر شاہی میں تو مفصل بقید سن و تاریخ تحریر ہوئی ہے۔ جس کا دل چاہے دیکھ لے۔ جب علاقہ پچھم راٹھ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا۔ اس ٹیلہ پر احاطہ بنا کے "ہنومان گڑھی" نام رکھا۔ وزرائے سلطنت کی غفلت سے انتظام بگڑا۔ کارپردازان جامع سے ہر طرح کا فتور پیدا ہوا۔ ہندو اہلکاروں کی اعانت سے بیراگیوں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کا نشان مٹا کے بتخانے بنالیا پھر بابری مسجد میں جہاں سیتا کی رسوئی تھی۔ شرکت کی۔ علانیہ پوجا ہونے لگی۔ منتظم چاندی کے جوتے کھا کے سرنگوں ہوئے کسی نے خبر نہ لی۔ پہلے تو شیخ علی حزیں کا قول موافق ہوا تھا:

بس کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

پھر انقلاب فلک سے ایسا زمانہ ہوا کہ مسجد توڑ کے بتخانہ ہوا۔ یہاں غفلت کا پردہ ایسا آنکھوں پر پڑا کہ کسی کو نہ سوجھا۔ الغرض بارہ سو اکہتر ۱۲۷۱ ہجری عہد دولت واجد علی شاہ میں شاہ غلام حسین نام فقیر نے نواب کو عرضی دی۔ توہین اسلام کی اطلاع کی۔ یہاں کسی نے نہ سنا۔ آخر شاہ صاحب نے فیض آباد کا عزم کیا۔ وہاں منعم بیگ کوتوال و اعلیٰ علی چلکہ دار کو قصہ سنایا، مگر انکو مخالف پایا۔

اِس اثنار میں چند مسلمان شاہ صاحب کے شریک ہوئے اور اودھ میں پہنچے۔ مان سنگھ اور اطراف کے ہندو انبوہ کثیر سے بیراگیوں کی حمایت کو موجود ہوئے۔ گو سلطنت اسلامی تھی، مگر مسلمانوں کی کسی نے نہ سنی۔ نہ مدد دی۔ نہ اعانت کی۔ عامل کے باعث سب رستے محدود ہوئے۔ نہ وزیر نے اِس صدا پر کان لگایا نہ بادشاہ کو انجام کا دھیان آیا۔ آخر ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۱ ہجری جمعہ (مطابق ۲۰ جولائی ۱۸۵۵ء ــــ مولف) کوٹل خاں کے احاطہ والے مسلمان شاہ غلام حسین کے شریک ہوئے۔ اُس طرف دس بارہ ہزار بیراگیوں کے مددگار باساز و ہتھیار جمع ہو گئے۔ اعلیٰ علی نے مسلمانوں سے کہا۔ یہاں فوج سلطانی کم ہے۔ تم لوگ تھوڑے ہو۔ ہندوؤں کا مجمع بہت ہے۔ ایسا نہ ہو بھگوڑے بنو۔ شام تک آر صاحب کی پلٹن آتی ہے۔ اس طرف بھی کثرت ہو جاتی ہے۔ اِس وقت تامل کرو۔ صبح ہونے دو۔ دوسرے روز جب یہ لوگ جمع ہوئے تو پھر نیا حیلہ پیش کیا کہ آر صاحب کو بادشاہ کے حکم کا انتظار ہے تھوڑا توقف درکار ہے۔ ان کو تو باتوں میں الجھا رکھا۔ ہندوؤں نے اودھ میں مسلمانوں کا محلہ گھیرا لیکن دِلاوروں نے منہ نہ پھیرا۔ تلوار چلنے لگی قضا ہاتھ ملنے لگی یہاں تو یہ ہنگامہ تھا۔ اس دار و گیر میں کئی ہزار ہندو مسجد پر جھکا۔ وہاں شاہ غلام حسین اور ان کے ساتھی آل سے بیخبر کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ جب یہ لوگ سر پر پہنچے تو وہ

لوگ بھی آمادۂ کارزار ہوئے۔ رستم علیخاں کہ بے شک رستم دوراں تھا۔ اور اس کا بھائی احمد علی خاں کہ وہ بھی جرار یکتائے زماں تھا نکل کے بڑی بہادری و استقلال سے لڑے۔ باوجود کثرت امثر کو کے قدم اوکھڑ گئے۔ بھاگ کے رنگ محل میں پناہ گزین ہوئے جب مسلمان وہاں پہنچے تو وہ نامرد وہاں سے بھی بھاگ نکلے۔ بہادروں نے ان کا تعاقب کیا بہتوں کو جہنم میں پہنچا دیا۔ آخر بھگوڑے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کے بندوقیں سر کرنے لگے۔ مسلمان جو کھلے میدان میں تھے مرنے لگے۔ کچھ تو جان سے گئے باقی مسجد میں پہنچے۔ مگر چار شخص مثل ضرغام کے آگے بڑھے۔ چاروں طرف سے گولی برستی تھی، اس پر ان کے ہاتھ سے نعش پر نعش گرتی تھی۔ ان میں گولی کھا کے تین آدمیوں نے کلمۂ شہادت پڑھ کے بہشت بریں کی راہ لی۔ رستم علیخاں نے ہنومان گڑھی کے زینہ پر چڑھ کے اذان کہی۔ روح نے فردوس بریں کا راستہ لیا بیراگیوں نے مسجد کا محاصرہ کیا اور دیوار توڑ کے ایک کم ستتر آدمیوں کو شہید کردیا۔ اسمیں کچھ لڑکے صغیر اور جوان و پیر تھے جو مثل گوسفند ذبح کیے گئے۔ اور اٹھارہ کلام اللہ نمازیوں کے لے کے کچھ جلائے اور کچھ پارہ پارہ کر کے ہوا میں اڑائے عامل و کوتوال بد اعمال نے آنکھوں سے دیکھا۔ شہیدوں کا اسباب لٹا۔ کافروں نے نعشوں کو پامال کیا۔ شاہ غلام حسین اور ایک درزی

اس گروہ سے زندہ بچے۔ خدا جانے کس طرح ہندوؤں کے غول سے نکل گئے۔ ہندوؤں نے اپنے کشتے جلائے کچھ دریا میں بہائے۔ مسلمانوں کو دفن کرنے کوئی صاحب نہ آئے آٹھ پہر بعد کوتوال بداعمال نے مسجد کے قریب گڑھا کھدوا کے گنج شہیداں کیا۔ ان بے سروسامانوں کا یہ حال کیا۔ اور اپنی روسیاہی مٹانے کو اخبار نویس سے پرچہ لکھوایا کہ ہندو بے قصور تھے۔ مسلمان گڑھی لوٹنے کو گئے۔ انھیں کے فتور تھے ——— اب لکھنؤ کا حال سنئے اور کافروں کا سر دھنئے:

ہرچند بادشاہ کے مزاج میں عیش و عشرت لعب و غفلت کا سامان سب تھا۔ اس پر خبر سن کے دیانت الدولہ کو بیراگیوں کے قلع قمع کا حکم دیا۔ دیوان صاحب نے نواب کو سمجھایا کر کُل علاقہ ہندوؤں کا ہے۔ اگر بوہ ہو جائے گا۔ کچھ بن آئے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کچھ چاٹ دی اس جانب سے طبیعت اچاٹ دی۔ دیانت الدولہ کا جانا موقوف ہوا۔ نواب نے مرزا آغا علیخاں ناظم کو اس کام پر مامور کیا۔ انھوں نے فیض آباد پہنچ کے تحقیقات شروع کی یعنی ہنومان گڑھی میں مسجد تھی یا نہ تھی۔ حق عجیب چیز ہے۔ بہرکیف تحریر و تقریر سے مسجد کا وہاں ہونا ثابت ہوا۔ بعض مخالفوں نے بھی اقرار کیا۔ مولوی صاحب داروغہ

عدالت فیض آباد اور میر سید علی پیش نماز نجستہ بنیاد نے ورق کلام اللہ کے جلا...
کے پاس بھیجے، ان نے چھپا رکھے۔ دوسری بار مجتہد العصر کی خدمت
میں روانہ کئے۔ نہیں معلوم وہ کیا ہوئے۔[۲۱۹]

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ!

واجد علیشاہ کے زمانہ کا دوسرا معرکہ جہاد

غلام حسین شاہ کے معرکہ جہا... کے تقریباً سوا دو مہینے بعد
مولوی سید امیر علی صاحب نے دوبارہ علم جہاد بلند کیا۔ ہزاروں مسلمان شوقِ شہادت
میں سرشار ہو کر شریک مجاہدین ہوئے۔ لیکن علمائے وقت کی تقدس مآب اور معز...
شخصیتوں کی منافقانہ فطرت کی شیطنت اور ارکانِ سلطنت کی خود غرضی و نفس پرستی
نے عذابِ آخرت سے بے پرواہ ہو کر صرف چند روزہ عیشِ دنیا کی خاطر، جانِ عالم حضرت
واجد علی شاہ بادشاہ اودھ پر نہ صرف حقائق اور وجہ جہاد و منشائے مجاہدین پوشیدہ رکھ...
بلکہ مولوی سید امیر علی صاحب کے خلاف ہر وقت بھڑکاتے رہتے، اور بدظن کرتے
رہتے تھے۔

مولوی سید امیر علی صاحب کے اعلان جہاد کے اسباب و علل کی تفصیلات
مولانا۔ حکیم مولوی محمد نجم الغنی خانصاحب رام پوری نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف
"تاریخ اودھ" جلد چہارم صفحات ۹۰ لغایتہ ۹۸ پر زیر سرخی "اجودھیا میں ہنومانگڑھی

۲۱۹۔ فسانہ عبرت، مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مرتبہ ذکی کاکوروی صفحات ۱۲۱ لغایتہ ...
مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ سن اشاعت ۱۹۷۰ء ناشر مرکز ادب اردو، ۱۲۰ شاہ گنج لکھنؤ۔

سجد کے جھگڑے میں کئی سو مسلمانوں کا بیراگیوں کے ہاتھ سے مقتول ہونا۔
کار اس جماعت کا لکھنؤ کی فوج کے ہاتھ سے مارا جانا۔ اس معاملہ میں علی نقی خاں
دوسرے حکام ہندوؤں سے رشوت لیکر آخر تک ان کے طرفدار رہے"۔ ان الفاظ
بیان کیا ہے[۲۴۰]:

بیراگیوں کو اس قدر قوت ہو گی کہ کسی مسلمان کو ہنومان گڑھی
سے گذرنے نہیں دیتے تھے۔ جب ہنومان گڑھی کے ہندوؤں
کا فساد بہت بڑھ گیا اور مسلمانوں کو یہ ثابت ہو گیا کہ انکی رعایت
بطمع زر ارکان سلطنت کرتے ہیں تو بندگی میاں کے پوتے مولوی
سید امیر علی ساکن امیٹھی نے جوش حرارت اسلام کی وجہ سے
چاہا کہ توہین اسلام کا دفعیہ کریں۔ پہلے سنڈیلہ میں اہل اسلام نے
مولویوں کی تحریک سے اجماع کر کے جہاد پر کمر باندھی۔ بعض
آدمیوں نے منع کیا کہ یہ بات اچھی نہیں۔ حاکم وقت اور انگریزوں
سے آخر کو مقابلہ پیدا ہو جائے گا۔ پھر کچھ بن نہ پڑیگی۔ اور توہین
اسلام سب کے واسطے ہو جائیگی۔ غرض ایک نے نہ مانا۔ مولوی
صاحب کے سر پر اجل آ گئی تھی۔ جب علی نقی خاں کو اس بات
کی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ قدوی بہت چاہتا ہے کہ
یہ فساد کسی طرح بند ہو جائے۔ مگر خانہ زاد سلطنت یعنی خواجہ سرا

۲۴۰۔ تاریخ اودھ جلد چہارم۔ مطبوعہ مطبع مطلع العلوم۔ مراد آباد (یو۔پی) سال طباعت ۱۹۱۲ء

غفلت میں بانی مبانی اس فساد کے ہوتے ہیں۔ میر حیدر جو بشیر الدولہ کا منشی اور متوسل ہے اوس کا ایک عزیز مولوی امیر علی چاہتا ہے کہ اس آتش فتنہ کو خوب بھڑکائیے۔ اور مفت میں میری بدنامی و ارسائی ظاہر ہو۔ بشیر الدولہ جب اس سے واقف ہوئے تو انھوں نے اپنے سر سے الزام اوتارنے کیلئے منشی کے ذریعہ مولوی صاحب کو بلوا بھیجا۔ اور امجد علیشاہ کے امام باڑہ میں اوتارا۔ جب تک وہ رہے، ضیافت کی۔ اور اپنے ساتھ علی نقی خاں کے پاس لے گئے۔ وزیر اعظم نے سب طرح سے مولوی امیر علی کو سمجھایا اور چاہا کہ خلعت دیکر رخصت دیں۔ لیکن مولوی صاحب نے خلعت نہ لیا۔ اور جہاد سے ہاتھ نہ اوٹھایا۔ بلکہ بہت بے لطف گفتگو کی۔ جس سے وزیر کے دل کو ملال ہوا۔ وزیر نے مآل اندیشی کی راہ سے اونکو قید کر لینا چاہا تاکہ فساد کو طول نہ ہو میر حیدر نے بشیر الدولہ سے کہا کہ یہ صورت ہوئی تو پہلے میں اپنا گلا کاٹ کر مرجاوں گا۔ آخر شش اوسی شب کو مولوی صاحب کو اونکے مکان پر پہنچا دیا۔ اور ساتھ سلامتی کے وہ نکل گئے۔

مولوی صاحب نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ تقریباً ایکسو ستر آدمی مجاہدین سے لیکر روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک فقیر آزاد نے مولوی صاحب سے کہا کہ ہرگز نہ جاؤ مارے جاؤگے مولوی صاحب الہام غیبی سے کچھ متنبہ نہ ہوئے۔ جب سلطنت میں یہ خبر پہنچی تو علی نقی خاں

نے میر صفدر علی کارندہ اہتمام الدولہ حیدر حسن خاں اور تہوّر علی
خاں کو فوج اور توپ خانہ دے کر انتظام کیلئے روانہ کیا۔
انھوں نے پہنچکر پہلے مجاہدین کو نرمی سے سمجھایا۔ اوسکے بعد
سختی سے کہا۔ شیخ علی حسین اور تہوّر علیخاں معرکہ کے اختتام
تک سوال و جواب کیلئے رہے۔ اور کوئی دقیقہ فہمائش کا باقی
نہ چھوڑا۔ آخرکار عشرہ محرم قریب آجانے کی وجہ سے یہ عہد و
میثاق قرار پایا کہ ایک مہینہ کی میعاد میں اگر گڑھی میں مسجد نہ بن
جائے تو پھر مجاہدین کو اختیار ہے۔ تہوّر علی خاں نے اپنے
جوش ایمانی سے ازراہ سپہ گری یہ کہا کہ اوس وقت ہم بھی
آپ کے شریک جہاد ہونگے۔ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ سے ۲۴ محرم
۱۲۷۲ھ (مطابق ۸ اگست ۱۸۵۵ء لغایتہ ۸ ستمبر ۱۸۵۵ء ـــــ
مولف) تک وعدہ موکد ہوا۔ مولوی صاحب اِس مدت معینہ
تک سہالی، علاقہ نواب علی خاں میں رہے۔ اور ہر روز سو من
جنس غلّہ اور تھوڑا خرچ ضرور ملتا رہا۔ اس عرصہ میں جب یہ خبر
دور دور کے شہروں میں پہنچی تو جہاد کا نام سنکر سیکڑوں مسلمان
شریک مجاہدین ہوئے۔ تقریباً دو ہزار کی جمعیت ہو گئی۔ رامپور
اور پیلی بھیت کے پٹھان پہلے جمع ہوئے۔ اور کئی سو پٹھان
ولائتی قندھاری کوہی و دشتی لباس سپاہ سے آئے۔ علحدہ
سب سے اوترے۔ چند روز میں رنگ بیرنگ دیکھ کر اونٹے

پھر گئے بعد اوس کے یہ حال رہا کہ مجاہدین لشکر سے ایک دن پچاس گئے دوسرے دن پچاس اور آ گئے۔ اس مدت میں یہ غلغلہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ مسلمان موافق عقیدۂ خاص کے اپنی جگہ مستعد و آمادہ ہوا۔ اور بعض رئیس انگریز کے خوف سے بدل تمنی اور بظاہر متردد و ظائف ہو کر ساکت و خاموش رہ گئے۔

ایک دن جنرل اوٹرم صاحب بادشاہ کے پاس آئے اور بیان کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فساد عظیم برپا ہوا چاہتا ہے۔ مبادا کشت و خون کی نوبت پہنچے ہزاروں آدمیوں کا ناحق خون ہو جائے۔ ارکانِ سلطنت پر اس کا تدارک اور انتظام واجب ہے۔ مولوی امیر علی بانی مبانی ایسے شر و فساد کا ہوا ہے۔ اوسے قرار واقعی سزا دینا چاہیئے۔ اوسے لکھنؤ سے کیوں جانے دیا۔ قید کر لینا مناسب تھا۔ علی نقی خاں نے کہا۔ میں نے اُمرائے مہنت کو بلوایا ہے۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ شاید وہ بے ضمانت یہاں نہ آئیں۔ بادشاہ بولے کہ آپنے یہ کیا کہا۔ کیا وہ ہماری رعیت نہیں ہیں۔ پھر کیا سبب حاضر نہ ہونے کا۔ ریزیڈنٹ اس کا جواب بنری دیکر رخصت ہوئے۔ بادشاہی حکم کے بموجب ہنومان گڑھی کی بعض مہنت راجہ مان سنگھ اور کپتان بارلو کی ضمانت سے

درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ وزیر نے اونھیں اپنا مہمان کیا۔ آخر
کوتہ اندیشوں نے بطمع دنیا اپنا کام کیا۔ اور اونھیں بسلامت
ریاست سے رخصت کرا دیا۔ اور بظاہر اپنے بچاؤ کی باتیں لاطائل
ذہنی تراشیں۔ اور بادشاہ سے باتفاق ہم زبان ہو کر عرض کیا۔
اور ریزیڈنٹ کے پاس پرچہ پیام شرعًا پہنچا کہ ہنومان گڑھی
میں مسجد کا ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ بعد مدارج تفہیم ہر
فریق کو عدول حکمی کی سزا دی جائے۔ ریزیڈنٹ نے اِس
مضمون کی رپورٹ گورنر جنرل کو کردی۔ اور پرچہ پیام کا یہ
جواب بھیجا کہ اہالیان سلطنت نے اِس بات میں حق وانصاف
ادا کیا۔ اور مذہب وملت کی رعایت نہ کی۔ حاکم وقت کو ایسا ہی
عدل وانصاف چاہیے۔ اس مدت حکومت میں کبھی ایسا امر
واجبی اور مناسب حال، جیسا چاہیے، سرزد نہیں ہوا۔ اس پرچۂ پیام
نے خاتمہ کر دیا۔ غافلوں نے چاہا کہ کسی جعل وفریب سے یہ امر
لیت ولعل میں رہ جائے۔ مگر چارۂ علاج خود بند کر دیا تھا۔
اب مولوی صاحب کے دعویٰ کی مدت بھی تمام ہوئی۔ ہنومانگڑھی
میں مسجد کا ہونا تحقیقات اور اکثر مقامات کے مشاہدے سے
ثابت ہو چکا تھا۔ اِس عہد کے منقضی ہونے کے بعد مولوی
صاحب مایوس ہوئے۔ چار و ناچار مستعد مرگ ہو کر وہاں سے
باتی کو کوچ کر گئے۔ اور پھر وہاں سے دریا آباد گئے اور عیدگاہ

کے باغ میں مقام کیا۔ علی نقی خاں کے حکم سے توپ خانہ اور تلنگوں
کی پلٹن اور رنجیب کپتان باربو صاحب و حاجی مرزا حسین علی کمیدان
گلابی پلٹن کی ماتحتی میں روانہ ہوئے۔ اِس فوج میں کثرت سے
مسلمان تھے۔ ریزیڈنٹ نے صاف کہدیا کہ مولوی صاحب کے فساد
کو نہ روکا تو سلطنت کی خیر نہیں۔ اور حریفوں نے اپنے بچاؤ
کیلئے بادشاہ سے مولوی صاحب کی نسبت بہت سی خلاف
باتیں بنا بنا کر بیان کیں۔ علی نقی خاں وزیر بھی خائف تھے۔ اور ہندو
اور اونکے طرفداروں سے متفق تھے۔ اور اپنی جیب طمع بھر چکے
پھر کیونکر صاف صاف خدا سے ڈر کر عرض کرتے۔ غرض پندرہ
دن تک مولوی صاحب دریاآباد میں رہے۔ اس عرصے میں وہ
مولوی صاحبان جو سنڈیے میں محرک جہاد ہوتے تھے وزیر
سے متفق ہوکر اونکے حکم سے مجاہدین کے لشکر میں فہمائش کیلئے
آئے اور چاہا کہ اونکو اس ارادے سے روکیں اور عیدگاہ
کی مسجد میں بیٹھ کر گول گول باتیں خوف حاکم وقت و خوف جان و آبرو
سے بطور وعظ بیان کیں۔ جاہل یہ سنکے سب سے پہلے بگڑے
کہ واہ مولویو، تم سب اہل دنیا ہو۔ کل تم نے ہم کو آمادہ جہاد
کیا تھا۔ اب حاکم وقت کے سمجھانے سے ہم کو مرتد کرتے ہو
اب ہمیں فریب نہ دو۔ یہ فضیلت مال دنیا چاہنوں کے ہاتھ سے
جاتی رہے گی۔ یہ سنکر عوام سے ڈر کر چپکے لوٹ گئے۔ پنجشنبہ

کہ عصر کے وقت مولوی صاحب کے جیتے ہیں کوچ کا نقارہ ہوا
سب نے کمر باندھی۔ ہتھیار لگائے۔ فوج بھی اُدھر تیار ہوئی۔
لیکن کسی کی جرأت سامنے آنے کی نہ پڑی۔ یہاں تک کہ دریاآباد
کا حصار بند کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنے مجاہدین کے رعب
سے پھاٹک کھول دیا۔ وہاں سے قصبہ کے کنارے پر ڈاک بنگلہ
کے مقابل مولوی صاحب نے قیام کیا۔ سات دن تک وہیں
رہے۔ جب فوج شاہی نے سبب حرکت دریافت کیا، کہا
مقام اوّل میں پانی کی قلت اور عفونت کی کثرت تھی۔ اس جہت سے مقام ثانی اختیار کیا۔

جب مولوی صاحب عیدگاہ میں تھے۔ نماز جمعہ میں شاہی
فوج کے ہزاروں مسلمان کیا سپاہی کیا سردار، اُن کے پیچھے نماز
پڑھتے تھے۔ جب نماز پڑھ کر اپنے لشکر میں جاتے تھے قتل
پر کمر باندھتے تھے۔ جب سلطنت میں یہ خبر پہنچی تو حکم آیا کہ آب
دانہ اور رسد مجاہدین پر بند کر دو کہ اُن پر عافیت تنگ ہو جائے
مولوی صاحب نے اتمام حجت کی غرض سے ایک عرضداشت
نظم میں بادشاہ کو بھیجی کہ رسول مقبول نے دو نفیس چیزیں
اپنی امت میں چھوڑی ہیں۔ ایک عترت طاہرہ، دوسرے کلام اللہ
عترت پر وہ حال گذرا، جو چاہا کیا۔ کلام اللہ باقی رہا تھا، کفار
کے ہاتھ سے خانۂ خدا میں اور اس کی یہ صورت گذری۔ تعجب ہے کہ ایسے

عہد معدیت میں اسکا انتظام نہ ہو سکے۔ اس بندۂ مسکین نے حسبۃً اللہ کمر باندھی
ہر ادسکی پاداش میں مستحق ایسی عقوبت کا ہوا۔ مگر حیف ہزار کاں نیت دو نے، پر طمع
عرضداشت بادشاہ کے ملاحظہ میں نگذاری۔ اس لیے کہ اپنے بیان
سے خود جھوٹے ہوے۔ جب مجاہدین پر رسد بند ہو گئی تو فاقے
گذرنے لگے۔ اس کڑی پر بہت سے چلے گئے۔ مولوی صاحب
نے اپنے بھائی شیخ حسین علی کو کہا۔ الحمد للہ کہ تم نے اور تمہاری
فوج نے مثل زمان سابق کئی سو برس کے بعد آب و دانہ بند
کیا ہے۔ حسین علی نے جواب دیا مجھ سے کبھی ایسا نہ ہوگا۔ اوسی
وقت غلّہ وغیرہ ضروریات چھکڑوں پر لدوا کر بھجوا دیا اور بہت
سی برادرانہ دلجوئی کی جب لوگوں کی کثرت بڑھی۔ مولوی صاحب
گرفتاری کے خوف سے شریک نماز نہ ہوتے تھے۔ اسکا بھی
دغابازوں سے کچھ عجب نہ تھا۔ محافظت کیلئے ہمیشہ تین آدمی
تلواریں کھینچے کھڑے رہتے تھے۔ اور ہر شخص کو پاس نہ
جانے دیتے تھے سوا شیخ حسین علی کے یا تہور علی خاں جایا
کرتا تھا۔ ایک دن شیخ حسین علی نے بہت سی منت و سماجت
کے بعد کمر سے قرولی نکال کر مولوی صاحب کو دی اور پاؤں
پر سر رکھ کر کہا۔ کاش کے اس وقت آپ ہمیں جان سے مار
ڈالتے۔ بہت سی آفتوں سے بچونگا۔ اور اپنی بہن کو رانڈ نہ دیکھ
سکونگا۔ پھر شیخ حسین علی اعلی نقی خاں وزیر کے پاس گئے انسے

تمام حال عرض کیا۔ ادنھوں نے کہا جیسے ہو سکے اس فتنہ و فساد کو بند کرنا چاہیئے۔ اب خوف تنزل سلطنت ہے اور مسجد سہولت کے ساتھ وقت مناسب میں بن سکتی ہے۔ مولوی صاحب ایسے قول کو بے اصل اور بے فروغ سمجھے۔ کہا کہ جب ان سے ایفائے وعدہ نہ ہو سکا تو ان سے مسجد نہیں بن سکے گی۔ اور نہ وقت مناسب ہاتھ آئے گا۔ میر محمد حسن خاں ناظر بہرایچ، نواب محسن الدولہ کی طرف سے مولوی صاحب کے پاس سمجھانے کو گئے تو مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ جب تک سلطنت کی طرف سے مسجد کی تعمیر ہو۔ میرے ہمراہیوں کے اخراجات ضروری کے متکفل رہیئے۔ کیا مضائقہ میں توقف کرونگا۔ مگر ارکان سلطنت کو بلطائف الحیل ٹالنا منظور تھا۔ ایفائے وعدہ کون کرتا۔ وہ اپنی دلجمعی کر چکے تھے۔ اس عرصے میں بادشاہ اور علی نقی خاں کی تحریک سے سلطان العلماء نے بھی تحریر کیا۔ اور وہ تحریر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ لیکن اُسے خلاف نفس الامر سمجھے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ سلطان العلماء نے کوئی فتویٰ کنایۃً ایماءً بالتصریح نہیں لکھا تھا[۲۱] بلکہ یہ جواب دیا تھا کہ ایک شخص نے بے غرض نفسانی رفع توہین اسلام پر کمر باندھی ہے اور مرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ سراسر اوسکے حق بجانب ہے۔ کیونکر خلاف شریعت غرائے محمدی حاکم وقت کے دباؤ سے لکھوں۔ لیکن

[۲۱] سلطان العلماء کے فتویٰ کی عبارت مرزا رجب علی بیگ سرور نے نقل کیا ہے جو صفحہ پر درج ہے۔ مولف

مقام حیرت ہے کہ لکھنؤ دار المومنین مشہور ہے۔ اور اس میں ایک شخص مسکین ضعیف و نحیف نے ہمت مردانہ کی ہے۔ مقام عبرت ہے۔ علمائے فرنگی محل نے بھی اسی طریق سے تحریر کیا۔ بلکہ کہنے لگے کہ حاکم وقت کو اپنے شہر میں رہنے دینے کا اختیار ہے مگر ہم کبھی اس شخص کے قتل کا قتل کا فتویٰ نہ دیں گے۔ لیکن بعض علمائے اہل سنت جیسے مولوی حسین احمد اور مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت انگریزی اور مولوی محمد یوسف اور مولوی فضل حق خیر آبادی مولف ہدیہ سعدیہ و حاشیہ قاضی مبارک وغیرہ اور مولوی سعد اللہ جو زیارت خانہ کعبہ سے مشرف ہو گئے تھے اور قول المانوس فی صفات القاموس۔ میزان الافکار شرح معیار الافکار اور شرح فصول اکبری وغیرہ کے مولف ہیں۔ اور دوسرے علمائے گمنام نے محض بہ طمع دنیا مولوی امیر علی صاحب کے قتل کا فتویٰ عبارات مختلف سے رنگین کر کے دیا۔ اور دلی کے بعض علماء نے بھی ایسی برہان و حجت کے ساتھ لکھا کہ جب اہل اسلام قلیل ہوں اور کفار کا غلبہ ہو۔ اس وقت خلاف حکم اولی الامر یعنی حاکم وقت جنکے اختیار میں ہوں، خواہ انگریز ہوں یا مسلمان، جہاد حرام ہے۔ پس جو شخص ایسے امر کا مرتکب ہو وہ طاغی و باغی ہے۔

سراج الدین کمیدان بھی ریاست کی طرف سے فہمائش کو بھیجا گیا۔ اوس کے کہنے سے کچھ لوگ بریلی، رامپور، پیلی بھیت کے بزدل ہوکر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ انھیں بقدر ضرورت زاد راہ دیا گیا۔ اور کچھ افغان ولائتی کو بھی فتوے سنتے ہی اوٹھ گئے۔ اب مجاہدین متفرق اور پریشان حال چھ سو کے قریب تن برگ دیگر رہ گئے۔ ان پر فاقے ہونے لگے۔ موت سب کی نظر میں تھی۔ پچاس روپے حسین علی خاں اونکے کارندے چندہ کرا کے کفالت مجاہدین کیلئے دیتے تھے۔ میر عباس ہمشیر زادہ میر گنجان نامی تیر اک مجاہدین لے لشکر کا کوتوال تھا۔ اوسکی معرفت روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔ ۲۶ صفر ۱۲۷۲ ہجری (مطابق ، نومبر ۱۸۵۵ء) بروز چہار شنبہ کو مولوی صاحب نے نماز باجماعت پڑھی۔ اور محمد پور کو روانہ ہوئے۔ اوس وقت تین سو آدمی سے زیادہ ہمراہ نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان بار لو کو یہ خبر پہنچی تو اوس نے چار کمپنیاں اور دو توپیں لیکر تعاقب کیا۔ اور تین کمپنیاں گلابی پلٹن کی حاجی مرزا حسین علی کی ماتحتی میں تیار ہوئیں۔ اس عرصے میں مولوی صاحب آٹھ کوس مقام حیات گنج میں جا پہنچے۔ دن چھپنے کے قریب تھا۔ شمال کی جانب ایک باغ میں ٹھہرے۔ منظور یہ تھا کہ فریضہ ظہر کے بعد[۲۲۱] رودلی میں جو تین کوس تھا۔ چل کر ٹھہریں گے۔ جتنے نمازی

۲۲۱۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے "فریضہ عصر ہونا چاہیئے" ۔ مولف

تھے وہ ایک ایک رو دلی کو چلے۔ شاہی فوج سدِ راہ ہوئی
گلابی کمپنی جوار کے کھیت میں اور بار تو کی کمپنی اور توپیں کھیت
کے سر پر تھیں۔ اتفاقاً کئی تلنگے اپنی قطار سے بڑھ کر راستے پر
کھڑے ہوئے۔ تا کہ مجاہدین کو جو رودلی جاتے تھے منع کریں
کپتان بارتو نے خود مولوی صاحب کے پاس آ کر کہا کہ بادشاہ
وقت اور ریزیڈنٹ کے حکم کے خلاف آپ کو آگے جانا مناسب
نہیں۔ اپنی جماعت کو منع کیجئے۔ اور آپ بھی مناسب
ہے کہ اس عزیمت سے باز رہیئے ورنہ ہم کو حکم ممانعت کا ہے
مولوی صاحب نے کپتان کو جھڑک کر کہا۔ کافر سامنے
سے ہٹ جا ورنہ کوئی مجاہد گولی سے مار ڈالے گا۔ کپتان اپنی
فوج میں گھوڑا بھگا کے چلا گیا۔ اور حکم دیا کہ آگے بڑھیں تو اول
خالی توپ داغو۔ نہ مانیں تو فیر کرو۔ تلنگے مجاہدین پر گولیاں
مارنے لگے۔ لیکن مجاہدین نے اسی آدمی جوار کے کھیت سے
نکل کر دفعتہً توپ پر جا پڑے۔ اور بند کر دی۔ چاروں طرف سے
فوج کے سپاہی گولیاں برسا رہے تھے۔ مگر مجاہدین دل کھول کر
تلوار سے خوب لڑے۔ اور ان کے غول سے صدائے تکبیر
بلند تھی۔ گولیوں کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ جب یہ صورت
ہوئی۔ بارتو الگ ہو گیا۔ اور گلابی نے پیچھے سے آ کر باری
غرض آدھ گھڑی میں یہ سب خاک میں مل گئے۔ اور تین توپیں

خالی مغربی جانب سے چلیں جنکی آواز سے بہت مجاہدین فرار ہو گئے۔ اوس وقت مولوی صاحب سترہ۔ اٹھارہ آدمیوں کے ساتھ اپنے سجادہ پر مشغول نماز تھے۔ تلنگوں نے دور سے لوگوں کی جمعیت دیکھ کر ایک توپ ماری۔ آم کے درخت کا ٹ کر بڑا ٹہنا نمازیوں کے سروں پر گرا۔ بعد اوسکے تلنگے یورش کر کے گولیاں مارنے لگے۔ دوسری طرف سے گونڈے کا تعلقدار شیر بہادر اپنی جمعیت سے آپڑا۔ سب کا کام تمام کیا۔ اور مفرورین کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر قتل کیا۔ مولوی صاحب اپنے سجادہ پر رو بقبلہ گرے باقی نمازی اونکی لاش کے گرد پڑے تھے۔ ایک تلنگے نے مولوی صاحب کا سر کاٹ لیا [۲۴۳] بار تو نے وہ سر وزیر کے پاس بھجوا دیا۔ جب وہاں سر لیکر پہنچے تو اونھوں نے کہا کہ یہاں کیوں لائے۔ چاہتے ہو کہ لکھنؤ میں بھی کوئی ہنگامہ برپا ہو۔ دو تلنگے اور شتر سوار لیکر آئے تھے۔ حکم ہوا کہ اس سر کو ریزیڈنٹ کو ملاحظہ کرا کے، موقع قتل پر لیجا کر دھڑ کے ساتھ ملا کر دفن کر دو۔ یہ ڈرے کہ اگر واپس لیجائیں گے مبادا مجاہدین میں سے کوئی اوس کو دیکھ کر چھین لے اور ہمیں مار ڈالے۔ ریزیڈنٹ کو ملاحظہ کرا کے معلوم نہیں کہاں پھینک کر چلے گئے۔ تلنگوں نے مقتولین کے بدن سے لباس بھی اوتار لیا۔ اور وہاں سے کوچ کر کے محمد پور میں جو تین

جان صاحب نے حدیقہ شہدا میں لکھا ہے کہ موضع گمیار کے تعلقدار شیر بہادر نے سر مبارک جسم پر نور سے جدا کیا تھا۔ مولف

کوس تھا مقام کیا۔ مقتولین کی لاشیں وہیں خاک و خون میں غلطاں چھوڑ دیں۔ آخر کار دوسرے دن کو جمعرات تھی مسلمان زمینداروں نے جو قریب رہتے تھے جمع ہو کر ہر ایک مقتول کی لاش اوٹھا کر اوس آم کے درخت کے نیچے دفن کیا۔ مولوی صاحب کے پہلو میں اونکے جوان بھتیجے کو دفن کیا جو حالتِ نماز میں مولوی صاحب کے ہاتھ پر گر پڑا تھا۔ اور دوسرے مقتولین کو ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ ایک سو تیرہ (۱۱۳) آدمی جان سے مارے گئے مجروحین کا حساب نہیں۔ مجروحین خوفِ جان سے آٹھ۔ دس کوس تک بھاگے۔ اور شیر بہادر کے آدمیوں نے کپتان بار تو کے حکم سے اونکا تعاقب کر کے تمام مجروح سفر مدین کو تہِ تیغ کیا۔ صرف میر عباس کوتوال ہزار خرابی بچکر اپنے گھر پہنچا۔

جب انتزاعِ سلطنت شروع ہوا۔ ایک شخص نے دیوانِ حافظ سے تفاول کیا تو یہ شعر نکلا:۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

اب لکھنؤ کی سرکار کے نمک خوار ملازم منشی رام سہائے تمنّا کی زبانی مولوی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے جہاد اور واقعہ شہادت کی تفصیلات ملاحظہ فرمایئے جو نے اپنی کتاب افضل التواریخ میں تحریر فرمایا ہے۔ منشی رام سہائے تمنّا نے لکھا ہے:[۲۴]

۲۴۔ افضل التواریخ صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۲

آتشِ فتنہ فرو ہو گئی تھی کہ پھر تندبادِ غضب مولوی امیر علی
صاحب نے بعد دو ماہ کے اسکو مشتعل کیا۔ اشخاص چند۔ جن کو
تمول ذاتی حاصل تھا۔ خفیہ شریک ہوئے۔ مولوی صاحب موضع میٹھی
بندگی میں جہاں انکا مسکن تھا۔ فراہمی اسباب جہاد میں مشغول ہوئے
یہ خبر بذریعہ اخبار حضرت سلطان عالم ہوئی۔ حکم قضا شیم واسطے حاضری
واسطے مولوی صاحب کے بنام اہتمام الدولہ بہادر حیدر حسین خاں
نافذ ہوا۔ میر صفدر علی نائب نے بہ تدبیر مناسب حاضر دولت کیا۔
وزیر تدبیر نے بعد گفتگوئے ضروری احسن الدولہ کے سپرد کیا۔
احسن الدولہ نے جملہ مراتب فہمائندگی گوش گذار کر کے رخصت
کیا۔ مولوی صاحب چندے تو خاموش رہے۔ پھر عزم ادرھ
مصمم ہوا۔ جب یہ خبر پھر سلطان عالم تک پہنچی، رمضان علی خاں
میر صفدر علی واسطے فہمائش کے روانہ ہوئے۔ مولوی صاحب نے
محدودے چند سمجھکر قید کرلیا۔ یہ معاملہ جب ظاہر ہوا۔ میر صفدر علی
مع چکلہ داران باڑی بسواں جہت تنبیہ روانہ ہوئے۔ مولوی صاحب
نے نظر حفظ گڑھی ستر کھ میں قیام فرمایا۔ فوج شاہی نے محصور
کرلیا۔ پھر دستور باتدبیر نے میر حسن علی نائب راجہ نواب علیخاں
تعلقدار محمود آباد کو واسطے فہمائش مولوی صاحب کے بھیجا کر
مولوی صاحب ہمراہ میر موصوف کے مقام محمود آباد میں رونق افزا

ہوئے۔ فوج شاہی واپس آئی۔ کچھ دن گذرے تھے کہ خبر اجتماع مجاہدین محمودآباد میں بارِ دگر مشتہر ہوئی۔ سلطان عالم ازراہِ عدل وداد خود بذات خاص متوجہ تحقیقات مقدمہ ہذا ہوئے۔ راجہ جلال سنگھ و راجہ نصرت جنگ و راجہ مان سنگھ بہادر قائم جنگ و تہوّر خاں رسالدار بہت تحقیقات موقع بحکم شاہی عازم اودھ ہوئے اور کئی روز قیام کر کے بعد تحقیقات سلجل ہے جو مٹی مہنت بدستخط خود ہابتیں کی مسجد پایہ ثبوت کو نہ پہنچی۔ بلرام داس مہنت و مولوی تراب علی صاحب کئے گئے۔ جناب مولوی امیر علی صاحب کو ہر چند فہمائش کی گئی۔ کچھ اعتنا نہ ہوا۔ تب بادشاہِ وقت نے عالمان حنفی و امامیہ سے دوبارہ جہاد کا فتویٰ طلب کیا۔ علمائے حنفیہ نے یہ فرمایا کہ جب تک شاہِ عہد عزا نہ کرے رعایا پر خود منصب جہاد نہیں رکھتی اور عالمان امامیہ نے بغیر امام ممانعت کی کی۔[۲۴۱] بادشاہ نے مولوی سعد اللہ صاحب عالم متبحر فرنگی محل کو معہ بست و دو کس علمائے منتخب مولوی صاحب کے خدمت میں بھیجا۔ مولوی نے کسی سے ملاقات نہ کی۔ مولوی سعد اللہ نے وہیں ازرہِ

---

[۲۴۱] مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے مجتہد العصر مولوی سید محمد صاحب ابن غفران مآب مولوی سید دلدار علی صاحب کے فتوے کے اصل الفاظ لکھ کر حقائق کو واضح کر دیا ہے کہ منشی رام سہائے تمنّا کا یہ محض بہتان ہے۔ انھوں نے اپنے آقا کی نمک خوری ادا کرنے کی اس طرح کوشش کیا ہے جیسے کہ دوسرے ارکانِ سلطنت نے کیا تھا۔ مولف

حکام شریعت غزا و غلط آغاز کیا۔ اور قریب ایک ہزار مردم کے ہمراہی
میر علی سے یہ تبعیت مولوی سعد اللہ صاحب منتشر ہو گیا۔ آخر کار
جب شورش زیادہ ہوئی اور مولوی صاحب نے یہ مجمع کثیر ان جہاد
عزم اودھ فرمایا۔ سلطان عالم نے بطور ابذید ریذیڈنٹ بہادر
بارلو صاحب کپتان ملازم شاہی کو واسطے تدارک کے متعین کیا۔
وہ افسر جری حسب فرمان شاہی دوادو شتا اشتاب محمود آباد پہنچا۔
مولوی صاحب سے ہنگام ملازمت مراتب پند و نصائح ادا کئے۔
صبح ہوتے ہی مولوی صاحب نے کوس غزیت اودھ بجایا۔ بارلو
صاحب ممانعت کی۔ مولوی صاحب نے جوشِ غضب سے بندوق
سر کی۔ بارلو صاحب کو خدا نے بچایا۔ گولہ اندازان توپ خانہ بارلو صاحب
نے مولوی صاحب سے ساز کیا۔ فیر آسمانی سر ہونے لگے۔ اور
مولوی صاحب پڑھتے ہوئے معہ گروہ مجاہدین باوقار قریب لشکر
پہنچے۔ جب یہ کارسازی فوج خاطر بارلو صاحب منقش ہوئی فوراً
راجہ شیر بہادر سنگھ کمیار نظامت بہرائچ کو اطلاع دی اور توپ بند
کر کے شمشیر خونخوار میان سے نکال کر حملہ آور ہوئے۔ اس زمرے
میں اقوام مثل ندّاف و نور باقان وطرہ فرزش وغیرہ زیادہ تھے۔
اور مشہور ہے کہ مولوی صاحب اپنے قتل کی تاریخ خود حیات
میں تصنیف فرمائی تھی۔

سر میدان کفن بر دوش دارم ۲۲۶

دیگر

گفت از روئے ہمت ازلی ؛ قتل شد مولوی امیر علی

العلم عند اللہ۔ پھر تو طرفین سے جنگ شروع ہو گئی.......

...... آخر کار مولوی صاحب مصلحتاً رزمگاہ سے کنارہ کیا۔ مردم مجتمع متفرق ہو گئے۔ جناب مولوی صاحب اور مصاحب و رفیق ہٹتے ہوئے نالہ رحیم نگر متصل شجاع گنج پہنچے اور فکر اجماع لشکر کی کہ مردمان راجہ کمیار و بار ہونے واقع ۲۶ ر صفر ۱۲۷۲ ہجری روز چہار شنبہ وقت نزول آفتاب اسی نالہ میں اس سب کو شربتِ قتل پلایا۔ نعش مبارک تو اسی نالہ میں رہی اور سر شریف بحفاظت تمام روانہ لکھنؤ ہوا کہ بحکم بادشاہ وقت قصبہ جنہٹ میں لبِ غدیر دفن کرایا گیا....... اس ہنگامہ میں شش صد بست و پنج ہمراہیان مولوی صاحب۔ یکصد چند تن قوم ہنود مقتول و کشتہ ہوئے ـــ“

مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب نے اپنی قابلِ قدر کتاب میں مولوی سید امیر علی (رحمۃ اللہ علیہ) کے جہاد کا پورا واقعہ، اس دور کی عام بدحالی، بے حسی اور بے ادراکی کو بڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے۔ سرور صاحب شاہ کے پرانے نمک خوار اور ملازم ہونے کی وجہ سے بادشاہوں کی تعریف و تو

۲۲۶- مکمل شعر یہ ہے:

شنو تاریخ من قبل از شہادت ؛ سر میداں کفن بر دوش دارم

رہی کوشش کرتے ہیں اور حتی الامکان ان کے عیوب کی پردہ پوشی بھی کرتے
رہے کہ اس محبت اور تعلق کے خاطر، جو سرورؔ کو شاہان اودھ سے تھا۔
بھی اور کہیں کہیں سلطنت و حکومت نیز ان بادشاہوں کی نجی زندگی کے
سے کبیدہ خاطر ہو کر اشارۃً اور کنایۃً اظہار حال کر جاتے ہیں جس سے بہت
ے وردن پردہ منکشف ہوتے نظر آتے ہیں۔
ب مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے قلم حقیقت نگار سے مولوی سید امیر علی صاحب
واقعہ سنئے:

— . دوسرا سانحہ جاں گداز پر سوز سنئے۔ دفعتاً اطراف و جوانب
سے خبریں آنے لگیں کہ مسلمانوں پر یہ امر بہت شاق گذرا ہے۔
مولوی سید امیر علی صاحب رئیس امیٹھی کو اپنا امیر اور افسر مقرر کر کے
انتقام لینا مقرر کیا ہے۔ یہ سُن کے ہر طرف سے مسلمان جوق در
جوق آنے لگے۔ اور شہر سے بھی مسلمان امیٹھی جانے لگے۔ نواب
نے مرزا علی بیگ کوتوال شہر کو حکم دیا کہ کوئی ہتھیار بند شہر سے
باہر نہ جانے پائے۔ اگر تکرار کرے، گرفتار ہو کے ہمارے
سامنے آئے۔ اور عمال و چکلہ داروں کو شقّے پروانے جاری
ہوئے۔ وہ بھی جاں بازوں کے درپئے گرفتاری ہوئے۔ پھر علماء
کو طلب کیا۔ بلوا ٹھہرا کے جانے کی ممانعت کا فتویٰ لیا۔ بعض
دنیاداروں نے دولت کی طمع اور ثروت کی امید پر لکھ دیا کہ جہاد
نہیں، فساد ہے۔ اس راہ میں جو مارا جائے گا، اسکی مشقت برباد

ہے۔ اِس کے صلہ میں کسی کو خلعت مِلا۔ کوئی عہدہ پانے کا امیدوار کیا گیا۔ القصہ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہوا۔ عالموں نے سمجھا بُجھا کے ڈرا دھمکا کے پریشان کر دیا۔ مولوی سید امیر علی صاحب کہ بارہ سو برس کے بعد اِس جرائت و ہمت سے کے ہوئے کہ راہِ خدا میں جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ خدا اور رسول کا حکم بجا لانے میں کسی سے نہ ڈرے۔ آخر نواب نے بصلاحت منشی امیر حیدر و بشیر الدولہ خواجہ سرا مولوی صاحب کو بلایا۔ پچاس۔ ساٹھ جاں بازوں سے انھوں نے شہر میں قدم رنجہ فرمایا۔ امجد علیشاہ کے مقبرہ کی مسجد میں اترے۔ شہر کے مسلمان جوق در جوق جانے لگے۔ جس روز نواب سے ملاقات ہوئی۔ پہلے مجتہد العصر کا فتویٰ دستخطی نواب کے ہاتھ میں دیا۔ انھوں نے عیاری و چرب زبانی سے مسجد تعمیر کرنے، مشرکوں سے انتقام لینے کا وعدہ کیا مگر وہ سب بانی تھا۔

فتویٰ مولوی سید محمد مجتہد العصر :-

حاکمِ وقت را بمتابعت حاکمِ شرع رفع شر کفار از اہلِ ایمان و اسلام و اجرائے حدود بر محاربین مشرکین و قصاص خون مسلمانان واجب است۔ واللہ اعلم بالصواب ؏

؏ ترجمہ:- حاکمِ وقت پر واجب ہے کہ وہ شریعت کی مطابقت میں اسلام اور اہلِ ایمان کیطرف سے کفّار و مشرکین پر حد جاری کرے اور مسلمانوں کے خون کا قصاص لینے کا حکم دے۔

مہر مجتہد العصر

نواب نے یہ فتویٰ پڑھ کے جواب دیا کہ مجتہد العصر کی تحریر پر
عمل کریں گے۔ مسجد بنوا دیں گے اور انتقام بھی لیں گے پھر
بہت تملق کی باتیں کیں۔ وہ سب دھوکہ دینے کی تھیں۔ مولوی صاحب
نے اتمام حجت کیلئے پندرہ روز شہر میں قیام کیا۔ جب وعدہ کا
اثر کچھ بھی نہ ظاہر ہوا۔ تو چلنے کا اہتمام کیا۔ نواب دغاشعار
نے چاہا نہ جانے دیں۔ چپکے سے گرفتار کریں۔ لیکن جو لائے تھو
انھوں نے بوجہ احسن امیٹھی پہنچا دیا۔ اب لکھنؤ کی ناکہ بندی ہوئی
لوگوں کا شہر سے نکلنا دشوار ہوا۔ جس نے باہر جانے کا قصد
کیا، وہ گرفتار ہوا۔ مگر جو مولوی صاحب کے ہمراہ گئے، وہ بہشت
کی راہ گئے۔ انھوں نے ایک رات امیٹھی میں بسر کی پھر رسولی
میں سحر کی۔ وہاں سے بانسے پہنچے۔ یہاں بہت آدمی جمع ہو گئے
یہ خبر سن کے نواب کو اضطراب ہوا۔ میر صفدر علی فتح جنگ تہور خاں
رسالدار، میر حسین کلکٹر، حسین علی کارندہ مقیم الدولہ راجہ نواب
علیخاں کو بہر فہمائش بھیجا۔ انھوں نے دنیا کو دین سے بدل کے
کچھ کہا سنا۔ مگر مطلب نہ نکلا۔ رفتہ رفتہ لشکرِ اسلام شجاع گنج
میں داخل ہوا۔ خبر نہ تھی وہی مقام کرب وبلا تھا۔ نواب کے حکم سے
فوج شاہی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مخالفوں کا کیا ذکر۔

مسلمانوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا۔ ہر طرف سے بندوقوں کی باڑھیں چلنے لگیں۔ روحیں قفس عنصری سے نکل کے خلد بریں میں پہنچنے لگیں۔ ضعیف الاعتقاد بُزدِے فرار ہوئے۔ ایماندار مجمع سید عالی نسب والا حسب کے ساتھ جان دینے کو تیار ہوئے۔ کہتے ہیں مولوی صاحب نے جیسے عزم انتقام کیا تھا۔ یہ مصرع اکثر وردِ زبان رہتا تھا۔

سرِ میداں کفن بردوش دارم

بعد شہادت جب غور کیا تو یہی مادہ تاریخ تھا۔ جس کو منشی ظہیرالدین صاحب نے نظم کیا:

قطعہ تاریخ شہادت امیرالمجاہدین مولوی سید امیر علی صاحب علیہ الرحمۃ

بتاریخ شہیداں کفن پوش ؞ چہ حاجت تا سنش من برنگارم

کہ خود فرمود آں میر شہیداں ؞ سرِ میداں کفن بردوش دارم

الغرض ۲۶ صفر ۱۲۰۲ہجری۔ چہار شنبہ بعد زوال امیرالمجاہدین نے باگروہ کثیر اہل ایمان نے شربت شہادت پیا۔ حلق بریدہ سے دیر تک کلمۂ شہادت جاری رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ ظلم تازہ سننے کا ہے۔ مقام سر دھننے کا ہے کہ بعد شہادت سر اس انسر کا ے کے شام کو شتر سوار روانہ ہوئے۔ تن بے سر

میدان میں پڑا رہا۔ انصاف سے جواب دو کہ یہ سانحہ واقعہ کربلا ہوا یا نہ ہوا۔ اِدھر تو بعد زوال مسلمانوں کا خون بے بہا۔ بہا اُس کی قدرت دیکھئے کتنی جلدی جلدی صبح ہوگئی۔ کچھ نہ رہا۔ حساب کیا تو اسی تاریخ (یعنی، نومبر ۱۸۵۵ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۷۲ ہجری قدسی۔ مولف) کو پارلیمنٹ لندن سے ضبطی سلطنت اودھ کا حکم نافذ ہوا منتقم حقیقی نے بہت جلد خونِ ناحق کا انتقام سلطنت و ملک سے لیا بلکہ ہر متنفس اس کے وبال میں مبتلا ہوا۔ شہر تباہ و برباد ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ ضبطی ملک سے گھبرا کے نواب صاحب نے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا ؎

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

افسوس بارہ سو برس کے بعد سادات و مسلمانوں کے قتل کے وہ دعوے ہوئے جو خود بھی طوطی کی طرح کلمے کا دم بھرتے تھے۔ اسلام کا زبانی اقرار کرتے تھے۔ کلمہ گویوں نے کیونکر مارا ہوگا۔ کس طرح امام علیہ السلام و اہل بیت رسالت و انصار والامنزلت کا سر تن سے اتارا ہوگا۔ پروردگار عالم حجت مٹاتا ہے۔ کوئی ہو شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ یہاں آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کسی کو حمیتِ اسلامی کا لحاظ نہ ہوا۔ یہ سانحہ اوس کا نمونہ تھا۔ اور ایک سبب سے بدنما تھا۔ یزید پلید نے حُبِ سلطنت میں وہ حرکت کی تھی اور واقعی

حضرت امام کے سامنے اُس کی وقعت نہ ہوتی یہاں تو دین و دنیا
کا کوئی معاملہ نہ تھا فقط لبغض للہ اسکو کہتے ہیں کہ قتل کیا نہ
ملک ہاتھ آیا نہ مال ہاتھ آیا۔ اس کے نتیجہ میں زوال آیا۔ صوبہ اودھ
سے فساد کی ابتدا ہوئی لکھنؤ پر انتہا ہوئی۔ وہاں تو انہدام مسجد
کے انتقام کے ارادے پر مسلمان قتل ہوئے پھر کھیری لہرپور میں
بہت سے سید مع زن و فرزند ہلاک کئے گئے۔ وہاں کلام اللہ یہاں
شبیہ روضہ سیدالشہدا جلائے۔ بادشاہ ملتفت نہ ہوئے۔ مگر منتقم
حقیقی کی طرف سے انتقام کی صورت ظہور پائی۔ آخر نتیجہ خونریزی
کہ اس ملک میں عمل انگریزی ہوا۔ تین مہینے کے بعد یعنی ۲۶ صفر
(۱۲۷۰ھ — مولف) کو مسلمانوں کو قتل کیا اور ۲۹ جمادی الاوّل
۱۲۷۲ ہجری (مطابق ۶ فروری ۱۸۵۶ء — مولف) کو اشتہار
ضبطی ملک شہر میں آویزاں ہوا۔ جو شریکِ مشورت تھے، تباہ
وخراب ہوئے۔ کتنے بذلت و خواری مرے اور مارے گئے۔
نام کیا ذکر نشان تک نہ باقی رہے۔ اور جو افسر کہ تریکِ معرکہ قتل
تھے وہ ہنگام انتزاع سلطنت پیادے و سواروں کے ہاتھ سے
ذلیل و رسوا ہوئے۔ ملک کے ساتھ املاک وخزانہ و دواب بلکہ
جو کچھ سلطنت سے متعلق تھا ضبط ہوا۔ نواب ابوالمنصور خاں کے
زمانہ سے جو کچھ جمع ہوا تھا، سب نیلام کرلیا۔ پھر شہر کے مکانات

کھدے. باشندے آوارہ وطن ہوئے. غرضیکہ ہر طرح کی تباہی ہوئی. جس نے یہ حرکت کی تھی اس کو دارین کی روسیاہی ہوئی. یہ رباعی برجستہ یاد آئی.

اے یار جو کوئی کسی کو کلپاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دارِ مکافات میں سن اے غافل
بیداد کرے گا آج، تو کل پاوے گا

جو اس سانحہ کے بعد ہوا، چاروں طرف اُسکی پکار رہے. کالشمس فی نصف النہار ہے. جو قصہ اس قدر مشہور ہے. جس کا شہرہ نزدیک و دور ہو. مگر اس کا اظہار سراسر بُرا ہے. دنیا میں چپ رہنا بھلا ہے. حقیقت میں یہ فسانہ عبرت الناظرین و تنبیہ الغافلین ہے. جو حق پسند، صاحبِ دل ہیں انکو سیر سے مزہ آوے گا اور کور باطن سے دیکھا نہ جائیگا ؎

قلم بشکن. سیاہی ریز. کاغذ سوز. دم درکش
حسنؔ ایں قصۂ پر درد در دفتر نمی گنجد

مولانا سید امیر علی صاحب کے حالاتِ زندگی اور اس معرکۂ جہاد کی تفصیل دو مشہور کتابیں ہیں. ایک حدیقۂ شہدا ہے جو نثر میں ہے. اس کے مصنف جان صاحب ہیں. دوسری کتاب آئینہ اختری ہے جو اردو نظم میں ہے اور صفیر لکھنوی کی تصنیف ہے. حدیقۂ شہدا میں تحریر ہے کہ (ملخص):-

— اجودھیا میں ہنومان گڑھی کے حدود میں واقع عہد عالمگیری کی قناتی مسجد کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ مقامی اور فیض آباد کے لاتعداد افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ مولوی امیر علی امیٹھوی اور ان کے مخلص رفقاء نے سلطان عالم اور اعیانِ مملکت کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی سعیٔ لاحاصل فرمائی۔ آخر الامر شاہ صاحب نے مسجد کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔ عوام الناس کے جوش و خروش کو دیکھ کر کہ شاید حکومتِ وقت مطالبہ کی عملی شکل دے دے، جسے وہ سیاسی تقاضوں کے تحت ٹال رہی تھی۔

خلوص نیت اور جذبۂ ایمانی کے زیر اثر لکھنؤ سے، امیٹھی، بانسہ شریف، سہالی، دریا آباد ہوتے ہوئے موضع رحیم گنج کی باغ میں امیر المجاہدین قیام پذیر ہوئے۔ متزلزل حکومت نے شاہی فوج کو حکم دیا کہ مجاہدین کو ہر قیمت پر فیض آباد کے حدود میں داخل ہونے سے روک دیے۔ نیز علاقہ کے تعلقداروں کو ہدایت جاری کی کہ وہ کرنل بارلو کی مدد کریں۔

کرنل بارلو نے شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد منصرم علاقہ دریا آباد کو جنگی مصلحت کے پیش نظر متعین کیا کہ وہ مولوی صاحب کو محمد پور میں ضلع فیض آباد جانے والے راستہ سے باز رکھے تاکہ وہ مسلم علاقہ میں نہ جانے پائیں ورنہ انکی پیش قدمی کو روکنا

ناممکن ہو جائے گا۔ حسین علی کو روانہ کر کے کرنل بار تو فوج لیکر چلا۔ حسین علی مولوی صاحب کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہ نواب صاحب نے مسجد کی دوبارہ تعمیر کا حکم جاری کر دیا ہے۔ لہٰذا فیض آباد جانے سے بہتر ہے کہ اس بات کی تصدیق کیلئے ردولی۔ تین دن وہ ردولی میں ٹھہر جائیں۔ انکو ردولی کے راستہ پر گامزن کر کے حسین علی نے اپنی راہ لی۔ کرنل بار تو فوج لیکر پہنچ گیا۔ اور فوراً گولہ باری شروع کر دی۔ مولوی صاحب شدید مجروح ہو کر گر پڑے۔ عقب سے ٹھاکر سنگھ بھلیہ اور شیر بہادر بھی ٹوٹ پڑے۔ شیر بہادر نے سر کو تلوار سے اتار لیا۔

دوسرے دن چودھری ردولی اور مسلمان زمینداروں وغیرہ نے بے گور و کفن لاشوں کی تجہیز و تکفین کی۔ شہدا میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ مولوی صاحب کی نعش کے سے سر غائب تھا۔

بہرحال مولوی سید امیر علی صاحب کا یہ واقعہ شہادت اپنی نظیر آپ ہے۔ عبدالرحیم خاں مسکینؔ نے اس غیر معمولی اہمیت کے واقعہ کو اپنے ایک قطعہ میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

عیاں کربلا کا ہوا معرکہ
وہی سب طریقہ۔ وہی سب طریق
پیاسے شہیدوں کی تاریخ ہے
رحیقؔ۔ رحیقؔ۔ رحیقؔ۔ رحیق

جو ناری ہوئے تحت تیغ. انکا سال

حریق. حریق - حریق - حریق

گم گشتہ حالات اجودھیا کے مرتب اور حاشیہ نگار مولوی عبدالغفار نے تاری
پارینہ مدینۃ الاولیاء کے مصنف مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم کے منجھلے بھائی مولو
عبدالرحیم انصاری کے متعلق لکھا ہے کہ جس وقت مولوی عبدالرحیم صاحب نے سنا کہ
مولوی سید امیر علی (رحمتہ اللہ علیہ) نے علم جہاد بلند کیا ہے تو انھیں بیحد خوشی ہوئی۔ اور
شوقِ شہادت میں فوراً ہی جہاد کی تیاری شروع کر دیا۔ اور ایک دن بال بچوں کو اللہ تعا
کے سپرد کر کے، گھوڑے پر سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔ اور مولوی سید امیر علی صاحب کے دو
پر تشریف لے گئے۔ لشکر مجاہدین میں شامل ہو کر، مولوی صاحب کے جتھے کے ساتھ
میں آپ نے بھی جام شہادت نوش فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شہادت کے و
آپ کی عمر اٹھائیس سال نو ماہ اور چھ دن تھی۔

چند حقائق متعلقہ جہاد مولوی امیر علیؒ

محترم بزرگ جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی موجودہ صدر اتر پردیس اردو اکاڈمی، لکھنؤ نے مولوی سید امیر علی امیٹھویؒ کے جہاد سے متعلق جو تاریخی حقائق قلم بند فرمائے ہیں انکے بموجب ہنومان گڑھی کی مسجد کے سلسلہ میں بیراگیوں اور مسلمانوں میں جو ٹکراؤ ہوا تھا۔ اُسوقت یہ بحث اٹھی تھی کہ ہنومان گڑھی میں جو مسجد کہا جاتا ہے کہ شہید کردی گئی۔ وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ اس کی تحقیقات پر حکومت اودھ نے جب آمادگی ظاہر کی تو لکھنؤ سے مولوی نہال الدین بکار سرکار موقع کے معائنہ کیلئے بھیجے گئے اسوقت فیض آباد میں داروغہ عدالت، فرنگی محل کے مولانا محمد حفیظ اللہ تھے، حکم سرکار سے وہ بھی تحقیقاتی کمیشن کے رکن بنائے گئے۔ مولوی نہال الدین صاحب اور مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب فرنگی محلی نے اپنے دستخطوں سے جو رپورٹ موقع پر گواہیاں لیکر، جن میں غیر مسلم گواہ بھی شامل تھے، دی۔ اس سے مسجد کا ہونا ثابت ہوا۔[۲۲۸]

جب حکومت اودھ اپنی کمزوری کیوجہ سے اِسکے تدارک میں بے بس ثابت ہوئی تو مسلمانوں نے بطور خود انتقام لینے کیلئے لشکر تیار کیا جس کے سپہ سالار مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی بنائے گئے۔[۲۲۹] جنھیں امیر المجاہدین کہا جانے لگا۔ یہ آغاز ماہ جولائی ۱۸۵۵ء کی بات ہے جو اودھ کے آخری تاجدار، جانِ عالم واجد علیشاہ بادشاہ کی حکمرانی کا آخری سال ثابت ہوا۔ اُسوقت حکومت اودھ کے وزیر اعظم، واجد علی شاہ بادشاہ

۲۲۸۔ اخبار قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء

۲۲۹۔ امیر المجاہدین مولوی سید امیر علی امیٹھوی علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے اور عبد الرحمٰن موحد لکھنوی کے مرید تھے۔ (ایضاً)

کے خسر نواب علی نقی خاں تھے جو اپنی انگریز پرستی میں مشہور و معروف تھے۔

اکثر کتابوں میں مرقوم ہے کہ سلطان العلمار سید محمد (ابن سید دلدار علی۔ غفران مآب) نے مولوی سید امیر علی امیٹھوی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ لیکن محترم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی تحقیق کے بموجب سلطان العلمار نے مولوی سید امیر علی صاحب کی حمایت میں کوئی فتویٰ دیا تھا۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ اودھ کے مصنف محمد نجم الغنی خاں کا کہنا ہے کہ:-

"۔۔۔ میں نے اس کے متعلق جو قلمی کاغذات کا مجموعہ دیکھا ہے اُسمیں مہنتوں کے بیانات، موضع متنازعہ کا نقشہ، اور راجھے رام بیراگی کے نام اگلے والیان اودھ کے فرمان، واجد علیشاہ کا شقہ، علی نقی خاں وزیر کے خطوط مجتہد کے نام، مجتہد کے خطوط مولوی امیر علی کے نام اور مولوی صاحب کے جوابات، دوسرے اہلکاران متعلقہ کی تحریریں۔ علمار کے فتوے، سب کچھ موجود ہیں۔ اُن میں مجتہد صاحب کی کوئی تحریر مولوی امیر علی کے موافق موجود نہیں، بلکہ خلاف ہے۔"

بہرحال یہ مشہور ضرور ہے کہ سلطان العلمار نے امیر المجاہدین کے نقطۂ نظر کی یک گونہ حمایت کی تھی۔ یعنی جس معاملہ کو لیکر امیر المجاہدین اٹھے تھے (مسلمانوں کے خون ناحق کا بدلہ لینا) وہ برحق تھا۔ امیر المجاہدین کے اقدام اور عزم کی حمایت نہ تھی۔ اس مسئلہ پر جو استفتا کیا گیا تھا، اُس پر سلطان العلمار نے لکھا تھا:

"۔۔۔ بر حکام اسلام رفع شر کفرہ و لئام از اہل ایمان و اسلام لازم است۔

واللہ یعلم [۲۳]

دستخط السید محمد ابن السید دلدار علی۔ ۱۲۳۱"

اسی طرح بعض لوگوں کیطرف سے علمائے فرنگی محل پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ "اس پر سُنی علمائے فرنگی محل نے "شیعہ بادشاہ" کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا ___ اس سلسلہ جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"___ اگر الزام عاید کرنے والوں کا مطلب یہ ہے کہ علمائے فرنگی محل شیعہ بادشاہ کیطرف سے امیر المجاہدین کے مقابلہ و مقاتلہ کرنے، اُس بادشاہی لشکر میں شامل تھے، جس نے امیر المجاہدین کو شہید کیا تھا۔ یہ بات تاریخ اودھ کے کسی جانب دار یا غیر جانب دار مورخ نے نہیں لکھا ہے۔

اس کے برعکس علمائے فرنگی محل میں سے مولانا شاہ عبد الرزاق صاحب۔ مولانا محمد برہان الحق صاحب۔ مولانا محمد معان الحق صاحب امیر المجاہدین کے لشکر میں شامل تھے۔ ایک اور عالم مولانا تراب علی[۲۳۲] صاحب (جنھیں غلطی سے تاریخوں میں فرنگی محلی لکھا ہے) مجاہدین کے ساتھ تھے۔ دربار اودھ نے سمجھوتے کیلئے جب امیر المجاہدین سے نمائندہ بھیجنے کی درخواست کی تو مولانا محمد عبد الرزاق صاحب اور مولانا تراب علی صاحب کو امیر المجاہدین نے نمائندہ بنا کر بھیجا۔ لیکن سمجھوتے کی گفتگو

۲۳۰۔ (ترجمہ) کفار و مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو پیش آنے والے شر و فساد کا تدارک کرنا مسلمان حکام پر لازم ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۳۱۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء

۲۳۲۔ مولانا تراب علی صاحب علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے اور مولانا محمد عبد الوالی صاحب فرنگی محلی کے مرید تھے۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء

کو نواب علی نقی خان نے اتنا طول دیا کہ ان نمائندوں کی مجاہدین کی فوج میں واپسی، شہر کی سخت ناکہ بندی ہو جانے کے نتیجہ میں ممکن نہ رہی۔

مولانا محمد عبدالوالی صاحب فرنگی محلی، مولانا محمد برہان الحق صاحب فرنگی محلی اور مولانا تراب علی صاحب کو ہر چند نواب علی نقی خاں نے مجبور کیا کہ وہ مجاہدین کے لشکر میں جائیں اور کسی طرح امیر المجاہدین کو سمجھوتے کی گفتگو پر آمادہ کر کے لکھنؤ لے آئیں۔ مگر یہ حضرات کسی قیمت پر آمادہ نہ ہوئے۔"[۲۲۳]

کہتے ہیں کہ جب امیر المجاہدین، مولوی سید امیر علی صاحب امیٹھوی اتمام حجت کیلئے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں کے دربار میں لائے گئے تھے اس وقت فرنگی محل کے ایک عالم مولانا خادم احمد صاحب فرنگی محلی نے امیر المجاہدین سے "جہاد" ہونے نہ ہونے پر بحث و تمحیص میں شریک ہوئے تھے۔ جو اس مناظرے اور مباحثے کے تین چار دنوں کے بعد ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ (مطابق ۲۶ اگست ۱۸۵۵ء بروز اتوار ـــ مولف) وفات پا گئے تھے۔[۲۲۴]

جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی کی تحریر کے بموجب فرنگی محل کے ایک عالم مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کو "شیعہ بادشاہ کی حمایت" میں ماخوذ کیا جا سکتا ہے جو بیس سالوں سے سرکار اودھ کے ملازم اور لکھنؤ کی شرعی عدالت کے مفتی تھے ــــ

۲۲۳۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۵۳ء

۲۲۴۔ " " " " " "

لشکر یہ "حمایت" کیا تھی؟ - یہ شرعی سوال بطور استفتاء سوقت اٹھایا گیا تھا جب امیر المجاہدین کے لشکر کو اجودھیا کیطرف پیش قدمی کرنے سے روکنے کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں۔

سوال یہ اٹھایا گیا تھا کہ "کیا مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی اور انکے لشکر کی یہ پیش قدمی شرعاً جہاد ہے؟ اور جو مسلمان اسمیں کام آئیں گے وہ "شہید" ہونگے یا نہیں؟"

اس استفتا پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کا جواب یہ تھا:

"ـــــ فی الواقع فسخ عزیمت می باید و در شہادت ادغدغہ است"[۲۳۵]

یعنی لشکر اسلام کو جہاد کا عزم ترک کر دینا چاہیئے۔ یہ جہاد شرعی نہیں ہے۔ اسلئے جو مسلمان اس مقابلہ میں کام آئیں گے انکو درجۂ شہادت ملنا کھٹکے کی بات ہے۔

امیر المجاہدین کے معاصر مورخ مرزا جان صاحب نے اپنی کتاب 'حدیقۂ شہدا' میں مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے فتویٰ پر ان الفاظ میں افسوس کیا ہے:-

"ـــــ خواہ مخواہ فسخِ عزیمت اور عدم فرضیت جہاد بہیئت کذائی در صورت مقاتلہ دریں ہنگام حکم دغدغۂ شہادت، نہ قطعاً انکار شہادت لگا کر مطعونِ عوام ہوئے۔ ناکردہ گناہ بدنام ہوئے۔"[۲۳۶]

محترم چودھری سبط محمد نقوی صاحب (اکبر پور۔ فیض آباد) کی تحقیق کے بموجب مولانا سید امیر علی امیٹھوی کے جہاد کے خلاف فتویٰ پر دستخط کرنے والے سُنّی علماء میں پانچ حضرات کے نام ملتے ہیں مولوی محمد سعد اللہ، مولوی مفتی محمد یوسف، مولوی حسین احمد۔ مولوی

۲۳۵۔ اخبار قومی آواز مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۲ء

۲۳۶۔ " " " "

علیہ اللہ۔ مولوی ابوالحسن ــــ عام طور سے ان حضرات کو فرنگی محل سے متعلق سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس وقت مرکزِ اتباع اور دارالافتاء فرنگی محل ہی تھا اور آج بھی ہے[۲۳۷]۔

جناب نقوی صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ چونکہ ان حضرات میں سے صرف مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی تھے۔ باقی چار حضرات نسباً ہی غیر فرنگی محلی تھے یا دائرہ استفادہ و تلمذ سے بھی خارج تھے[۲۳۸]؟۔

محترم بزرگ مفتی محمد رضا انصاری صاحب نے معزز نقوی صاحب کے سوال کے جواب میں جو تفصیلات تحریر فرمایا ہے وہ اس طرح ہیں[۲۳۹]:۔

"ــــ جہاد کے خلاف فتویٰ دینے والوں میں جن پانچ سُنّی علماء کے دستخط ہیں اُن میں سے تین دستخط کنندہ علماء، علمائے فرنگی محل سے نسبی تعلق کسی طرح کا نہیں ہے۔ ان میں سے دو کا تلمذ کا تعلق ضرور ہے۔ یعنی مفتی سعداللہ اور مولانا حسین احمد کا۔

مفتی محمد سعداللہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد کا نام مولوی نظام الدین مرادآبادی تھا۔ مفتی محمد سعداللہ، مفتی محمد ظہوراللہ فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ شروع ہی سے سرکار اودھ میں ملازم رہے۔ مدرسہ سلطانیہ (شاہی مدرسہ) کے بعد شاہی چھاپے خانہ میں بسلسلہ ترتیب لغت، اور اسکے بعد مفتیٔ عدالت

۲۳۷۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲ مئی ۱۹۸۳ء

۲۳۸۔ ایضاً

۲۳۹۔ اخبار قومی آواز لکھنؤ۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۸۳ء

ہوئے۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد ریاست رامپور میں ملازم ہوگئے۔ وہیں مکان بنوالیا۔ وہیں آخری عمر گذاری۔ اہل وعیال سب وہیں رہنے لگے تھے۔ مرادآباد سے کچھ علاقہ نہ رہا۔"

— دوسرے، مولانا حسین احمد نام کے کوئی عالم خاندان فرنگی محل میں نہیں گذرے ہیں۔ یہ مولانا حسین احمد (دستخط کنندہ) کون ہیں؟۔ غالباً مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی ہیں جو علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے اور حدیث میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے بلاواسطہ شاگرد تھے .... واقعہ امیر المجاہدین کے وقت انکا شمار ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔"

— تیسرے دستخط کرنے والے مولوی علبید اللہ ہیں۔ اس نام کے کوئی صاحب خاندان فرنگی محل میں نہ اسوقت تھے۔ نہ اس سے پہلے اور نہ بعد، اور ان مولوی صاحب کا تذکرہ بھی کہیں نظر سے نہیں گذرا ہے۔"

— "چوتھے دستخط کنندہ کا نام "ابوالحسن" ہے۔ اس زمانے میں خاندان فرنگی محل میں ایک عالم "ابوالحسن محمد صالح" ضرور تھے مگر انکا منصب افتاء سے تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔

علمائے فرنگی محل میں فتویٰ نویسی کا تعلق زمانہ سابق میں انھیں علماء سے رہا ہے جو فقہ اور اصول فقہ میں تخصص اختیار کرلیتے تھے قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مولوی ابوالحسن دستخط کنندہ کوئی

اور رہیں یا" ابوالحسن محمد صالح" ہی ہیں۔ ــــ جو بھی ہوں انھوں نے

کا جواب ایسا دو ٹوک دیا ہے جس سے واقعہ امیر المجاہدین کے بارے

میں علمار کے نقطۂ نظر میں اختلاف کا پورا پورا سراغ مل جاتا ہے ــــ۔

بہر حال مولوی ابوالحسن کا نسبتاً فرنگی محلی ہونا مشکوک ہے۔"

دربار اودھ کو اپنی بقا کیلئے ہر اقدام کے سلسلہ میں لکھنؤ سے کلکتے تک کے ردِ عمل کو پیش نظر رکھنا لازم ہو گیا تھا۔ امیر المجاہدین اور ان کے تمام لشکر "حکام اسلام" کے لیت و لعل سے مایوس ہو کر ہی بذات خود میدان میں اترے تھے۔[٢٤٠]

اس استفتا کی عبارت بھی دیکھنے کے لائق ہے جس پر پانچ سنی علمار بشمول مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے دستخط ہیں۔ ایک جملہ اس کا یہ تھا:[٢٤١]

ــــ "بادشاہ باعثِ فسادِ حاکم بالا ہست مجبور شدہ۔ برائے مصلحت، چند ایام منع روانگی می فرماید ــــ"

یعنی حاکم بالا (انگریز) کے فساد کے باعث مجبور ہو کر بادشاہ نے کچھ دنوں کیلئے روانگی منع فرما دیا ہے۔

مولوی ابوالحسن کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

ــــ "اگر از حاکم بالا است انتزاع سلطنت و اجرائے کلمۃ النصاریٰ

٢٤٠۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ٢٤ر اپریل ١٩٨٣ء

٢٤١۔ " " " ٢٢ر جون ١٩٨٣ء

يظن قوی متصور و متيقن باشد بحكم من ابتلىٰ بليتين فاللازم عليه ان يختار اهونهما ـــ"[۲۴۲]

کہتے ہیں کہ جب مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی شہید ہو گئے تو انکا سر فتح کی خوشخبری کے ساتھ دربار اودھ میں پیش کر دیا گیا۔[۲۴۳] لیکن اس سلسلہ میں مختلف حکایات مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ نواب نے منگایا تھا۔ لکھنؤ میں آیا تھا۔ بعضے کہتے ہیں کہ پھر اس طرف روانہ کیا۔ لوگوں سے بہانہ کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ نواب گنج تک شتر سوار لایا تھا۔ یہاں پہنچنے نہ پایا تھا کہ بخوف بلوائے مسلمانان رجعت قہقری کا پروانہ پہنچا۔[۲۴۴]
مشہور مختلف روایات اور حقیقت کے متعلق عزت مآب مولانا سید کلب صادق (نمبا) مجتہد فرماتے ہیں:[۲۴۵]

ـــ" تاہم میں اس قدر ضرور عرض کرونگا کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے جب کوئی بات بالکل بے بنیاد طریقہ پر یوں مشہور ہو جائے۔ اس لئے بہت زائد امکان یہی ہے کہ اس روایت (دربار اودھ میں مولوی امیر علی صاحب کے سر پیش کرنے کی ـــ مولف) کی تہہ میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہو گی......"

۲۴۲۔ ترجمہ:۔ اگر یہ اندیشہ قوی اور یقین کی حد تک پہنچا ہوا ہے کہ مجاہدین کے اقدام کے نتیجہ میں حاکم والا (انگریز) کیطرف سے سلطنت چھین جائیگی اور یہاں نصاری کا اقتدار قائم ہو جائیگا تو حکم شرعی یہی ہے کہ دو مصیبتوں میں سے کسی ایک میں پھنسنے والے کو چاہیئے کہ مصیبت کم تر درجے کی ہو اسے قبول کرے۔ (یعنی انگریزوں کا اقتدار قبول نہ کرے)۔

۲۴۳۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء

۲۴۴۔ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲ مئی ۱۹۸۳ء

۲۴۵ اخبار قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء

روزنامچہ مسافرت

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خلاف تمام مخالف قوتوں میں سب سے زیادہ صلاحیت قوت روہیلوں کی تھی۔ جو ترائی کے علاقہ میں اپنی قوت بڑھا رہے تھے۔ نواب صفدر جنگ نے محمد شاہ بادشاہ کو بن گڈھ پر حملہ کرنے کیلئے آمادہ کیا اور وہ بنفس نفیس نواب سید علی محمد خاں روہیلہ پر حملہ آور ہوئے۔

بن گڈھ کے سفر کا یہ روزنامچہ بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے کیونکہ یہ لشکر کشی ہندوستان کے شہنشاہ نے شخصاً انجام دیا تھا۔ اور آنند رام مخلص اس لشکر کشی میں بذات خود شریک تھا۔

"شہر اولیار" کے مصنف نے آنند رام مخلص کے فارسی سفر نامہ کا "روزنامچہ مسافرت" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے

لکھائی چھپائی عمدہ۔ بہترین گیٹ اپ اور عمدہ کاغذ